تحقیقی مقالہ برائے (پی ایچ۔ ڈی اُردو)

مجلّہ اودھ پنچ کی نثر کا مزاحمتی رویہ: تنقیدی تجزیہ

Resisting Behavior of Prose of Awad Punch: Critical Analysis

مقالہ نگار

ارسہ کوکب

پی۔ ایچ۔ ڈی اُردو

نگران

ڈاکٹر حمیرا اشفاق

اسسٹنٹ پروفیسر

55-FLL/PHDURD/F16

شعبہ اُردو

کلیہ زبان وادب اردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

International Islamic Univ
CENTRAL
LIBRARY
ISLAMABAD

Accession No. TH25527

PhD
891.4391
ارم

اردو ادب ۔ نثر ۔ تنقیدی جائزہ
مجلہ اودھ ۔ تنقیدی جائزہ

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: **IRSA KOKAB**

Title of the Thesis. مجلہ اودھ پنچ کی نثر کا مزاحمتی رویہ: تنقیدی تجزیہ

Registration No: **55-FLL/PHDURD/F16**

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

Chairperson Viva Committee:

Dr. Kamran Abbas Kazmi
Chairperson
Department of Urdu
Islamabad

External Examiner 1:

Dr. Bilal Sohail
Assistant Professor
F.G.Sir Syed College, Mall Road
Rawalpindi

External Examiner 2:

Dr. Abid Sial
Associate Professor
Department of Urdu, NUML
Islamabad

Internal Examiner:

Dr. Ghulam Farida
Assistant Professor
Department of Urdu, IIU
Islamabad

Supervisor:

Dr. Humaira Ishfaq
Assistant Professor
Department of Urdu, IIU
Islamabad

الجامعۃ الا سلامیۃ العالمیۃ

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

شعبہ اردو (خواتین)

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ ارسہ کوکب رجسٹریشن نمبر 55-FLL/PHDURD/F16 نے پی۔ ایچ۔ ڈی اردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے تحقیقی مقالہ بعنوان "مجلّہ اودھ پنچ کی نثر کا مزاحمتی رویہ: تنقیدی تجزیہ" رقم کیا ہے۔ میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

نگران: ڈاکٹر حمیرا اشفاق

صدر شعبۂ اردو

نمبر شمار	فہرست ابواب	صفحہ نمبر
۱	مجلہ اودھ پنچ کے مزاحمتی رویوں کے اسباب و محرکات، تجزیاتی مطالعہ	۱
۲	اودھ پنچ کی نثر میں جدید مغربی تعلیم اور اس کے اثرات پر مزاحمت کا تنقیدی جائزہ	۵۹
۳	مغربی کلچر اور ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے ادغام پر اودھ پنچ کی نثر کے مزاحمتی رویے	۸۹
۴	نو آبادیاتی ہندوستان میں مفاہمتی رویوں پر طنز بحوالہ خصوصی اودھ پنچ کی نثر	۱۱۷
۵	مجلہ اودھ پنچ میں ہندوستان کی توہم پرستی، رسم و رواج اور رویوں پر مزاحمت	۱۴۱
۶	ماحصل	۱۵۴
۷	کتابیات	۱۶۶

پیش گفتار

اردو نثر اپنی ابتدائے آفرینش سے تا امروز۔۔۔۔۔۔ سدا انسانی جذبات و احساسات کی ترجمان رہی ہے۔ کہیں وہ حسن کے لیے غازہ مہتاب بنی تو کہیں عشق کے لیے شعلہ و آفتاب۔ ادب تخلیق کرنا بذات خود ایک مزاحمتی عمل ہے۔ ادب، ایک وسیع و عریض دریا کی طرح ہے کہ جو اپنے گھاٹ سے بہتا ہوا راستہ بناتا سمندر میں جا ملتا ہے۔ اس سارے راستے میں ہر مشکل کو زیر کرتا ہر سنگ راہ کو نابود کرتا اور منزل کی جانب پہنچنے والے ہر اثبات کی ہم راہی کرتا ہے۔ ادب ہمارے معاشرے کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ ہر دور کا ادب اپنے دور کی روایات کا ترجمان ہوتا ہے اور اس دور میں جنم لینے والے سیاسی، تہذیبی، معاشرتی، معاشی فکری اور اقتصادی مسائل و معاملات کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔ ادب کا سماج سے یہ مضبوط رشتہ ہی اس کی بقا کا ضامن ہے۔

مزاحمتی ادب جبر و استحصال مخالف ادب ہوتا ہے۔ اردو ادب کا آغاز جس دور میں ہوا وہ سیاسی انحطاط اور معاشرتی و تہذیبی زوال کا عہد ہے۔ اٹھارویں صدی کے آغاز سے اس زوال کی ابتدا ہو گئی تھی۔ سیاسی زوال کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء ایک مرکزی نقطہ ہے اور اودھ پنچ کی نثر ۱۸۵۷ء کے بعد رقم ہونے والی ناانصافی، ظلم، تشدد و بربریت یا جبر کی آئینہ دار ہے۔ غدر کے بعد ہندوستان بیرونی مداخلت اور تسلط کے شکنجہ میں پورے طور سے کسا ہوا ہے۔ مسلمانوں کی قوم خصوصیت کے ساتھ اپنی شامت اعمال کا نتیجہ بھگت رہی ہے۔ نفاذ خود غرضی و غداری نفس پرستی اور عیش پرستی کی گرم بازاری ہے۔ اس کے مقابلہ میں برطانیہ کا نقش ہر دل پر بیٹھا ہوا ہے۔ اب مغرب کا جادو ساری قوم پر چل گیا۔ علم و فضل کا معیار کمال یہ پایا کہ انگریزی زبان آجائے تلفظ انگریزوں کا سا ہو جائے اور انگریزی علوم سے واقفیت ہو جائے، تہذیب و شائستگی کی معراج یہ ٹھہری کہ انگریزی کھانا کھایا جائے، لباس انگریزی پہنا جائے اور انگریزی تقلید میں خاندان مشترکہ کے وجود کو ذلیل سمجھ کر ضعیف والدین اور دوسرے اعزہ سے قطع تعلق کر لیا جائے۔ شرافت و عزت کا منتہائے خیال یہ قائم ہوا کہ ہر ممکن ذریعہ سے انگریزی عہدے حاصل کئے جائیں۔ عقل و دانش کا مفہوم یہ قرار پایا کہ انگریزی مصنف کے قول پر بے چوں چرا ایمان لایا جائے اور اپنے علوم و فنون، شعائر و رسوم، عقائد و خیالات کو یکسر اوہام کا لقب دے کر انگریزیت کے صنم دلربا کے قدموں پر نثار کر دیا جائے۔ مجلہ اودھ پنچ نے اپنی کم و بیش چالیس سالہ زندگی میں جس موضوع کا سب سے زیادہ برتا اور جس کو سب سے زیادہ تنقید کا نشانہ بنایا وہ انگریزی تعلیم اور انگریزی تہذیب و تمدن تھی اور غالباً اسی ضمن میں سرسید تحریک اور ان کے رفقا کی سرگرمیاں بھی اودھ پنچ کا نشانہ بنیں۔ اودھ پنچ کا

اہم کارنامہ اس نو آبادیاتی معاشرے کے خلاف مزاحمتی کردار ہے۔اودھ پنچ ہمیشہ علم مزاحمت تھامے اس کا آہنگ بلند ظلم وجبر کے خلاف اس امید سے خیمہ زن رہاہے کہ جیت آ خر انسان اور انسانیت کے لیے ہی مقدور ہے۔

زیرِ نظر مقالہ میں اودھ پنچ کی ادبی خدمات سے زیادہ "مزاحمتی نثر"کو زیر بحث لایا گیاہے۔اور اس کے سماجی و سیاسی مزاحمتی رویے کو اجاگر کیا گیاہے۔ہمارا موضوع اس امر کا متقاضی تھا کہ اردو نثر کے صرف مزاحمتی رویے کو اجاگر کیا جائے راقم نے اودھ پنچ کے موضوعات میں مزاحمتی رویے کو تحقیق و تنقید کی کسوٹی پر رکھنے کی کوشش کی ہے۔دورانِ تحقیق اس بات کا خاص خیال رکھا گیاہے کہ ہر مزاحمتی نثر نگار کی تحریر کو اس کے مخصوص مزاج،ماحول اور اس کو درپیش حالات و واقعات (خاص کر سیاسی واقعات) کے تناظر میں مستند تجرباتی معیار کے تحت جانچا اور پرکھا جائے۔اودھ پنچ کے مزاحمتی رویہ کے موضوع پر ایم۔اے اور ایم فل کی سطح پر بھی تحقیقی کام ہوا بلکہ مزاحمتی نثر پر ہونے والا تحقیقی کام نہیں ہوا بلکہ مزاحمتی نثر پر ہونے والا تحقیقی کام بھی تشنگی کا احساس دلاتا ہے۔سو اس مقالے کو ضبطِ تحریر میں لاتے ہوئے یہ سعی کی گئی ہے کہ قاری موضوع ہذا کا مطالعہ کرتے ہوئے نہ صرف یہ کہ تشفی محسوس کرے بلکہ اس کے ذوقِ جستجو کو بھی مہمیز ملے۔اگرچہ کسی بھی تحقیقی کاوش کو صرفِ آخر کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی لیکن پھر بھی راقم نے اپنے تیئں مقدور بھر کوشش کی ہے کہ اپنے موضوع کے تمام ممکنہ پہلوؤں کا احاطہ تحریر میں لائے اور انسان دوست قارئین کا ادب بدر کرنے والوں کی مذموم حکمت عملیوں اور سازشوں سے آگاہ کرے۔اس ضمن میں راقم نے صفحہ اول تا آخر غیر جانب دارانہ حیثیت سے ادب اور ادبی صورتِ حال کا تجزیہ کرنے کی حتی الوسع کوشش کی ہے۔

مقالہ ہذا مطوّل و مختصر پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔پہلے باب میں 'مزاحمت' کے لغوی مطالب و معانی بیان کیے گیے ہیں۔اس کے بعد 'ادب میں مزاحمت' اور اردو نثر میں مزاحمتی ادب کی روایت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس باب کی خاص بات "اودھ پنچ کا تعارف" اسلوب، خدمات، مجلہ کی پالیسی، نثر نگار اور تحریکِ آزادی میں اودھ پنچ کے کردار کی وضاحت کی گئی ہے۔اس حوالے سے مشرق و مغرب کے نمایاں اربابِ نقد و ادب کے نقطہ ہائے نگاہ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بحث و تمحیص کے بعد راقم نے 'مزاحمتی ادب کی روایت' کو وضع کیا ہے تا کہ اس اصطلاح کو بلا التباس و ابہام سمجھا جاسکے۔

تحقیق کا دوسرا باب 'جدید مغربی تعلیم اور اس کے اثرات' پر مشتمل ہے اس باب میں ایسی نثر کا جائزہ لیا گیا ہے جس میں جدید مغربی تعلیم اور عوام پر اس کے مغربی اثرات پر تنقید کی گئی تھی۔سر سید کا مغربی تہذیب اور تعلیم کی طرف حد سے زیادہ جھکاؤ ہونے کی وجہ سے وہ ان کا ذکر ہمیشہ اودھ پنچ کی تحریروں میں نظر آتا تھا۔ اودھ پنچ غلامانہ ذہنیت کا دشمن تھا۔چوں کہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم و تہذیب کے سب سے بڑے وکیل سر سید احمد خاں تھے۔اس

لیے اودھ پنچ سرسید اور ان کی تعلیمی تحریک کا بھی بدترین مخالف تھا اور یقیناً اس کی مخالفت میں وہ اکثر حد اعتدال سے بھی تجاویز کر جاتا تھا۔ مغربی تعلیم و تہذیب اور اس کے چرچے سے اودھ پنچ کو بہت الجھن ہوتی تھی۔ اس لیے اس کی مزاحمت بھی شدید ہوتی تھی۔ راقم نے اسی مزاحمت کا جائزہ اس باب میں لیا ہے۔

تیسرا باب مغربی کلچر اور ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے ادغام پر اودھ پنچ کی نثر پر مزاحمتی رویوں کی وضاحت کے بارے میں ہے۔ راقم نے اس باب میں مغربی اور ہندوستانی تہذیب دونوں کے بارے میں ساتھ ساتھ بیان کیا ہے اور ان کے ملاپ پر اودھ پنچ کے ردعمل کا بھی مدلل انداز میں جائزہ لیا ہے۔ جہاں تک مغربی تہذیب اور ہندوستانی کلچر پر تحقیق کا تعلق ہے تو راقم نے مغربی اور مشرقی تہذیبوں کے باہم ٹکراؤ کے بارے میں تفصیلاً وضاحت کی ہے اس میں سیاست کا سب سے بڑا عمل دخل رہا ہے۔ جس کی تفصیل باب کے شروع میں بیان کی گئی ہے۔ پھر راقم اودھ پنچ کے دور میں اس تہذیبی تصادم پر مزاحمت کے بارے میں سماجی اور سیاسی پس منظر کو بیان کرتے ہوئے اس کے مدلل دلائل دیتا ہے۔

باب چہارم کا آغاز ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں اور اس کے بعد مسلمانوں کے بدتر حالات کے بارے میں تفصیل سے ہوتا ہے۔ اس باب میں ہندوستان کے مفاہمتی رویوں پر اودھ پنچ کی مزاحمت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ چونکہ مفاہمتی تدبیر میں سرسید ہی سب سے پیش پیش تھے اس لیے سب سے زیادہ تنقید کا نشانہ بھی وہی بنے۔ راقم اس باب میں سیاسی صورت حال کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ عوامی ردعمل کے بارے میں بھی وضاحت کرتا ہے اس ضمن میں راقم کے پیشِ نظر یہ امر رہا ہے کہ سرسید نے جس طرح مسلمانوں کو سیاست سے دور رکھنے اور انگریزوں سے قریب لانے کی کوشش کی وہ سب وضاحت کے ساتھ بیان کی جائیں اور ان کی کوشش کے ردِعمل کے طور پر جو مثبت اور منفی اثرات مرتب ہوئے اس پر اودھ پنچ نے جو ظلم و زیادتی اور استحصالی روایات کے خلاف صدائے حق و صداقت بلند کی اس کو صفحہ قرطاس پر منتقل کیا جائے۔

باب پنجم میں ہندستانی معاشرت کی بھرپور جھلکیاں ملتی ہیں۔ راقم نے اس میں وہاں کے فرسودہ رسم و رواج، رہن سہن، دعوتوں اور ضیافتوں کے نقشے، لباس کا تفصیلاً ذکر کیا گیا ہے۔ عقائد و توہمات ہندستانی تہذیب کے ترجمان ہیں۔ اسلامی عقائد اور ضعیف الاعتقادیاں، رسم و رواج، طعام و لباس، مشاغل و معاملات، آداب و اخلاق، غرض ہر قسم کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس موضوع کے ساتھ پوری طرح انصاف کرنے کا دعوی تو میں نہیں کر سکتی لیکن حتی الامکان کوشش ضرور کی ہے کہ کوئی قابلِ ذکر بات بیان ہونے سے نہ رہ جائے میں اپنی کوشش میں کس حد تک کامیاب ہو سکی ہوں اس کا فیصلہ صاحبانِ علم و فضل ہی فرمائیں گے۔سب سے پہلے اس مالکِ حقیقی کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس کے فضل و کرم سے تعلیمی زندگی سے سارے مرحلے آسانی سے طے ہوئے۔

مقالہ کو خوب سے خوب تر بنانے کا سہرا میری نگرانِ کار ڈاکٹر حمیرا اشفاق کے سر جاتا ہے۔انھوں نے موضوع کے انتخاب، مقالہ کی خاکہ سازی اور ہر مرحلے میں میری رہنمائی کی اور اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔اس کے لیے میں تہہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔انھوں نے مجھے میری خامیوں سے آگاہ کر کے مجھ پر احسانِ عظیم کیا۔مجھے یقین ہے کہ اگر ان کی رفوگری شامل حال نہ ہوتی تو ایک ایسا مقالہ سامنے آتا جو معیار سے زیادہ مقدار کا حاصل ہوتا۔

شعبہ اردو کے تمام اساتذہ نے ریسرچ کے دوران میری حوصلہ افزائی کی،مایوس کن حالات میں بھی میری ہمت بندھائی اور مفید مشوروں سے نوازا۔ڈاکٹر نجیبہ عارف (ڈین فیکلٹی آف آرٹس) کی عنایات بھی میرے شامل حال رہیں ۔میں ان کی بھی شکر گزار ہوں۔

تحقیق کے دوران یوں تو مجھے درجنوں لائبریریوں سے استفادہ کرنے کا موقع ملا لیکن میں خاص تو پر جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئ دہلی کی لائیبریری (ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری) کے سٹاف کی مشکور ہوں۔جن کی مدد سے مجلوں تک میری رسائی ممکن ہوئی۔جن سے کچھ سال پہلے دہلی میں میری ملاقات بھی ہو چکی تھی۔ان کے تعاون سے میں مقالہ کا اس قدر باثروت بنانے میں سرخرو ہوئی۔ان کے علاوہ ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین (پروفیسر جواہر لال نہرو،یونی ورسٹی) اور ڈاکٹر عزیر احمد (پروفیسر دہلی یونی ورسٹی) نے مطلوبہ کتب کی فراہمی میں میری معاونت فرمائی اس پر میں ان کی بھی شکر گزار ہوں۔جیسے کہ کہا جاتا ہے ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔میرے خیال میں ایسے ہی ایک کامیاب عورت کے پیچھے اس کی زندگی میں موجود مرد کا ہاتھ ہوتا ہے۔جن میں سب سے پہلے میرے والد،شوہر اور بھائی شامل ہیں۔ان کی مدد اور حوصلہ افزائی نے مجھے اس مقام تک پہنچایا ہے۔میں ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں اور ان کے لیے بھی دونوں جہاں کی خوشی اور کامیابی کی دعائیں کرتی ہوں۔

ارسہ کوکب

باب نمبر ا

مجلّہ اودھ پنچ کے مزاحمتی رویوں کے اسباب و محرکات، تجزیاتی مطالعہ

ا۔ مزاحمتی ادب کی روایت

مزاحمت کیا ہے؟

ادب کی مزاحمتی حیثیت کو سمجھنے کے لیے لفظ "مزاحمت" پہ غور ضروری ہے۔ مزاحمت کسی نظریے، فکر یا نظام کو قبول کرنے سے انکار پہ مبنی فلسفہ ہے۔ جب کسی چیز کا انکار اور اس کے خلاف مزاحمت کی جاتی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ انکار کرنے والی حیثیت محکوم، ماتحت اور مجبور کی ہے اور اس کے خلاف مزاحمت کی جارہی ہے۔ وہ ایک طاقت ور عنصر کے طور پر مزاحمت کرنے والے پر مسلط ہے۔ جب ہم مزاحمتی ادب کی بات کرتے ہیں تو ادب کے اُس تخلیقی رویے سے مراد ہوتی ہے جو فکر، نظام یا نظریے کے طور پر قبول کرنے سے انکار کر رہا ہے۔ ڈاکٹر رشید احمد رقم طراز ہیں کہ "عمومی معنوں میں ادب ہوتا ہی مزاحمتی ہے کہ ادیب موجودہ صورتحال، اس کے جبر اور استحصال کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔" (۱) ادب تخلیق کرنا بذات خود ایک مزاحمتی عمل ہے کیونکہ ادیب اپنے گردوپیش سے CONFORM نہیں کر پاتا اور اس کشمکش کی بنیاد پر وہ ادب تخلیق کرتا ہے۔ اس طرح سے تو سارا ادب مزاحمتی ہے اور ہر ادیب باغی۔ اس پر قاسم یعقوب لکھتے ہیں کہ

> "مزاحمتی ادب کی بہت سی اقسام ہو سکتی ہیں۔ جیسے کسی ادیب کا اپنے آدرشوں، خوابوں یا آئیڈیئل کی تکمیل کی راہ میں رکاوٹ محسوس کرنا۔ کلام فیض احمد فیض جس کی مثال میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ ضروری نہیں کسی شاعر، کہانی کار کی مثالیت معاشرے کی بھی مثالیت ہو۔ بعض اوقات تخلیق کار اپنی تحریروں میں کسی آئیڈیل کو پیش کرتا ہے مگر معاشرہ اُس کے آئیڈئیل کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے، یوں اُس تخلیق کار کی تحریروں میں مزاحمتی رویے جنم لیتے ہیں۔ مزاحمت طے شدہ رویوں، رسم و رواج اور رائج قدار کے خلاف بھی ہوتی ہے۔ تخلیق کار معاشرے کی از سرِ نو تشکیل کرتا ہے۔ فرسودہ روایات اور بانجھ فکری تحریکوں کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔ ٹیبوز کو توڑتا ہے۔ اس طرح کے ادب کو بھی مزاحمتی کہا جاتا ہے۔ عموماً ایسا مزاحمتی ادب اپنا مقدمہ پیش کرنے کے لیے فلسفیانہ دلائل کی بنیاد مہیا کرتا ہے، سماج کی نئی فکری تشکیل کرتا ہے۔ مزاحمتی ادب کا ایک اور رویہ سیاسی، تاریخی اور اقداری بیانیوں سے انکار کرنا بھی ہے۔ عموماً ایسے بیانیے جو کسی حد تک سٹیریو ٹائپ تصورات بن چکے ہوں تخلیق کار انھیں قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ ایک شاعر یا کہانی کار جو بیانیہ تشکیل دیتا ہے اسے ریاست یا نظام کا متبادل بیانیہ بھی کہا جا

سکتا ہے۔"(۲)

انسانی تاریخ اس آزادی کو سلب کرنے والی قوتوں اور آزادی کے حصول کی جدوجہد میں مصروف لوگوں کی باہمی کشمکش سے بھری پڑی ہے۔ استحصال اور جبر بے شمار قوتیں ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر مضبوط اقوام، کمزور قوموں پر اپنا شکنجہ جمائے رہتی ہے۔ ہر سماج میں بالادست طبقے عوام کا استحصال کرتے چلے آرہے ہیں۔ ریاست کے نام پر، مذہب کے نام پر، سیاست کے نام پر، معیشت کے نام پر۔ اور ان استحصالی قوتوں کے ہاتھ جھٹک دینے کے لیے مزاحمتی عمل بھی جاری و ساری ہے۔

آزادی کی خواہش تیسری دنیا کے ممالک میں ایک خواب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ ایک ایسا خواب جس کے خدوخال آہستہ آہستہ واضح ہورہے ہیں۔ تیسری دنیا ایک پسماندہ اور مظلوم دنیا ہے۔ جہالت، غربت، تعصبات، توہمات، سیاسی کشمکش اور عدم استحکام اور اسی طرح کے بے شمار عوامل نے اس دنیا کے عوام کو جبر کی قوتوں کا تر نوالہ بنا رکھا ہے۔ ان محکوم معاشروں کا ادیب بھی صورتحال سے جدا نہیں ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ادیبوں نے جبر و استبداد اور استحصالی قوتوں کے خلاف دنیا بھر میں اپنا تاریخی کردار ادا کیا ہے۔ لیکن پسماندہ ممالک میں ادیب کے ہاتھ کئی طریقوں سے بندھے ہوئے ہیں اور اسے حکومت اور معاشرے دونوں کی طرف سے جبر کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ پھر بھی ہم ادیب سے ایک اعلیٰ کردار کا تقاضہ کرسکتے ہیں۔ اسے ان تمام تر عوامل کے باوجود اپنا کردار ادا کرنا ہوتا ہے اور ایسا کرنا چاہیے۔ فیض احمد فیض لکھتے ہیں: "ہمارا یقین ہے کہ ہر سنجیدہ لکھنے والا کومٹ منٹ رکھتا ہے۔ اس کی اپنی ذات سے وابستگی ہوتی ہے اور اپنے فن سے ہوتی ہے۔ اسے اس کی وفاداری کو جو اسے اپنی ذات اور فن سے ہے نبھانا چاہیے اور کسی قسم کے خوف سے اپنی وفاداری اور رائے ترک نہیں کرنی چاہیے، موقع پرستی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ اسے چند ٹکوں کے عوض اپنا فن اور اپنا نظریہ نہیں بیچنا چاہیے۔"

(اے اہل قلم تم کس کے ساتھ ہو۔)

دوسری طرف ژاں پال سارتر کہتا ہے "ادیب کا قلم اس کا ہتھیار ہے" بلکہ فرانسیسی ادیبوں نے دوسرے ہتھیاروں کے استعمال سے بھی گریز نہیں کیا۔ کہ وہ بحیثیت ادیب عملی جدوجہد کی ذمہ داری سے اپنے آپ کو آزاد خیال نہیں کرتے تھے اور آزادی کا حصول ان کا حق تھا جس کے لیے انھیں ہر محاذ پر لڑنا تھا۔ لیکن ایسی جدوجہد ایک ایسے معاشرے میں ممکن ہے جہاں آزادی کی کوئی نہ کوئی شکل پہلے سے موجود ہو۔ یا پھر استحصالی قوتیں اپنی بالادستی کے نتیجے میں محکوم طبقوں کو "تنگ آمد بجنگ آمد" کی سطح پر لے جائیں۔

آزادی کا حصول ایک درجہ دار عمل ہے اور سیاسی نظام کی ترقی اور آزادی کا مرہون منت۔ سو اگر ہمارے اپنے ملک میں مزاحمت کی عملی مثالیں زیادہ نہیں ہیں تو ہمیں اور باتوں کے علاوہ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ ہمارے معاشرے میں آزادی کس سطح پر موجود ہے اور جبر کی قوتوں کی بالادستی کس درجے پر فائز ہے۔ احمد جاوید تیسری دنیا کا افسانہ میں لکھتے ہیں ۔

> "۱۸۵۷ء کے بعد تیسری دنیا کے اس خطے میں آدمی کو سیاسی اور سماجی جبر سے باہر خود مختاری کے کتنے دن ملے ہیں۔؟ عدم تحفظ میں ایک انجانی افتاد ہمہ وقت تلوار کی طرح سروں پر لٹکتی ہے۔ حوالے مختلف ہیں مگر یہی ایک رویہ ہمیشہ سے مضبوط رویہ ہے اور آگے نظر آتا ہے کہ کائنات میں بنیادی صداقتوں کی تلاش میں آدمی کا سفر ' جبر سے تصادم کا تسلسل ہے۔"(۳)

مزاحمت کی تاریخ بھی اتنی ہی پرانی ہے جتنی جبر کی۔ اس حوالے سے اردو ادب کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو شمالی ہند میں شاعری کا آغاز ہی مزاحمتی رویے سے ہوا۔ غالب کے یہاں مزاحمت کا ایک نیا رنگ سامنے آتا ہے ۔ وہ فکری سطح پر اپنے عہد اور اس کے ماضی کو رد کرتے ہیں اور اُس نئے شعور کی بنیاد رکھتے ہیں جو آگے چل کر علی گڑھ تحریک کی صورت سامنے آیا۔

مزاحمت ہمارے ادب خمیر میں رچی بسی ہے کہ اردو ادب کا آغاز جس دور میں ہوا وہ سیاسی انحطاط اور معاشرتی وتہذیبی زوال کا عہد ہے۔ اٹھارویں صدی کے آغاز سے اس زوال کی ابتدا ہوگئی تھی۔ اور یہ زوال بنیادی طور پر سیاسی انحطاط کا نتیجہ تھا۔ سیاسی زوال کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء ایک مرکزی نقطہ ہے۔ یہ ایک ایسے تاریک باب کا آغاز ہے جس کے نتیجے میں ایک طرف تو ساڑھے چھ سو سالہ (۱۳۰۶ء ــــ۱۸۵۷ء) مسلم اقتدار ختم ہوگیا اور دوسری طرف غلامی کا ایک طویل دور شروع ہوا۔ کہتے ہیں شکست صرف ایک سطح پر نہیں ہوتی بلکہ اس کا اثر خارجی صورت حال کے ساتھ ساتھ داخلی رویوں پر بھی پڑتا ہے۔ جغرافیائی شکست کے پہلے مرحلے پر تو زمین پر دشمن کا قبضہ ہوتا ہے لیکن آہستہ آہستہ اس کے اثرات پوری زندگی بلکہ اجتماعی شعور تک پھیل جاتے ہیں اور مفتوحہ علاقے نہ صرف خارجی طور پر بلکہ داخلی سطح پر بھی قابو میں آجاتے ہیں۔ برصغیر کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں زمین کو بچانے کی بجائے ذہن کو بچانے کی کوشش نظر آتی ہے۔ کیونکہ زوال تو اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے ساتھ شروع ہوگیا تھا اور انگریزوں نے مختلف علاقوں میں اپنے پاؤں جمانے شروع کر دیے تھے۔ عملی اقتدار ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے ہی آہستہ آہستہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں میں جانا شروع ہوگیا تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہاں کے معاملات میں مداخلت شروع کر دی تھی۔

مرکز کو چھوڑ کر بنگال اور دوسرے علاقوں میں انگریز مسلم تصادم کے ذریعے اقتدار پر کہیں بلاواسطہ کہیں بالواسطہ قابض ہو چکے تھے۔ چنانچہ مقامی سطح پر اقتدار کا احساس تو صرف ذہنوں ہی میں باقی رہ گیا تھا۔ انگریز کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھے کہ ایک باریک سا پردہ اٹھا دیا جائے۔ مقامی سطح پر یہ (۱۸۵۷ء) انگریز کو نکالنے کی آخری کوشش تھی جو بوجوہ کامیاب نہ ہو سکی اور ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان کی بلاشرکت غیرے حکمران بن گئی۔

برصغیر میں مسلم حکومت کے زوال کے محرکات پر طویل گفتگو ہو سکتی ہے۔ اس زوال کا آغاز اٹھارویں صدی کے شروع میں ہی ہو گیا تھا اور اٹھارویں صدی کے شروع کے آخر تک ایسٹ انڈیا کمپنی برصغیر میں اپنی جڑیں مضبوط کر چکی تھی۔ چنانچہ اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) سے بہادر شاہ ظفر کی جلاوطنی (۱۸۵۷ء) تک کا عرصہ ایک حوالے سے تحلیلی عہد ہی کہلا سکتا ہے کیونکہ اس عرصے میں اس ذہنی شکست کی طرف بڑھ رہے تھے جس کا ڈراپ سین ۱۸۵۷ء میں ہوا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ظاہری اقتدار کا باقاعدہ آغاز تھا۔ جس کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی جہانگیر کے عہد سے کوشش کر رہی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس کے لیے کہیں طاقت، لالچ کہیں فریب اور کہیں تجارت کے بہانے اپنے قدم بڑھائے۔ اقتدار کے حصول کے لئے انگریزوں نے بیک وقت مراعات اور ظلم و ستم دونوں سے کام لیا۔ ظلم و ستم کا یہ سلسلہ ۱۸۵۷ء سے ہی مشروط تھا بلکہ اس کا آغاز انگریز اقتدار کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا۔

''چنانچہ ملازمین کا وہ طبقہ جو شروع سے آخر تک نہایت جانفشانی کے ساتھ وفادار رہا، ان سے بھی بعض افسران نہایت بے جا طور ہر سختی کرتے، اکثر کو زدوکوب کیا جاتا۔۔۔۔ دہلی میں قتل عام کی منادی کی گئی۔ حالاں کہ ان میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جن کے متعلق ہمیں علم تھا کہ وہ ہماری فتح کے خواہش مند ہیں۔ ہمارے اکثر نوجوان تو محض خون گرانے کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے اپنی ہی فوج کے ہندوستانی اردلیوں اور پوربی گھسیاروں کو گولی سے اڑا دینے کی تمنا کا اعلانیہ اظہار کرتے تھے۔'' دہلی میں داخل کے بعد انگریز فوجوں نے ظلم و بربیت کا بازار گرم کیا اس نے تاتاریوں کے حملہ بغداد کی یاد تازہ کر دی۔ دلی کے گلی کوچوں میں خون کی ہولی کھیلنے کے ساتھ ساتھ اجتماعی عصمت دری بھی کی گئی۔

''سورج اسی طرح روشن تھا۔ دھوپ اسی طرح زندہ تھی بندوقوں کی آوازیں اور مرنے والوں کی چیخیں اسی طرح بلند ہو رہی تھیں۔ ان کے درمیان خوموشی کا چھوٹا سا وقفہ سناٹے کی تلوار پر ٹل جاتا۔ ایسے ہی ایک وقفے میں ایک گھٹا گھٹا دھماکہ سا ہوا۔ پھر ایسے دھماکے ہوتے رہے۔ دیر تک ہوتے رہے۔ پھر داروغہ خبر لایا کہ فیض بازار میں عورتوں کی اجتماعی آبروریزی کی خبروں نے شریفوں کو بے حواس کر دیا ہے اور اکثر گھرانوں کے مردوں نے اپنے ہاتھ سے اپنی عورتوں کو قتل کر کے کنویں میں ڈال دیا ہے۔ یہ آوازیں اسی کی ہیں۔'' برصغیر کے عام لوگوں کے ساتھ عموماً اور مسلمانوں کے ساتھ

خصوصاً ایسے ظالمانہ سلوک کا مقصد صرف یہ تھا کہ لوگ جغرافیائی شکست کے ساتھ ساتھ ذہنی شکست بھی قبول کر لیں۔ اس مقصد کے لئے انگریزوں نے جو کچھ کیا اس کے چند مناظر خود انگریزوں کی تحریروں سے دیکھیے۔

"ہم پشاور سے جہلم پیادہ سفر کرتے ہوئے پہنچے اور راستے میں کچھ "کام" بھی کرتے ہوئے یعنی باغیوں سے اسلحہ چھینا اور ان کو پھانسیوں پر لٹکایا۔ چنانچہ توپ سے باندھ کر اڑا دینے کا جو طریقہ ہم نے استعمال کیا اس کا لوگوں پر ایک خاص اثر ہوا یعنی ہماری ہیبت ان کے دلوں میں بیٹھ گئی۔" "ایسا کرنے سے ہماری مراد یہ تھی کہ مسلمان بدمعاشوں کو بتایا جائے کہ خدا کے حکم سے صرف انگریز ہی ہندوستان پر حکومت کریں گے۔" "جب تقریباً ڈیڑھ سو آدمیوں کو اس طرح گولی سے اڑا دیا گیا تو قتل کرنے والوں میں سے ایک شخص غش کھا کر گر گیا۔ اس لئے آرام کرنے کے لئے تھوڑا سا وقفہ دیا گیا اور جب دوبارہ قتل عام کی کاروائی شروع کی گئی اور تعداد ۲۳۷ تک پہنچی تو ایک افسر نے آکر اطلاع دی کہ باقی باغی برج سے باہر آنے سے انکار کر رہے ہیں۔ اس پر برج کے دروازے کھولے گئے تو معاً ایک نہایت دردناک نظارہ دیکھنے میں آیا۔ جس سے ہال دل کے بلیک ہول کی یاد تازہ ہو گئی۔ یعنی ۴۵ آدمیوں کی لاشیں باہر لائی گئیں جو خوف، گرمی، سفر کی صعوبت اور دم گھٹنے کے سبب ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ہلاک ہو گئے تھے۔"

زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں سینا یا پھانسی دینے سے پہلے ان کے جسم پر سور کی چربی ملنا یا زندہ آگ میں جلا دینا یا ہندوستانیوں کو مجبور کرنا کہ ایک دوسرے کے ساتھ بدفعلی کریں ایسی مکروہ اور متعفانہ حرکات کی دنیا کی کوئی تہذیب بھی اجازت نہیں دیتی۔ خود انگریزوں کے دیے ہوئے اعداد و شمار پر ہی یقین کر لیا جائے تب بھی ظلم و ستم کا شکار ہونے والوں کی تعداد لاکھوں میں پہنچتی ہے۔ اس تشدد اور ظلم کے سہارے انگریزوں نے برصغیر میں اپنی حکومت کی بنیاد رکھی اور آہستہ آہستہ یہاں کے سیاسی، سماجی، فکری اور ثقافتی رویوں پر اپنی گرفت اس طرح مضبوط کر لی کہ مقامی آبادی ان کی سیاسی اور معاشی غلامی کے تسلط میں آگئی۔ اپنے اس تسلط کو مضبوط کرنے کے لئے انہوں نے برصغیر کے لوگوں کی عموماً اور مسلمانوں کی خصوصاً فکری ادبی اور ثقافتی اقدار پر جدید تکنیک سے اس طرح حملہ شروع کیا کہ لوگوں کو علم نہ ہو سکا کہ ان کے ساتھ کیا ہاتھ ہو رہا ہے۔

۱۸۵۷ء کے خون آشام عہد کے ختم ہوتے ہی ایک نئی فضا نے جنم لیا۔ کل تک کے صاحبِ اقتدار زندگی کی عام ضرورتوں کے لئے بھی محتاج ہو گئے اور یہ محتاجی اقتصادی صورت حال تک محدود نہ رہی کہ ذہنی اور فکری سطح پر بھی ایک مجموعی بے چارگی کا احساس ابھر آیا۔ "وہ شہر صدیوں سے آباد تھا چشم زدن میں ویران ہو گیا۔ اس سرزمین ویراں پر قدم نہ رکھا جاتا تھا۔"

زوال کی ابتداء تو اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) سے ہو گئی تھی۔ ۱۸۵۷ء تو اس کا اختتام تھا بلکہ اسے اختتام کی بجائے دوسرے مرحلے کا آغاز کہنا چاہیے۔ اورنگ زیب کا زمانہ مغل اقتدار کی وسعتوں کا عروج ہے لیکن اس عروج میں زوال کی لہریں بھی نمودار ہو چکی تھیں۔ اورنگ زیب کی آنکھیں بند ہوتے ہی وسیع مغل سلطنت منتشر ہونا شروع ہو گئی۔ جانشینوں کی نااہلیوں اور ہوس پرست امراؤ حاکموں کی جاہ پسندیوں نے چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں کو جنم دیا۔ مغلوں نے کسی نظام حکومت کی تشکیل نہیں کی تھی بلکہ "شخصی عقل" اور "ذاتی فہم" کی بنیاد پر اپنے عہد کو مضبوط کیا تھا۔ چنانچہ ان کی حکومت کا نظام شخصی دانائی تک ہی محدود تھا چنانچہ جب اس پر نااہلی کی ضرب پڑی تو چشم زدن میں سارا نظام دھڑام سے نیچے آرہا اس پر تیموری شہزادوں کی بزم آرائیوں نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ اورنگ زیب کے جانشینوں نے وہ کام کئے کہ بیان کرتے شرم آتی ہے۔ شیخ محمد اکرم رود کوثر میں لکھتے ہیں۔

"اس (عالمگیر) کی آنکھیں بند ہوتے ہی حالات پہلے سے بھی بدتر ہو گئے۔ اس کی وفات کے پانچ سال بعد تخت دہلی پر اس کا پوتا معزالدین جہاندار اورنگ نشیں ہوا۔ جس نے لال کنور کے ساتھ اس طرح رنگ رلیاں منائیں اور اس کے اقارب کو اتنے بڑے عہدے دیئے کہ بادشاہت اور امارت کا وقار ختم ہو گیا۔" (۴)

اٹھارویں صدی کے عظیم شاعر میر کا عہد ختم ہوتا ہے تو انیسویں صدی کے عظیم شاعر غالب کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ مغل سلطنت اپنی زندگی کی آخری سانس لے رہی تھی۔ انگریزوں کے قدم جم رہے تھے۔ اور وقت نے مغل اقتدار کے خاتمے کا قرعہ بہادر شاہ ظفر کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔ یہ سارا تماشا غالب جیسے شاعر کی آنکھوں سے اوجھل نہ تھا۔ غالب مغل تہذیب کی عظمت اور زوال دونوں کے عکاس ہیں غالب وہ نوحہ گر ہیں جن کے نوحے ایک طرف تو اپنے دور کی عظمت کی قسم کھاتے ہیں اور دوسری جانب کمال خاموشی سے اس کے کھوکھلے پن پر پڑے ہوئے پردے کو بھی ہٹاتے چلے جاتے ہیں یہیں سے غالب کی شخصیت کے کئی پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔ وہ موت کے قدموں کی چاپ سن رہے تھے کہ مغل تہذیب اور اقتدار کس بھیانک انجام سے دوچار ہونے والا ہے لیکن انہوں نے اس کا واضح اظہار نہیں کیا بلکہ اس الم انگیز لمحے سے نشاط کشید کرنے کی کوشش کی یوں وہ اس ظاہر داری پر طنز بھی کر گئے اور اس سے والہانہ پیار کا اظہار بھی۔ سیاسی و تہذیبی کشمکش کا منظر اپنے انجام کے قریب تھا۔ زمین تنگ اور آسمان قہر آلود، سو غالب کو کہنا پڑا

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

غالب کو پڑھتے ہوئے ذہن میں جو تصویر ابھرتی ہے وہ ایک برباد ہوتے ہوئے چمن اور تہذیب کی تصویر ہے۔ سیاسی تہذیبی اور معاشرتی و معاشی زوال نے برصغیر کی خصوصاً مسلمانوں کی زندگیوں کو ہی بدل دیا۔ ان کی فکر اور سوچوں کو مایوسیوں سے ہمکنار کر دیا۔ لوگ اس بڑی تباہی کو دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے۔ وقتی طور پر ماؤف ہوگئے اور فکر منجمند۔ انگریزوں نے اس صورتحال سے پورا فائدہ اٹھایا اور اس "ہونے" اور "نہ ہونے" کے تذبذب میں ثقافتی اور فکری یلغار کر دی۔ فورٹ ولیم کالج کے ذریعے انگریز اردو ادب میں پہلے ہی اپنی ترجیحات نمایاں کر چکا تھا اور اردو زبان و ادب پر اپنا اثر قائم کر چکا تھا اب اسی نے باقاعدہ ایک منصوبے کے ساتھ زبان و ادب کو اپنی پالیسی کے مطابق چلانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس وقت برصغیر کے مسلمان واضح طور پر تین گروہوں میں بٹ چکے تھے اول وہ جو اس ساری صورت حال کو سمجھنے سے قاصر تھے اور کسی قیمت پر نئی حکومت سے مفاہمت کرنے کے لیے تیار نہ تھے' حتیٰ کہ انگریزی پڑھنے کو بھی کفر سمجھتے تھے۔ دوم وہ جو نئی حکومت سے نہ صرف متاثر تھے بلکہ قومی ترقی کے لیے اس سے مفاہمت کرنے اور ان کے علوم حتیٰ کہ ثقافت کو اپنانے ہی کو وقت کی اہم ضرورت خیال کرتے تھے۔ سوم' وہ جو محتاط طریقے سے ساری صورتحال کو سمجھنا چاہتے تھے یعنی وہ ایک طرف تو اپنی ثقافتی پہچان بھی برقرار رکھنا چاہتے تھے اور دوسری طرف انگریزی کے ذریعے نئے علوم تک رسائی بھی چاہتے تھے۔ سرسید کا تعلق دوسرے گروہ سے تھا جو نہ صرف نئی حکومت سے مفاہمت ضروری خیال کرتے تھے بلکہ تیزی کے ساتھ مغربی کلچر کو بھی اپنانا چاہتے تھے اور تیسری قسم کا تعلق اودھ پنچ کے حلقہ احباب کا تھا۔ فتح محمد ملک انیسویں صدی کے نصف آخر کی ادبی اور فکری تحریکوں کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

> "سرسید کی تحریک نے ہمیں اس جذبہ حریت سے ڈرنا سکھایا جس کا نقطہ عروج ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی تھی۔ اسلامی ہند کے زوال کے آغاز سے لے کر سن ستاون تک کے بغاوت انگیز اور حریت پرور ادب سے ہماری لاعلمی اور محرومی جہاں انگریزوں کی وحشت و بربریت کا نتیجہ تھی وہاں سرسید کی کلیسانواز عقلیت پسندی کا شاخسانہ بھی ہے"(۵)

سرسید کے بنیادی نقطہء نظر کو سمجھنے کے لیے اسباب بغاوتِ ہند میں ان کا یہ تجزیہ بڑا اہم ہے کہ "اس میں شک نہیں ہماری گورنمنٹ کی رعایا کے طور اطوار اور جو دکھ ان کے تھے' ان کی اطلاع نہ تھی" (۶) آگے چل کر وہ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کو مسلمانوں کی آمد کے مماثل قرار دیتے ہوئے انہیں تمام جرائم سے بری الذمہ قرار دیتے ہیں' شاید اسی رویے پر طنز کرتے ہوئے اکبر الہ آبادی نے کہا تھا۔

مٹاتے ہیں جو وہ ہم کو تو اپنا کام کرتے ہیں
مجھے حیرت تو ان پر ہے جو اس مٹنے پہ مرتے ہیں

سر سید کے خلوص پر شبہ نہیں کیا جاسکتا انہوں نے اس وقت کے معروضی صورت حال میں شائد صحیح فیصلہ کیا تھا لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ اندازہ نہیں کر سکے جس پیروی مغرب کو وہ قوم کی ترقی وبقاء کے لئے ضروری سمجھ رہے ہیں وہ ''گودے'' کی بجائے ''چھلکے'' تک محدود ہو گئی ہے۔ محمد حسن عسکری نے اس ساری صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔''اس طبقے نے سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ اپنے اور انگریزوں کے درمیان جو سب سے بڑا فرق تھا اسے مناسب طریقے سے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ انگریزوں کی مادی ترقی کا ان پر ایسا رعب پڑا کہ اپنا علم اپنا ادب' اپنی تہذیب' اپنے طور طریقے سب کچھ ہلکے نظر آنے لگے۔ انیسویں صدی کے انگلستان کی بنیاد جس پر احیک پر تھی اسے تو انہوں نے گرفت میں لانے کی کوشش نہیں کی اس پر احیک کی وجہ سے جو اقدار پیدا ہو رہی تھیں انہیں قبول کرنے کی فکر پہلے ہو گئی ۔ اس زمانے میں خود یورپ والوں کا شعور ایک کشمکش میں مبتلا تھا مگر ان لوگوں کو اس کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ انہوں نے انگلستان کے سیاسی اور معاشرتی نظام' ادب کلچر سب کو بڑی سرسری نظر سے دیکھا تھا اور اسی نظر سے خوش گزرے میں دل بھی دے بیٹھے تھے' چنانچہ دونوں تہذیبوں کا گہرا اور تقابلی مطالعہ کئے بغیر وہ اس کوشش میں لگ گئے کہ اول تو اپنے یہاں کی ہر چیز کو مغربی معیاروں سے جانچ کر ان میں وہ خوبیاں نکالی جائیں جو مغرب والوں کے نزدیک بھی خوبیاں ہوں اور اگر کھینچ تان کے بھی خوبیاں نہ نکل سکیں تو چار و ناچار اپنی چیز کو گھٹیا سمجھ لیا جائے۔ ایس کوشش زندگی کے ہر شعبے میں ہوئی''(۷)

بہر حال انگریزوں کی طرف سے مقامیوں کی اس مفاہمت پسندی کو اچھی نظر سے دیکھا گیا اور انہوں نے زیادہ کھل کر اور بھرپور طریقے سے ثقافتی اور فکری یلغار کا آغاز کیا۔ اس کا پہلا ہدف زبان بنی کیونکہ انگریز یہ بات اچھی طرح سمجھتے تھے کہ جب تک مسلمانوں کے ذہنوں سے اقتدار کی فکری باقیات کو نہیں نکالا جائے گا وہ مکمل طور پر انگریزی اثر قبول نہیں کریں گے۔ اور اس کے لیے پہلی بنیاد زبان کی تبدیلی تھی۔ مغلوں کے وقت سے فارسی سرکاری زبان تھی اس حوالے سے فارسی فکری اور علمی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ اشرافیہ کی زبان بھی تھی۔ فوری طور پر اس کے متبادل طور پر انگریزی کا آنا ممکن نہ تھا اس لیے اردو کو منتخب کیا گیا جو اس وقت تک ''بازار'' کی سطح سے نکل کر ادبی زبان کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ شعر وادب کا ایک وقیع ذخیرہ اس میں جمع ہو چکا تھا اور ابھی یہ زبان ہندو تعصب کا شکار بھی نہیں ہوئی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے ساتھ پر شکوہ ماضی کا کوئی سلسلہ بھی وابستہ نہیں تھا چنانچہ اردو نے بڑی آسانی سے فارسی کی جگہ لے لی۔ فارسی کا جانا ماضی کی شان و شوکت اور اقتدار کے ایک طویل دور کا جانا تھا۔ بعد میں آہستہ آہستہ اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار

دے کر ہندو دشمنی کی راہ ہموار ہو گئی اور انگریزی بڑی آسانی سے مقبول بلکہ ملازمت کی زبان بن گئی جس کا سیکھنا اقتصادی خوش حالی اور سرکار میں رسائی کے لئے ضروری ہو گیا۔ اس کا بالآخر نتیجہ یہ نکلا کہ وہ تہذیب جس کا وقار مسلمانوں کے اقتدار سے وابستہ تھا رفتہ رفتہ ختم ہوتی چلی گئی اور ہندوؤں کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی انگریز کی تجویز کردہ راہ پر چلنے پر مجبور ہو گئے۔ اور روزگار کی زبان انگریزی بنی تو علوم کے راستے بھی اسی سے کھلے کہ اب جو نئے علوم آرہے تھے ان کا دروازہ انگریزی تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قدیم مشرقی علوم بے معنی اور بے سود ہو گئے اور ان کی طرف سے بے اعتنائی بڑھنے لگی انیسویں صدی کے آخر تک پہنچتے پہنچتے فکری رجحانات میں بھی کئی تبدیلیاں آئیں انفالی صورت حال قدرے تبدیل ہو کر جدید رویوں میں ڈھلنے لگی۔ نیا عہد بڑی آہنگی سے دبے پاؤں آیا۔ مشرق و مغرب' جدید و قدیم' بدعت و سنت' شاہی و گدائی' معاشی سطح پر انگریزی کی بالادستی کے بعد عیسائی مشنریوں کی آمد سے مذہبی چیلنج نے ایک ابتری کی صورت حال پیدا کر دی۔ "انیسویں صدی کے درمیان بہت سے پڑھے لکھے لوگوں کا اعتقاد مذہب سے اٹھ گیا۔ جو زیادہ حساس تھے وہ ان چیزوں کو شبے کی نظر سے دیکھنے لگے۔ یہ عمل اور اس کے اسباب و نتائج کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہیں۔ مختصر یہ کہ فن کار مذہب' سائنس' ملک و قوم' خاندان' اخلاقی تصورات سب سے بے زار ہوتا چلا گیا کیونکہ اس کی دنیا میں کوئی مرکزی تصور نہیں رہا تھا۔ جس سے سب چیزیں بندھی رہ سکیں"

اعتقاد کے ٹوٹنے سے بے سمتی جنم لیتی ہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں انسانی زندگی کی بے توقیری نے فرد کو لامرکزیت کا شکار بنا دیا' چنانچہ کسی منظم ادبی تحریک کی بجائے مختلف رجحانات پیدا ہوئے۔ سر سید احمد خان کی فکری کوششوں نے بے معنویت اور بے مقصدیت کی فضاء سے نکلنے میں اہم کردار ادا کیا۔ مقصدیت کے جوش نے ادب کو ایک نیا ولولہ عطا کیا اور افراط و تفریط سے قطع نظر اردو ادب نے پہلی بار عام معاشرتی سطح پر اپنا رابطہ استوار کیا۔ نیچریت کے حوالے سے ایک نیا رویہ سامنے آیا جس کی وجہ سے شاعری کا رخ دربار معلیٰ سے ہٹ کر ارباب محلہ کی طرف ہونے لگا اور نئے رویوں کی بازگشت سنائی دینے لگی۔

اب بھاگتے ہیں سایہ عشق بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

(حالی)

سر سید کی نیچری تحریک اور عقلیت پسندی نے تھکے ہوئے ذہنوں کو ایک سکون عطا کیا۔ معاشرتی سطح پر سر سید کی فکر نے جو اہم ترین کردار ادا کیا اس کے نتیجے میں اردو ادب داخلی عناصر میں الجھنے کی بجائے خارج میں سانس لینے پر آمادہ ہوا۔ یہ

تبدیلیاں جو معاشرے کو ایک نئے رنگ میں ڈھال رہی تھیں، فکری سطح پر اپنا اثر دکھانے لگیں۔ اس کی ایک عملی شکل تو "انجمن پنجاب" کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی۔ "انجمن پنجاب" کی کوششوں سے "زبان" اور "مضمون" دونوں سطحوں پر تبدیلیاں رونما ہوئیں اور نیچریت کو فروغ حاصل ہوا۔

غزل کی بجائے نظم توجہ کا مرکز بنی۔ انجمن کے اولین اجلاسوں میں نظم کی نئی ہیت کا تصور سامنے آیا اور نیچر کے موضوع کے بے مقصدیت کے باوجود اردو نظم ایک بڑی کروٹ لے کر جدید عہد میں داخل ہوگئی۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۰ء کے درمیانی عرصہ کا جائزہ لیں تو دو نمایاں رجحان سامنے آتے ہیں۔ ایک یاسیت اور آہ وبکا کی منتشر لہریں جن کے درمیان جن کے درمیان کہیں نہ کہیں جذبہ جہاد کی کمزور سی صورت بھی موجود ہے اور اس حوالے سے مذہبی اصلاح کاروں کی کوششیں۔ دوسرا رجحان مقصدیت کا جوش وخروش، دبستان سرسید اور اس کے متفقین کے حوالے سے سامنے آیا۔ غزل میں دونوں صورتیں ساتھ ساتھ چلتی رہیں۔ یعنی نیا رویہ اور پرانی بازگشت۔ نظم میں اس دور کی نمایاں آوازیں حالی، آزاد، شبلی، اور اسماعیل میرٹھی کی ہیں۔ جبکہ غزل میں یہ دور داغ اور امیر مینائی کا ہے۔ نظم کے شاعروں میں سے حالی کی آواز میں توانائی کے ساتھ ساتھ مقصدیت اور فن کا امتزاج دوسروں کی نسبت زیادہ خوبصورت اور تخلیقی ہے۔ نثر میں جدید رویوں کی ترجمانی خود سرسید اور پھر ڈپٹی نذیر احمد کے یہاں ہوئی۔ نذیر احمد کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اردو داستان کو تصوراتی دنیا سے نکال کر جیتی جاگتی حقیقتوں سے آشنا کی اور "ابن الوقت" میں تو انہوں نے اپنے عہد کے ایک اہم سیاسی مسئلے کو موضوع بنایا۔ شرر کے ناول بھی ماضی کی شاندار روایتوں کی تلاش کے حوالے سے نئی نسل کو ایک حوصلہ اور توانائی دینے کی کوشش تھے۔ اس عہد کا ایک بڑا رجحان سرشار اور اکبر الہ آبادی کے حوالے سے سامنے آتا ہے۔ سرشار نے طنز اور اکبر نے ظرافت اور طنز دونوں سے کام لے کر اس عہد کی متوازن عکاسی کی ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کو حال کے منطقے میں تہذیبی ارتفاع کا استعارہ قرار دیتے ہوئے اس رویے کی بات کرتے ہیں جو اوپر درج کئے گئے دونوں رجحانات سے مختلف ہے۔

> "تیسرا رویہ حال میں زندگی کی کوئی علامت بنا احساس کمتری کو ختم کرتا اور افسردہ تہذیبی منظر میں زندگی کی ایک لہر پیدا کرتا ہے۔ یہ بھرپور توانا علامت کارزار حیات میں آگے بڑھنے اور مسائل کو تسخیر کرنے کا عزم اور حوصلہ دیتی ہے۔ یہ تیسرا رویہ فساد آزاد میں سرشار نے آزاد کی شکل میں پیدا کیا ہے"(۸)

اکبر الہ آبادی نہ تو پیروئی مغرب کے سامنے سر جھکاتے ہیں اور نہ ماضی پرستی کا پرچار کرتے ہیں بلکہ حال کے منطقے میں اپنی بات کو حال اور مستقبل کے ساتھ جوڑ کر اسے ایک تسلسل عطا کرتے ہیں، اور تسلسل ہی وہ توازن تھا جس پر چل کر مسلم

معاشرہ ایک بہتر شکل اختیار کر سکتا تھا۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اس صورت حال اور اکبر الہ آبادی کی متوازن فکر پر یوں تبصرہ کرتے ہیں۔ ''اکبر برطانیہ اور مغرب کے شدید مخالف تھے' مگر یہ مخالفت محض جذباتی یا مشرقیت سے مبہم لگاؤ کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ اس کی ایسی وجوہ تھیں جو آسانی سے رد نہیں کی جاسکتیں۔ وہ مغرب کے اس وجہ سے مخالف تھے کہ ہندوستان میں جو اقدامات کیا جارہے تھے وہ مقامی باشندوں کی بھلائی کے نام پر ہورہے تھے مگر ان کی تہہ میں برطانوی حکومت کے استحکام کا مقصد پنہاں تھا۔ تعلیم جدید ہو یا رسل و رسائل کے ذرائع کی توسیع' مقننہ ہو یا عدلیہ' سبھی باتیں سلطنت کے استحکام اور دوام کے مقاصد انجام دینے کے لئے وجود میں آئی تھیں' مگر تاثر یہ دیا جاتا تھا کہ یہ سب مقامی باشندوں کو ترقی یافتہ اقوام کے دوش بدوش چلانے کے لئے ہیں۔ بعض مضامین' جن میں سرسید احمد خان پیش پیش تھے' اگرچہ برطانوی حکمت عملی کو سمجھتے تھے تاہم بہ امر مجبوری مسلمانوں کو انگریزوں سے تعاون کا مشورہ دیتے تھے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ انگریزی حکومت ہندوستان میں ہمیشہ رہے گی۔ اس صورت میں انگریزوں سے تصادم کی پالیسی اختیار کرنا خطرناک ہوگا۔ اکبر الہ آبادی' سرسید کی اس حکمت عملی کے سو فیصد خلاف نہ تھا قوم کو جدید تعلیم وہ دینا چاہتا تھے مگر ان کا خیال تھا کہ تعلیم ایسی نہیں ہونی چاہیے جیسی علی گڑھ میں دی جارہی ہے یہ کہ تعلیم مسلمانوں کو عارضی فائدہ پہنچائے گی۔ مگر آخر کار سخت مضر ثابت ہوگی۔ تعلیم جدید مفید ہوگی تو سائنس اور ٹیکنالوجی کی' نہ کہ ادبیات اور فلسفے کی'' (۹) یہ اختلافات جدید تعلیم کے بارے میں نہیں تھا بلکہ جدید تعلیم کی نوعیت کے بارے میں تھا۔ اسی بات کو محمد حسن عسکری نے بھی محسوس کیا ہے کہ سرسید کی پیروئی مغرب کی تحریک سے ہم نے مغرب سے کوٹ پتلون پہننا تو سیکھ لیا لیکن مغرب کی روح کو نہ جان سکے۔ ''سرسید نے قرآن اور سائنس کی مطابقت دکھانے کے لئے سینکڑوں صفحے لکھ ڈالے۔ اسی طرح ادب میں نیچرل شاعری پیدا ہوئی جسے اچھی شاعری تو کیا' اچھی نقل بھی نہیں کہا جاسکتا۔ اگر مسلمانوں کو واقعی حالات سے ایسی مطابقت پیدا کرنی تھی کہ ایک دن خود مغرب سے ٹکر لینے کے قابل ہو جائیں تو انہیں سب سے پہلے مغرب کی پراتیک پر قبضہ جمانا چاہیے تھا' مگر اس زمانے میں مسلمانوں کو سب سے بڑی تشویش یہ ے تھی کہ ہندو سرکاری ملازمتوں میں ہم سے آگے نکلے جارہے ہیں۔ ہندؤں کو دوڑ کے پکڑ لینے کی جلدی میں انہوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی جیسے علوم کی طرف توجہ نہیں کی بلکہ انگریزی زبان اور انگریزی ادب پڑھا اور وہ بھی صرف اس حد تک جہاں یہ چیزیں ملازمت دلانے میں کام آئیں'' (۱۰) یہ اس دور کا مجموعی رویہ تھا' لیکن کچھ لوگ ضرور ایسے تھے جو اس اندھی تقلید کو تشویش کی نظر سے دیکھ رہے تھے اور اکبر الہ آبادی ان میں سرفہرست ہیں محمد حسن عسکری کہتے ہیں۔

''اس زمانے کے تمام اہل دماغ حضرات میں ایک اکبر الہ آبادی ایسا تھا جسے مسلمانوں کی

پوری صورتحال کا گہرا اور سچا علم تھا' صرف وہی ایک آدمی تھا جس نے انگریزوں کی لائی
چیزوں میں استعارے اور علامتیں دیکھیں اور ان کے معنی اپنی قوم کو سمجھانے کی کوشش
کی مگر اسے دقیانوسی یا پرانی لکیر کا فقیر سمجھ کر ٹال دیا گیا"(۱۱)

۱۸۵۷ء سے شروع ہونے والا یہ سفر ۱۹۰۰ء تک پہنچتے پہنچتے کئی ظاہری اور باطنی تبدیلیوں سے ہمکنار ہوا اور عام زندگی پر اس کے اثرات کئی طرح محسوس ہوئے۔ سب سے بڑی تبدیلی انگریزی زبان کے حوالے سے مغربی فکر سے عارف ہوا۔ تعلیمی اداروں میں تعلیم کا جو نیا انداز اور نیا نصاب رائج ہوا اس سے وقتی طور پر تو ایک ارتعاش پیدا ہوا مگر یہ ارتعاش جلد ہی معاشی دوڑ ملازمتوں کے حصول میں ڈھل گیا' لیکن یہ ضرور ہوا کہ مغربی صنعتی زندگی کے اثرات ہمارے دبستانوں پر پڑنے لگے۔ مارکس' فرائڈ اور دیگر مفکرین کے افکار بحثوں کا حصہ بننے لگے۔ اس مجموعی فضاء میں ایک تبدیلی کا احساس ہوا چنانچہ بیسویں صدی کے آغاز میں جن رویوں نے شعر و ادب میں نمایاں حیثیت حاصل کی ان میں قومی حمیت یعنی قوم پرستی حقیقت پسندی اور رومانیت پسندی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مجلہ اودھ پنچ اردو ادب میں طنز و مزاح کے حوالے سے اپنی علیحدہ شناخت کا حامل ہے لیکن اس میں مثالوں اور تحریروں کے اندازِ مزاح کو بغور دیکھا جائے تو ہمیں اس میں مزاحمتی اثرات بہت واضح دکھائی دیتے ہیں گذشتہ برسوں میں مزاحمتی فکر کے حوالے سے مشرق و مغرب کی مختلف زبانوں میں اپنی ادبی تاریخ پر نظر ثانی کرنے اور ادب کو تہذیبی و ثقافتی اظہار کے طور پر دیکھنے کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے اس کے نتیجے میں تہذیب سیاق و سباق میں ادبی نظریہ سازی کے محرکات کا مطالعہ ایک خاص اہمیت کا حامل ہو گا۔ پیشِ نظر تحقیق اودھ پنچ میں نو آبادیات مخالف کردار کے فکری، نظریاتی اور فلسفیانہ تصور کو اجاگر کرے گی

۲۔اودھ پنچ کا تعارف

i. اودھ میں اردو نثر کے ابتدائی نقوش

اودھ کے پہلے دو صوبہ دار برہان الملک سعادت خاں اور صفدر جنگ کو انتظامی امور اور میدان جنگ کی مصروفیات نے اتنا موقع نہ دیا کہ شاعری یا دوسرے فنون لطیفہ کی ترقی کی طرف توجہ دیتے لیکن ان کو شاعری کا فطری ذوق تھا۔ لیکن شجاع الدولہ سے پہلے دربار میں شعر و ادب سے عام دلچسپی نہ تھی۔ نہ تو سلطنت کو استحکام حاصل ہو سکا تھا۔ شجاع الدولہ نے

حکومت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی مختلف علوم وفنون کی طرف غیر معمولی توجہ دی۔ دربار میں علمی وادبی فضا کے ساتھ ساتھ باغات، عمارات، شان وشوکت اور ایک مخصوص تہذیبی وثقافتی فضا قائم کرنے پر توجہ دی جانے لگی۔

اردو بول چال کے رواج کے سلسلہ میں اشر وادی لال کے خیالات لسانی ارتقا کے مطالعہ کی بنیاد پر قابل قبول ہیں یا نہیں لیکن اسی دور میں سودا کی بعض نثری تخلیقات، اردو نثر نگاری کی تاریخ میں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ عام بول چال کے علاوہ امرا میں بھی فارسی کے ساتھ اردو رائج ہوتی جارہی تھی۔ البتہ ابھی تک تحریری شکل میں اردو کے نمونے موجود نہ تھے لیکن اودھ کے مورخین نے بعض جگہوں پر اشارہ کیا ہے کہ آصف الدولہ کے محل میں مصاحبین، احکام اور ملازمین کے فرائض انجام دینے اور روزانہ کے واقعات سے باخبر رکھنے کے لیے اردو میں ایک مختصر سا خبر نامہ لکھ کر تقسیم کیا جاتا تھا جو اخبارات ڈیوڑھی کے نام سے مشہور تھا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ اس کا چرچا عوام میں ہونے لگا اور اودھ میں اردو کی اشاعت کی یہی ابتدائی منزل کہی جاسکتی ہے۔

اودھ میں اردو کی باقاعدہ تصنیف کی حیثیت سے سب سے پہلے میر محمد حسین عطاخاں تحسین کی نوطرز مرصع کو اہمیت حاصل ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ داستان کی حیثیت سے بھی اردو میں اسی کو اولیت حاصل ہے۔ تحسینؔ نے یہ نثر جس دور میں لکھی اس وقت اہل علم فارسی نثر سے گہرا تعلق رکھتے تھے اس لیے ان کی اس نثر کو فنی اور صناعانہ لحاظ سے کافی پسند کیا جاتا تھا۔ واقعات بیان کرنے کے ساتھ اشعار کا استعمال طرزِ بیان میں دلچسپی پیدا کر دیتا تھا اور یہی پر شکوہ انداز سارے معاشرے کا تقاضا تھا۔ جس طرح اٹھارہویں صدی کی آخری دہائی میں اردو کے بہت سے شاعروں نے لکھنو میں رنگین و دلکش شاعری کی قابل قدر یادگاریں چھوڑی ہیں اسی طرح تحسین کی نوطرز مرصع بھی آصف الدولہ کے عہد کی اہم نثری تصنیف ہے جس کے زیر اثر بعد میں فسانہ عجائب ایک مخصوص ادبی اور معاشرتی زندگی کی نمائندہ تخلیق وجود میں آئی۔

اس سے پہلے دہلی میں فضلیؔ کی کربل کتھا یا سودا کے دیباچہ میں ریختہ (اردو) میں نثر کی مثالیں موجود تھیں لیکن اودھ کی اردو نثر کی یہ پہلی باقاعدہ تصنیف قرار دی جاسکتی ہے جو اپنے دور کے معاشرے کے ذوق کی نمائندگی بھی کرتی ہے۔ اودھ کے ابتدائی دور کے اردو نثر نگاروں میں محمد ہادی المعروف بہ مرزا مغل غافل کا نام بھی اہمیت رکھتا ہے۔ غافلؔ کی اردو تصانیف میں سب سے پہلے وسیلہ النجات ۱۷۹۴ء (۱۲۰۹ھ) یعنی آصف الدولہ کے دور میں لکھی گئی اس کے بعد زاہ آخرت اور نثر ماتم مکمل کی سب کا تعلق مذہبی موضوعات سے ہے۔ آصف الدولہ کے درباری حلقہ کے ساتھ ساتھ

عوام میں اردو کی مقبولیت بڑھتی جا رہی تھی اور اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر تک اردو کی نثر تصانیف کی طرف توجہ دی جانے لگی تھی چاہے ان کی اشاعت کی آسانیاں موجود نہ رہی ہوں۔

ii. اودھ پنچ کا پس منظر

"غدر ۱۸۵۷ء کو فرد ہوئے چند سال گزر چکے تھے۔ ہندوستان بیرونی مداخلت اور تسلط کے شکنجہ میں پورے طور سے کسا ہوا ہے۔ مسلمانوں کی قوم خصوصیت کے ساتھ اپنی شامت اعمال کا نتیجہ بھگت رہی ہے۔ اسلامی اخلاق اسلامی آداب اسلامی شعائر مدت ہوئی رخصت ہو چکے۔ نفاق خود غرضی وغداری نفس پرستی اور عیش پرستی کی گرم بازاری ہے۔ اس کے مقابلہ میں برطانیہ کا نقش ہر دل پر بیٹھا ہوا ہے۔ داد خواہی کے لئے انگریزی عدالتیں ہیں۔ تعلیم کے لئے انگریزی مدرسے ہیں۔ سفر کے لئے انگریزی سواریاں علاج کے لئے انگریزی شفاخانے ہیں۔ عزت و حکومت کے لئے انگریزی عہدے ہیں۔ حصول معاش کے لئے انگریزی پیشے ہیں زنیت و آرائش کے لئے انگریزی مصنوعات اور انگریزی بازار ہیں۔ غرض جس طرف بھی رخ پھرتا ہے حد نظر تک ایک غیر محدود لامتناہی پرچم انگریزی اقبال کا لہراتا ہوا نظر آتا ہے۔

اب مغرب کا جادو ساری قوم پر چل گیا۔ علم و فضل کا معیار کمال یہ قرار پایا کہ انگریزی زبان آجائے۔ تلفظ انگریزوں کا سا ہو جائے اور انگریزی علوم سے واقفیت ہو جائے۔ تہذیب وشائستگی کی معراج یہ ٹھہری کہ کھانا انگریزی کھایا جائے۔ لباس انگریزی پہنا جائے اور انگریزی تقلید میں خاندان مشترکہ کے وجود کو ذلیل سمجھ کر ضعیف والدین اور دوسرے اعزہ سے قطع تعلق کر لیا جائے۔ شرافت و عزت کا منتہائے خیال یہ قائم ہوا کہ ہر ممکن ذریعہ سے انگریزی عہدے حاصل کئے جائیں۔ عقل و دانش کا مفہوم یہ قرار پایا کہ انگریزی مصنف کے قول پر بے چوں چرا ایمان لے آیا جائے اور اپنے علوم و فنون اپنے شعائر و رسوم اپنے عقائد و خیالات کو یکسر اوہام کا لقب دے کر انگریزیت کے صنم دلربا کے قدموں پر نثار کر دیا جائے۔"

۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ کا اجراء ہوا۔ منشی سجاد حسین اس کے اخبار کے بانی تھے اور جلد ہی انہوں نے اپنے اردگرد مشہور لکھنے والوں کو جمع کر لیا۔ گو اس سے پیشتر تہذیب الاخلاق بھی اپنے مخصوص مقاصد یعنی نئی تہذیب و تمدن کی تعمیر اور ترقی کے لئے کام کر چکا تھا تہذیب الاخلاق میں مغربی افکار اور نظریات کی یورش اور اس سے پیدا ہونے والی تبدیلیوں کی طرف نشاندہی کے ساتھ ساتھ بدلتے حالات اور تقاضوں کے مطابق زندگی کے طور طریقوں کو بدلنے اور اہمیت کا احساس اجاگر کرنے کی کوششیں نمایاں تھیں۔ تہذیب الاخلاق میں فکری اعتبار سے مغربی افکار و نظریات کی طرف زیادہ جھکاؤ تھا اور مشرقی تہذیب و تمدن کی بجائے مغربی تہذیب و تمدن کی تقلید کو زیادہ اہمیت دی گئی جس کے باعث سر سید کی ذات مشرقی افکار اور تہذیب کے

دلدادہ لوگوں کی نظر میں سخت تنقید کا نشانہ بھی بنی۔ اودھ پنچ ایک طرح سے سرسید کے زیر اثر پیدا ہونے والی اس افراط و تفریط کا رد عمل ہی تھا جو مغربی افکار تہذیب اور تعلیم کی طرف ان کے حد سے زیادہ جھکاؤ نے پیدا کر دیا تھا۔ سرسید کی کوششوں نے اگرچہ قوم کی گرتی ہوئی حالت سنبھالنے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان میں مغرب کی تقلید میں ایک طرح کی انتہا پسندی در آئی تھی۔ اور اسی انتہا پسندی میں مشرقی تہذیب و تمدن اور معاشرتی اقدار کو یکسر نظر انداز کرنے کا رویہ ان کے اندر پیدا ہوا۔ گویا مغرب کی ہر قدر ہر چیز رہن سہن کھانا پینا تہذیب و معاشرت سب کی سب قابل تقلید تھی اور مشرق کی قابل مذمت، سرسید کی اسی انتہا پسندی کے خلاف اکبر الہ آبادی نے بند باندھنے کی کوشش کی اور اودھ پنچ میں بھی اسی بات کو طنز و مزاح کا نشامہ بنایا گیا۔

سرسید نے پرانی طرز فکر و احساس کو بدلنے کی کوشش کی کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ ایک نئی تہذیب کا باب کھل رہا ہے۔ انہوں نے اور ان کے رفقاء نے ادب میں نئے موضوعات مثلاً تاریخ نگاری سوانح نگاری سے کام لیا جس کا مقصد مسلمانوں میں ان کے اسلاف کے کارناموں کی نشاندہی کر کے ان میں ہمت جرأت اور شجاعت پیدا کرنا تھا۔ اودھ پنچ کے پیش نظر بھی معاشرے کی اصلاح اور مسلمانوں کے درمیان قومی یکجہتی اور اپنی ذات پر اعتماد پیدا کرنا تھا۔ انہوں نے اس مقصد کے لئے طنز و مزاح کو ذریعہ بنایا کیونکہ یہ واحد مؤثر ذریعہ تھا جس کے تحت معاشرتی برائیوں اور خامیوں پر زیادہ بہتر طور ضرب لگائی جاسکتی تھی۔ مغرب کے مزاحیہ اور طنزیہ ادب سے متاثر ہو کر پہلی بار مغربی ادب کے حوالے سے اودھ پنچ کی تحریک سرسید تحریک کی ہلکی پھلکی شکل تھی۔

اودھ پنچ سے پہلے ظرافت کی مثالیں خطوط غالب میں موجود تھیں لیکن اودھ پنچ اور غالب کی ظرافت میں بہت فرق تھا غالب زندگی سے گہری دلچسپی رکھتے تھے ان کے نزدیک "قید حیات و بند و غم" کی اصلیت ایک ہے۔ اس لئے غالب کو زندگی کے یہ دونوں رخ عزیز ہیں۔ اس لئے ان کے ہاں غم کی تباہ کاریوں میں جوش نشاط اور تمنائے نشاط بدرجہ اتم موجود ہیں۔ نہ وہ معاشرتی اصلاح کے خواہاں تھے نہ کسی کی ذات ان کا ہدف تھی بلکہ طبعی شگفتگی اور زندہ دلی کی ایک بے ساختہ لہر تھی جس نے خالص مزاح کو جنم دیا اس طرح ایک سنجیدہ اور باوقار اور ابتذال سے پاک مزاح کی روایت پڑی۔

غالب کے بعد طنز و مزاح ایک باقاعدہ تحریک کی صورت میں اودھ پنچ میں نظر آیا ہے۔ جس نے اردو ادب میں باقاعدہ صنف کی حیثیت سے طنز و مزاح کی روایت اور داغ بیل ڈالی۔ اودھ پنچ کے لکھنے والوں میں منشی سجاد حسین پنڈت رتن ناتھ سرشار مرزا مچھو بیگ ستم ظریف تربھون ناتھ ہجر نواب سید محمد آزاد مولوی

عبدالغفور شہباز منشی جوالا پرشاد برق اور اکبر الہ آبادی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان لکھنے والوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں طبع آزمائی کی۔ سیاست تہذیب معاشرتی اقدار عرضیکہ ہر شعبہ زندگی کو انہوں نے طنز مزاح کے ذریعہ ہدف تنقید بنایا۔ اس طرح اس عہد میں خود احتسابی کا عمل بھی تیز ہوااور اردو نثر کا دائرہ اثر بھی بڑھا۔ بقول چکبست "اودھ پنچ کے ظریفوں کی شوخ وطرار طبیعت کارنگ دوسرا ہے ان کے قلم سے پھبتیاں ایسی نکلتی ہیں جیسے کمان سے تیر جو مظلوم ان تیروں کا نشانہ ہوتا ہے۔ روتا ہے اور دیکھنے والے اس کی بے کسی پر روتے ہیں۔ ان کے فقرے دل میں ہلکی سی چٹکی نہیں لیتے بلکہ نشتر کی طرح پیوست ہو جاتے ہیں۔ یہ خود بھی نہایت بے تکلفی سے قہقہے لگاتے ہیں اور دوسروں کو بھی قہقہے لگانے پر مجبور کرتے ہیں۔"

غالب کے یہاں معنویت کی گہرائی اور اعتدال تھا۔ لیکن اودھ پنچ کے رویے میں تیز طراری اور جذباتی رنگ حاوی تھا۔ انہوں نے اپنے بھڑکیلے شوخ اور تیز وطرار لہجے سے ہنسانے کی کوشش کی نتیجتاً کہیں کہیں بے اعتدال بھی ہو گئے لیکن ان کا بنیادی مقصد معاشرے میں بڑھتے ہوئے مغربی سیلاب پر بند باندھنا تھا جس کے اندر مشرقی اقدار اور روایات بہتی جارہی تھیں اور اندھا دھند تقلید کے سبب پیدا ہونے والی ذہنی کجروی نے اہل ہندوستان کو احساس کمتری میں مبتلا کرنا شروع کر دیا تھا وہ اپنے اسلاف اور قدیم اسلامی طرز زندگی کی اچھائیوں کو نظر انداز کر کے یہ سوچنے لگے تھے کہ ان کی ہر چیز خراب اور مغرب کی ہر چیز اچھی ہے وہ اپنے اسلاف کے کارناموں اور مثبت طرزِ عمل کو بھی اپنے لئے باعث شرم محسوس کرنے لگے تھے۔ یہی وہ منفی طرزِ عمل تھا جس کو اہل علم نے بڑی شدت سے محسوس کیا اور اس کی روک تھام کے لئے طنز و مزاح کی صنف کو اختیار کیا۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی تہذیب یا سماج یا اس کے کسی طبقہ کا زوال دراصل اس کے سخت اور بے لوچ اعتقادات کے باعث ہوتا ہے جس کے بعد ابتری بد حالی سماجی ناانصافی اس معاشرہ کا مقدر اور اخلاقیات کے مقدس رشتے پامال ہو جاتے ہیں۔ دنیا میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں جس طرح عظیم روم کی سلطنت زوال پذیر ہوئی۔ Theohosius کے مرنے کے بعد اقتدار کے لئے جنگوں کا آغاز ہوا تھا تو روم کی حکومت ڈاکوؤں اور ان کے وحشت ناک مظالم کی آماجگاہ بن گئی عوام کی سماجی زندگی میں گندگی اور وحشیانہ جذبات در آئے۔ سماجی ناانصافی نے عوام کو بددل کر دیا۔ چھوٹے چھوٹے عہدیدار تخت حاصل کرنے کے لئے عوام کو تختہ مشق بنانے لگے۔ مذہب کو اپنے اپنے مفادات کی خاطر توڑ موڑ لیا گیا۔ فوق الفطرت عناصر کا خوف تصنع جہالت تذبذب بے یقینی نے عوام کی زندگی اجیرن کر دی۔ لوٹ مار کا بازار گرم تھا اور کم و بیش یہی حالات ہندوستان

میں بھی پیدا ہوئے۔ جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد زوال آمادہ تہذیب زندگی کی کشمکش سے فرار حاصل کرنے کا جذبہ اور اس کے لئے عیش عشرت کی آغوش میں پناہ لینے کا خیال اپنے بے لوچ اعتقادات کے باعث ایک ساکن سماج نے جنم لیا۔ جس کے ارد گرد دنیا معاشرتی تہذیبی اور فنی اعتبار سے تو نئے سانچوں میں ڈھل گئی مگر یہ پسماندہ طبقہ اس نئی دنیا سے بے تعلق رہ کر ساری انسانی صفات یعنی سخاوت شجاعت حوصلہ دیانت اور راست بازی کو کھو بیٹھا۔ یہ لوگ اس تبدیلی کا احساس رکھنے کے باوجود اپنے آپ کو بدلنے سے قاصر تھے۔ اس طرح معاشرہ ایک گہری بے اطمینانی اور سرد اور گہری مایوسی کا شکار ہو گیا اور اس کی سرگرمیاں آہستہ آہستہ مہمل بے مقصد اور مضحکہ خیز بنتی چلی گئیں۔ ظاہری ہاہو شور و شغب راگ رنگ رقص و سرود رندی اور عشق بازی میں پناہ لینے کی خواہش نے انہیں زندگی کی تیز روی کا ساتھ نہ لینے دیا۔ لیکن اظہار کی یہ صورتیں جو اس معاشرہ میں جنم پذیر ہوئیں دراصل اس خوف کی نشاندہی کرتی ہیں کہ ان پر رونق اور رنگین محافل کے پس پردہ کچھ کھو دینے کا احساس اور موت کی سفاک حقیقت بھی موجود ہے۔ چنانچہ زندگی کا یہ تضاد اور بے آہنگی اس فضا میں رچ گیا تھا۔ اس لئے اس تضاد اور ناہمواری کی کیفیت کا پردہ چاک کرنے کے لئے ادب کو آلہکار بنایا گیا ادب چونکہ انسانوں کے درمیان جنم لیتا ہے۔ اس کا موضوع انسانوں کے جذبات و احساسات افعال و خیالات اقوال و کردار ہوتے ہیں اس لئے ایک ادیب ایک فنکار کی نظر سب سے پہلے اس افراط و تفریط پر پڑتی ہے اور سچا فنکار وہی ہے جو اپنے ماحول اور معاشرے کا ترجمان اور عکاس ہو وہ معاشرتی برائیوں کو اچھوتے انداز میں پیش کرنے پر قدرت رکھتا ہو۔ اس کے لئے جہاں اندازِ بیان کی دلکشی ضروری ہے۔ وہاں طنز و مزاح کی زیریں لہر تحریر کو سماج کے خون فاسد کو نکال کر معاشرتی اور مجلسی زندگی کو پاک صاف کرنے کے قابل بنا سکے۔ کیونکہ مزاح اور طنز ایک ایسی گدگدی ہے جو لمحہ بھر کے لئے انسان کو ہشاش بشاش بنانے کے علاوہ غفلت میں کھوئے ہوئے ذہنوں کو کچوکے دے کر بیدار بھی کرتی ہے۔ اس طرح طنز و مزاح کے رشتے دانشمندی کے ساتھ اس طرح جڑے ہوئے ہوتے ہیں کہ الگ الگ افعال ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔

iii. اودھ پنچ کا دور

اودھ پنچ کا اجرا ۱۸۷۷ء میں ہوا۔ اودھ پنچ میں بھی کسی خاص واقعے کے متعلق اپنی رائے دینے یا کسی چیز کے مضحک پہلو کو نمایاں کر کے پیش کرنے یا محض حریف کو ذلیل کرنے کے لیے کارٹون کا استعمال کیا گیا ہے اور پھر بعد میں یہی کارٹون اردو صحافت کا لازمہ بن گئے۔ جہاں اس نے مختلف میدانوں میں قابل قدر صحافتی

اور ادبی خدمات انجام دیں اسی طرح اس کا اہم اور نمایاں کارنامہ نو آبادیاتی معاشرے کے خلاف مزاحمتی کردار ہے۔

مزاح کا اصل دور اودھ پنچ کا ہے، اگرچہ اس سے پہلے غالب کے خطوط نثری مزاح کے بہترین نمونے کے طور پر سامنے آ چکے تھے مگر غالب کے ہاں مزاح زیرِ لب مسکراہٹ تھا، اودھ پنچ کے لکھنے والوں نے اس کو بہت آگے بڑھایا، اودھ پنچ ایک مزاحیہ جریدہ تھا جو لکھنؤ سے ۱۶ جنوری ۱۸۷۷ء کو جاری ہوا، ہفت روزہ اس جریدہ کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین تھے جو خود بھی اچھے مزاح نگار تھے۔ اودھ پنچ مشرق و مغرب کے تصادم کا پہلا نمونہ تھا، اس کے صفحات پر موضوعات کی رنگارنگی' الفاظ کی کثرت 'خیالات و جذبات کی بے جا فراوانی کمتر مسکراہٹوں اور بیشتر قہقہوں کی بھرمار تھی، اگرچہ اس سے پہلے بھی مزاح کے جریدے نکل چکے تھے۔ اختر شہنشاہی اس: حوالے سے لکھتے ہیں "اودھ پنچ اردو کا پہلا مزاحیہ جریدہ نہیں تھا، اردو کا پہلا مزاحیہ اخبار مذاق تھا جو رام پور سے ۷ جنوری ۱۸۴۵ء کو جاری کیا گیا۔" (۱۲) منشی سجاد حسین نے ۳۶ برس تک اس اخبار کے ذریعہ سے ادب اور انشا کے پھول کھلائے، دیگر لکھنے والوں میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، پنڈت تربھون ناتھ، نواب سید محمد آزاد، مولوی عبدالغفور شہباز، منشی جوالا پرشاد برق، منشی احمد علی شوق، سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی، مولوی احمد علی کسمنڈوی، وغیرہ شامل ہیں۔ رشید احمد صدیقی اودھ پنچ کی اہمیت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ "غالب کے عہد تک طنز اور ظرافت کا جو سرمایہ اردو میں ملتا ہے، وہ "پنجیانہ" رنگ سے گو بے نیاز نہیں ہے لیکن اس میں شک نہیں اس دور تک پنچ کو صحافتی درجہ نہیں ملا تھا۔ اس بارہ خاص میں اودھ پنچ کو امتیاز تقدم حاصل ہے۔ اودھ پنچ کے بعد ہندوستان کے دیگر حصّوں میں پنچ کی حیثیت سے مختلف جرائد شائع ہوئے اور اب بھی شائع ہو رہے ہیں لیکن خود اودھ پنچ کے رنگ کو اس میں سے ایک بھی نہیں پہنچ سکا" (۱۳) ڈاکٹر خورشید اسلام اودھ پنچ کی ظرافت کے حوالے سے رقمطراز ہیں۔

> بحیثیت مجموعی "اودھ پنچ" کی ظرافت میں گہرائی اور طنز میں گیرائی کی کمی ہے لیکن اس میں زمانے کی پابندیوں اور مجبوریوں کو ذہن سے یکسر محو نہیں کر دینا چاہئے۔ "اودھ پنچ" کی ظرافت ثقیل ہے مگر نمک سے خالی نہیں، کہیں کہیں عریاں ہے مگر پھر بھی ناگوار نہیں ہوتی۔ الفاظ کی بازی گری ہے مگر اس میں فطری روانی بھی ہے۔ اور قہقہوں سے فروغ پاتی ہے مگر بدسلیقہ نہیں" (۱۴)

اودھ پنچ کا نام یہاں پہلی بار استعمال نہیں ہوا بلکہ اس سے پہلے بھی چند ایک اخبارات کے نام کا حصہ رہ چکا تھا۔ ایک بڑا نام جہاں ہے، یہ بیسویں صدی کے آغاز تک مختلف اخباروں کے نام کا حصہ بنا رہا اور اودھ پنچ کی تقلید میں پنچ اخبارات جاری

ہوتے رہے۔ اودھ پنچ ۱۹۱۲ء تک نکلتا رہا، کچھ عرصہ بعد اسے دوبارہ جاری کیا گیا۔ اودھ پنچ کا دور تہذیبوں کے تصادم کا دور تھا، مغرب اور مشرق کی تہذیبیں ٹکرا رہی تھیں، انگریزی تہذیب ہر چیز پر چھاتی جا رہی تھی، مشرقی زوال کی وجہ سے مشرقی تہذیب بھی زوال پذیر دکھائی دے رہی تھی، اودھ پنچ اس صورتحال میں سامنے آیا، اس نے ایک طرف تو مشرق کی خامیوں اور ان کے اسباب کے خلاف بات کی، دوسری جانب مغرب کی بے جا تقلید کے خلاف بھی آواز بلند کی۔ رشید احمد صدیقی کے خیال میں

> "پنچ کا یہ دور بالکل قدرتی تھا، مغربیت کا سیلاب بڑھتا چلا آ رہا تھا، مشرق کو زوال نصیب ہو چکا تھا اس لئے طبائع ہر اس چیز سے بیگانہ یا متنفر تھیں جس میں مشرقی آب و رنگ کی جھلک ہوتی، دوسری طرف ہر اس چیز کو قبول کرنے کے لئے آمادہ تھیں جن میں مغرب کی چاشنی ہوتی، پنچ نے ایک طرف ان حیثیات سے بغاوت کی جو مشرق کے لئے باعث ننگ اور اس کی تباہی کا موجب تھیں، دوسری طرف اس نے اس کورانہ تقلید کے خلاف علم جہاد بلند کیا جس کی بناء پر لوگ دیوانہ وار مغرب کی پذیرائی اور پرستش کر رہے تھے" (۱۵)

مشرق و مغرب کے اس تہذیبی فرق کو نمایاں کرنے کے لئے اودھ پـــــــــــنچ کے لکھاریوں نے ادب کو وسیلہ بنایا جو تضاد اور بے آہنگی اس ماحول میں رچ بس گیا تھا، اس کو محسوس کیا اور اپنی تحریروں میں لائے، اپنے ماحول اور معاشرے کی ترجمانی ایک اچھے ادیب کا خاصہ ہوتی ہے، سچا فنکار وہی ہوتا ہے جو اپنے ماحول اور معاشرے کا ترجمان اور عکاس ہو! اور وہ معاشرتی برائیوں کو اچھوتے انداز میں پیش کرنے پر قدرت رکھتا ہو۔ طنز و مزاح کی لہر تحریر کو سماج کے خون فاسد کو نکال کر معاشرتی اور مجلسی زندگی کو پاک صاف کرنے کے قابل بنا سکے کیونکہ مزاح اور طنز ایک ایسی گدگدی ہے جو لمحہ بھر کے لئے انسان کو ہشاش بشاش بنانے کے علاوہ غفلت میں کھوئے ہوئے ذہنوں کو ہچکولے دے کر بیدار بھی کرتی ہے اس طرح طنز و مزاح کے رشتے دانشمندی کے ساتھ اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ الگ ہونے کے باوجود جدا نہیں ہو پاتے، ایسی ہی کاوش منشی سجاد حسین اور دیگر قلم کاروں نے کی، انہوں نے جس سیاسی فضا میں آنکھ کھولی، وہ ہنگامہ آزادی کے بعد کا دور تھا، منشی سجاد حسین کانگریسی اور جوشیلے کارکن تھے، مرتے دم تک اس سے وابستہ رہے، اس وقت انگریز راج تھا، آزادی کا خواب دیکھنا حماقت کے سوا کچھ نہیں تھا، چند افراد کے سوا سبھی اس آزادی پر شاکر تھے، ایسے میں اودھ پـــــــــــنچ

کا اجراء تازہ ہوا کے جھونکے کی مانند تھا جس کے اہل قلم نے نہایت چابکدستی سے مغربی تہذیب کے بڑھتے ہوئے سیلاب پر بند باندھنے کی کوشش کی۔

منشی سجاد حسین کی علالت کے سبب اودھ پنچ ۱۹۱۲ء میں بند ہو گیا تھا۔ پھر حکیم محمد ممتاز علی عثمانی نے اسے جسٹس کرامت حسین کے مشورے سے ۲۸ اکتوبر ۱۹۱۶ء میں دوبارہ جاری کیا۔ ۱۹۳۳ء میں اس کی اشاعت گھٹ کر صرف ۶۵۰ رہ گئی تھی۔ دور ثانی میں اودھ پنچ کم و بیش انیس سال تک نکلتا رہا۔ حکیم صاحب کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے ظہیر حیدر نے اسے زندہ رکھنے کی کوشش کی لیکن ۱۹۳۴ء میں یہ آخر کار بند ہو گیا۔

.iv اسلوب

اودھ پنچ اخبار کے بانی منشی سجاد حسین نے ۱۸۷۷ میں یہ اخبار نکالا تھا۔ ان کے ساتھ ان کے رفقائے کار جیسے مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، نواب سید محمد آزاد، منشی جولا پرشاد برقؔ، پنڈت تربھون ناتھ۔ جعفرؔ۔ منشی احمد علی، شوقؔ، منشی احمد علی کسمنڈوی، اکبر الہ آبادی وغیرہ نے بھی منشی سجاد حسین کے ہی صحافتی انداز کو اختیار کر کے اپنی تحریروں کے ذریعہ انھیں خطوط پر عمل پیرا تھے۔ جن کے خدوخال منشی صاحب نے وضع کیے تھے۔

اودھ پنچ اگرچہ طنز و مزاح سے بھرپور ظرافت کا ایک پرچہ تھا مگر اپنے عصری سیاسی معرکہ آرائیوں اور سماجی خرابیوں سے بے خبر نہ تھا۔ سیاسی پنجہ آزمائی ہو یا سماجی مسائل کی عقدہ کشائی، حکومت وقت کی بے جا مداخلت ہو یا ادبا یا شعرا کی چشمکیں غرض کہ ہر بات پر بیدار مغزی کے ساتھ اودھ پنچ تبصرہ کرتا اور بے خوف و خطر ہ لکھتا تھا۔

اودھ پنچ اخبار معروضی خبریں نہیں شائع کرتا تھا بلکہ ہر خبر کو تبصرہ کے انداز میں پیش کرتا تھا اور اسلوب میں شوخی شگفتگی اور مزاح کو اولیت دی جاتی تھی۔ شوخی اور مزاح کو دو آتشہ بنانے کے لیے لندن پنچ کے انداز پر کارٹونوں کا سہارا بھی کیا جاتا تھا۔ ان کارٹونوں کی شمولیت سے اس اخبار کی مقبولیت میں اور اضافہ ہوتا گیا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ بسا اوقات مزاح میں بے جا شدت درجہ اعتدال سے گزر کر ابتذال اور پھکڑ پن کی حد تک پہنچ جاتی تھی اور غیر ضروری مضمون کی طوالت اکتاہٹ کا سبب بنتی تھی اسی سے آگے چل کر بعض حلقوں میں اعتراضات بھی ہوئے اور اخبار کی شہرت کو نقصان بھی پہنچا۔

اس نقصان دہ روش کو محسوس کرتے ہوئے منشی سجاد حسین نے ۱۲ اکتوبر ۱۸۷۷ کے شمارہ میں نامہ نگاروں کو ہدایات دی تھیں کہ غیر ضروری بازاری محاورات کا استعمال نہ کریں۔ مضامین میں حتی المقدور تعیم

ہو۔ مضامین میں اخلاقی مواد، روزانہ کی طریق معاشرت، ناقص خیالات کے مضر نتائج پر توجہ ضروری سمجھا جائے اور جو کچھ لکھا جائے وہ پر مغز ہو، مختصر لطائف کا استعمال ہو وغیرہ وغیرہ۔ ان کے اس ہدایت نامہ پر ان کے رفقا نے لبیک کہا اور انھیں خطوط پر اپنی نثر نگاری کی عمارت کھڑی کی۔ طنز و مزاح اور ظرافت کے رنگ و اسلوب سے قطع نظر اودھ پنچ اخبار اور ان کے نامہ نگاروں کی یادگارِ زمانہ خدمت یہ ہے کہ انھوں نے اردو نثر کے مصنوعی جامے کو یعنی تصنع اور بناوٹ کے پیرایہ کو خیرباد کہہ کے اسے ایسا پاکیزہ لباس عطا کیا جس میں قدرتی لطافت کا رنگ بھی تھا اور مقامی جذبات کا آہنگ بھی۔

اودھ پنچ کے نامہ نگاروں نے لکھنو کی ٹکسالی زبان، محاوروں، روزمروں، ضرب الامثال اور کہاوتوں کو اپنے مضامین میں جگہ دے کر انھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ خاص کر لکھنو کے قرب و جوار کی قصباتی زبان و محاورات کو اپنی نگارشات میں جگہ دے کر انھیں بقائے دوام عطا کیا اور زبان و محاورات کو بڑی وسعت بخشی۔

اودھ پنچ کے نامہ نگاروں کی نگارشات سے جس میں لکھنو کی عصبیت بھی کارفرما تھی۔ اردو زبان و ادب کو بہت فائدہ پہنچایا خاص کر جو ادبی معرکے لکھنو میں ہوئے جن میں سرشار کے فسانہ آزاد کی زبان و محاوروں کے تعلق سے جو کچھ اودھ پنچ میں چھپا اس سے لکھنو کی زبان میں اور نکھار آیا اور محاورات کی تحقیق و توضیح میں جدت پیدا ہوئی۔ اسی طرح مولانا حالی کی مقدمہ شعر و شاعری ارباب کے شعری نظریات کے خلاف اودھ پنچ نے جس طرح محاذ آرائی کی اور حالی پر تنقید کی اس سے بھی لکھنو کی زبان و ادب کو فائدہ پہنچا۔ اصلاح بھی ہوئی اور غور و فکر کے نئے گوشے بھی سامنے آئے۔

V. نثر نگار

اودھ پنچ کے نامہ نگاروں نے نظم و نثر دونوں میں اپنے مخصوص طنزیہ ق مزاحیہ اسلوب سے گل و بوٹے کھلائے ہیں ان میں سے کچھ خاص نثر نگار ہیں کچھ خاص شاعر ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو نثر و نظم دونوں میں اپنی شناخت بنائے ہوئے ہیں اس کے نثری سرمایہ میں مضامین، ناول، ڈرامہ، خاکے اور لطیفے ملتے ہیں جن نثر نگاروں نے اودھ پنچ میں اپنی تخلیقات پیش کی ہیں ان میں منشی سجاد حسین، نواب سید محمد آزاد اور مچھو ستم ظریف کے علاوہ تربھون ناتھ، محفوظ علی بدایونی، چودھری محمد علی ممتاز حسین عثمانی سرفہرست ہیں ان سبھی نے اپنی طنزیہ و مزاحیہ نگارشات کے ذریعے اودھ پنچ میں نایاب اضافے کئے۔

جنوری ۱۸۷۷ء سے دسمبر ۱۹۱۲ء تک تقریباً چھتیس سال تک اودھ پنچ شائع ہوا، اٹھارہ سو کے لگ بھگ شمارے نکلے، اس دوران بہت سے لوگوں نے اودھ پنچ میں لکھا، کچھ مصنفین مسلسل لکھتے رہے، کچھ وقتی طور پر۔ اودھ پنچ کے نامور لکھنے

والوں کے علاوہ بھی اس کے صفحات میں ایسے بے شمار لوگوں کی فکری کاوشیں بکھری پڑی ہیں جو آج اتنے معروف نہیں ہیں مگر اس زمانے میں انہوں نے خوب لکھا۔ ڈاکٹر رؤف پاریکھ اس کی وجہ ایسے بیان کرتے ہیں۔

> "اودھ پنچ کے لکھنے والوں کی گمنامی میں کچھ تو مرور ایام اور قسمت کو دخل ہے اور کچھ خود ان کی اس بے نیازی اور پردہ داری کو جس کے تحت انہوں نے فرضی اور قلمی ناموں سے لکھا، کچھ نے تو کوئی نام اور مخفف رکھے تھے۔۔۔ اودھ پنچ کے اجراء کو لگ بھگ سوا صدی کا عرصہ بیت چکا ہے اور اس کے پہلے دور کے آخری شمارے کو منظر عام پر آئے بھی پون صدی گزر چکی ہے، ان ناموں اور شخصیات پر سے پردہ اٹھانا قریب قریب ناممکن ہو چکا ہے"(۱۶)

اودھ پنچ کے دیگر لکھنے والوں کے نام درج ذیل ہیں جو اپنے ناموں کو مختلف طرح سے بیان کر کے لکھتے رہے۔ بمطابق ڈاکٹر اشفاق احمد

> سید ممتاز حسین، سید عبدالغفور شہباز، احمد علی کسمنڈوی، الانسان ضاحک، سید اصغر علی، نعمت خاں عالی، شوخ ظریف شیدا اور سید فضل ستار نقوی وغیرہ کے نام ملتے ہیں، علاوہ ازیں بے شمار ایسے نام ہے جو فرضی علامتی یا مخفف وغیرہ کے طور پر استعمال ہوتے تھے ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جن سے متعلقہ اصل شخصیت تلاش کرنا بے کار محال ہے، یہ نام اس طرح کے ہوتے تھے، ایم ایم، مسٹر آر، ہندی، ناظر فدار، متفکر، فیثا غورث، دماغ فتح پوری، بہانہ بسیار، باڈی گارڈ، روشن خیال، مسلمان، م ح از بنارس، راز گڈھوال، ح ج ن، ح ب فروغ اور ش چ لاہوری وغیرہ۔"(۱۷)

منشی سجاد حسین

منشی سجاد حسین ایڈیٹر "اودھ پنچ" جو کہ "اودھ پنچ" کے روح رواں تھے ۱۸۵۶ء میں کاکوری میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۷۳ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ کسب معاش کا آغاز فیض آباد میں فوج کو اردو پڑھانے سے کیا۔ مگر کچھ ہی عرصہ بعد اس کام کو خیر باد کہہ کر لکھنؤ سے ۱۸۷۷ء میں "اودھ پنچ" نکالا اور پھر بقیہ عمر اسی کی مصیبت میں گزار دی۔

منشی سجاد حسین سرسید احمد خان اور ان کی تحریک علی گڑھ کے روز اول ہی سے سخت مخالف تھے۔ کانگرس کے قیام کے دو برس بعد ۱۸۸۷ء میں کانگرس کے رکن بنے اور آخر عمر تک اسی کے حامی رہے۔ منشی سجاد حسین مغربی تہذیب اور معاشرے میں اس کے بڑھتے ہوئے اثرات کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ گویا معاشرتی اعتبار سے وہ قدامت

پرستی کے زیادہ قریب تھے۔ ۱۹۰۱ء میں ان پر پہلی مرتبہ فالج کا حملہ ہوا۔ لیکن کچھ عرصہ صاحب فراش رہ کر تندرست ہو گئے۔ مگر ۱۹۰۴ء میں جب یہ دوسری بار فالج کا شکار ہوئے تو اس موذی مرض نے ان کے بولنے کی صلاحیت قریب قریب سلب کر لی۔ اگرچہ دماغ تندرست تھا اور تھوڑا بہت چل پھر بھی لیتے تھے۔ لیکن بولنے میں خاصی دقت پیش آتی تھی۔ بالآخر ۲۲ جنوری ۱۹۱۵ء کو انتقال کر گئے۔ منشی سجاد حسین فطرتاً نڈر اور بیباک تھے۔ ان کی اس بیباکی کی جھلک "اودھ پنچ" کی پالیسی میں بھی نظر آتی ہے طنز و ظرافت ان کا اسلوب نگارش ٹھہرا تھا "موافقت زمانہ" اپنے عہد کا بہترین سیاسی طنز تھا۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام منشی سجاد حسین کی طنز نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "منشی حسین کا سیاسی طنز دلچسپ ہے مگر سطحی ہے۔ وہ محاورات سے ظرافت پیدا کرتے ہیں۔ واقعہ اور خیال سے کم مگر کہیں کہیں ان کی طبعی خوش دلی طنز میں وہ شادابی اور جدت پیدا کر دیتی ہے کہ دھوپ میں بوندیں پڑنے کا سماں دکھائی دیتا ہے"۔(۱۸)

ان کا انداز تحریر دلچسپ اور گہرا ظریفانہ رنگ لیے ہوتا۔ اگرچہ سرشار کی طرح منشی حسین محض ظرافت ہی سے کام نہ لیتے تھے بلکہ طنزیہ انداز ان کا محبوب اسلوب تھا اور ظرافت محض طنز کی شدت کو کم کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ان کا طنز براہ راست بھی نہ ہوتا تھا بلکہ تشبیہوں اور استعاروں کی اوٹ میں لفظوں کے الٹ پھیر سے ظاہر ہوتا تھا وہ بے مقصد طنز کے قائل نہ تھے بلکہ پس پردہ اصلاح کا پہلو ضرور ہوتا تھا۔ ممتاز حسین جونپوری منشی سجاد حسین کے بارے لکھتے ہیں: "منشی سجاد حسین کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک ایسی ادبی اقلیم میں ظرافت کا اعلیٰ معیار قائم کیا۔ جہاں چرکیں اور جان صاحب کا سکہ رائج تھا۔ منشی سجاد حسین نے مذاق اور ظرافت میں سنجیدگی اور توازن پیدا کیا اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ ملک کے گوشے گوشے سے چوٹی کے مزاح نگار شاعروں اور ادیبوں کو ڈھونڈ کر انہیں دنیا سے روشناس کرایا۔ اودھ پنچ کے سماجی، سیاسی، اقتصادی، علمی اور ادبی مضامین نے دیکھتے دیکھتے معاشرے میں انقلاب برپا کر دیا اور ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہلچل سی مچ گئی"۔(۱۹) ممتاز حسین جونپوری منشی سجاد حسین کا حلیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "منشی سجاد حسین کا جسم دوہرا، قد میانہ، رنگ گندمی اور چہرہ گول تھا۔ چہرے پر مونچھیں اور بڑی بڑی داڑھی بھی موجود تھی۔ ان کے یہاں اکثر بے تکلف دوستوں کا جمگھٹا رہتا تھا منشی سجاد حسین کا مزاج حالی کی نثر سے بھی زیادہ سادہ تھا۔ عام طور پر شیروانی اور پرانے زمانے کی فیلٹ پہنتے تھے پاجامہ کبھی چھوٹے پائنچوں کا ہوتا تھا کبھی بڑے کا۔ چہرے سے شگفتگی برستی تھی۔ لہجے میں نرمی اور مٹھاس تھی۔ بات چیت کے کھرے تھے اور اپنی گوناگوں خوبیوں کے باعث ہر فرقے اور طبقے میں یکساں مقبول تھے۔۔۔ منشی سجاد حسین بڑے نڈر، مستقل مزاج اور قانع انسان تھے۔ روپے

پیسے کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتے تھے جو کچھ لکھتے' دلیری اور سچائی سے لکھتے۔"(۲۰) منشی سجاد حسین کی مطبوعہ تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔میٹھی چھری ۲۔احمق الدین ۳۔کایا پلٹ ۴۔ پیاری دنیا ۵ ۔ حاجی بغلول
۶۔طراحدارلونڈی ۷۔دھوکا یا طلسمی فانوس

رتن ناتھ سرشار

رتن ناتھ سرشار محمد علی شاہ کے آخری دور ۱۸۴۶ء یا ۱۸۴۷ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد پنڈت بیج ناتھ' سرشار کی اوائل عمر میں ہی انتقال کر گئے تھے۔ سرشار نے اپنے بچپن میں عربی و فارسی کی تعلیم قدیم دستور کے مطابق حاصل کی۔ اگرچہ انگریزی تعلیم کے حصول کے لئے کینگ کالج لکھنؤ میں داخلہ لیا مگر باقاعدہ کوئی ڈگری حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ سن بلوغت کو پہنچنے کے بعد انہوں نے مدرسی کو ذریعہ معاش بنایا اور کچہری ضلع سکول میں پڑھانے لگے اور ساتھ ساتھ لکھنے کا شغل بھی جاری رکھا۔ مراسلہ کشمیر، اودھ پنچ، میراۃ الہند اور ریاض الاخبار وغیرہ میں لکھنا شروع کیا۔ سرشار میں فطری طور پر شوخی اور بے تکلفی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور یہی چیز بالآخر ان کی تحریر کا غالب رنگ بنی۔

سرشار نے اگرچہ اودھ پنچ کے نامہ نگار کے حیثیت سے لکھنے کا آغاز کیا۔ لیکن اودھ اخبار کی ایڈیٹری (۱۸۷۸ء) مل جانے کے بعد انہیں اودھ پنچ سے الگ ہونا پڑا۔ یہ الگ بات کہ کچھ عرصہ تک "اودھ پنچ" سے وابستہ رہنے کے وجہ سے سرشار کا نام اودھ پنچ نامہ نگاروں میں بھی شمار کیا جاتا ہے۔ ان کے زیادہ تر مضامین میں اودھ پنچ ہی میں شائع ہوئے تھے۔ یہ مضامین زبان و بیان کی خوبیوں ظریفانہ انداز نگارش معاشرتی اصلاح اور مقصدیت کی وجہ سے بہت پسند کیے جاتے تھے۔

سرشار کی تحریر کی نمایاں خصوصیات میں نوابی لکھنؤ اور اس سوسائٹی کی تصویر کشی ہے۔ سرشار اگرچہ طنز کے میدان میں زیادہ کامیاب نہیں گردانے جاتے۔ لیکن جب وہ لکھنؤ کی زوال پذیر تہذیب کا ذکر کرتے ہیں تو معنی خیز طنز ظرافت کے لبادے میں بھی جھانکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جہاں کہیں خالص طنز سے کام لیتے ہیں وہاں آمد سے زیادہ آورد کا گمان ہوتا ہے جب کی ظرافت بالکل فطری انداز میں ان کی تحریر کی زینت بنتی ہے مصباح الحسن قیصر سرشار کے رنگ ظرافت کے بارے میں رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وہ زندگی کو زندہ دلی سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ عادت واطوار' رفتار وگفتار ہر لحاظ سے ایک کامیاب ظریف ہیں اور ظرافت میں ہی اپنا پورا زور قلم صرف کرتے ہیں۔ وہ عالم سر شاری میں لکھتے جاتے ہیں۔ دماغ ظرافت کے نت نئے حربے تلاش کرتا رہتا ہے اور قلم ان شوخیوں کو صفحہ قرطاس پر بکھیرتا جاتا ہے۔ وہ کہیں الفاظ کی تکرار' ان کے الٹ پلٹ اور غلط تلفظ سے ظرافت پیدا کرتے ہیں تو حاضر جوابی' ضلع جگت اور بے موقع و بے محل شعر اشعار اور لطائف و ظرائف سے یہ کام نکالتے ہیں کبھی کردار میں ناہمواری اور ناموزونیت پیدا کر کے اسے مزاحیہ کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ غرض وہ متعدد طریقوں سے ظرافت پیدا کرنے میں کامیاب ہیں" (۲۱)

ان کی تصانیف میں فسانہ آزاد، سیر کہسار، جام سر شار ، کال اور خدائی فوجدار بہت مشہور ہیں۔ خدائی فوجدار ایک انگریزی ناول ڈان کوئکزاٹ کا اردو ترجمہ ہے۔ ۱۸۹۳ء میں سرشار نے ایک سلسلہ خمکدہ سرشار' شروع کیا تھا اور اسی زمانے میں ان کے ناول بچھڑی دلہن، طوفان بے تمیزی ، بی کہاں اور ہتو بھی شائع ہوئے۔

اکبر الہ آبادی

سید اکبر حسین رضوی اکتوبر ۱۸۴۵ء کو ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے ان کے والد سید تفضل حسین ایک دیندار اور متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اکبر نے ابتدائی تعلیم مروجہ مدرسوں اور سکولوں سے حاصل کی۔ ۱۸۸۶ء میں ۴۰ برس کی عمر میں مختاری کا امتحان پاس کر کے نائب تحصیلدار مقرر ہوئے۔ ۱۸۷۰ء میں ہائی کورٹ کی مسل خوانی کی جگہ ملی۔ ۱۸۷۳ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۸۰ء میں وکالت کی' پھر سرکاری ملازمت شروع کی اور منصف مقرر ہوگئے۔ ۱۸۸۸ء میں سباردونٹ جج اور ۱۸۹۴ء میں عدالت خفیفہ کے جج مقرر ہوئے۔ اس کے بعد خان بہادر کا خطاب حاصل کیا اور پھر ملازمت سے کنارہ کش ہوگئے۔ ستمبر ۱۹۲۱ء میں انتقال فرماگئے۔

اکبر بے حد ذہین انسان تھے۔ ظرافت اور بذلہ سنجی کا عنصر بھی ان کی فطرت میں شامل تھا۔ اکبر بچپن ہی سے شعر و شاعری کی طرف راغب ہوگئے تھے اکبر کی ابتدائی شاعری رسمی انداز کی اور سنجیدہ تھی لیکن "اودھ پنچ" سے وابستہ ہو جانے کے

بعد ان کی شاعری کا رخ ہی بدل گیا اور انہوں نے قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اکبر کہاں تک قوم کی اصلاح کر پائے یہ ایک الگ بحث ہے۔ اس اصلاح کے لیے انھوں نے شاعری کا جو اسلوب اختیار کیا وہ طنز و مزاح کا تھا۔ اسی اعتبار سے دیکھا جائے تو اکبر الہ آبادی اردو کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے طنز و مزاح کو باقاعدہ کسی مقصد کے لیے استعمال کیا اکبر کس طرح طنز و مزاح کی طرف مائل ہوئے اس سلسلے میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں: "اکبر نے بہت چھوٹی عمر ہی سے سرکاری ملازمتیں شروع کر دی تھیں۔ "اودھ پنچ" کے اجراء کے تین برس بعد یعنی ۱۸۸۰ء میں ان کی جوڈیشل سروس شروع ہو گئی تھی اس لیے وہ انگریزوں کے خلاف براہ راست کچھ کہنے کے قابل نہ تھے۔ ویسے بھی ۱۸۷۷ء تو بہت دور کی بات ہے بیسویں صدی کے آغاز کے لگ بھگ بھی انگریزوں کی مخالفت نہیں کی جاتی تھی۔ ان سے محض مراعات مانگی جاتی تھیں۔ اکبر دل سے انگریزوں کے خلاف تھے۔ ان کی حاکمیت کے دشمن تھے۔ مگر ایک تو انگریز کی دہشت ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد ہر دل پر بیٹھ گئی تھی۔ اس پر ان کی سرکاری ملازمت' چنانچہ "اودھ پنچ" کے اجراء سے اکبر کو خیال ہوا کہ "سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے" کے انداز میں لوگوں تک مخالفانہ خیالات بھی پہنچائے جاسکتے ہیں اور گرفت سے بھی بچا جاسکتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اس زمانے میں مزاحیہ شاعری کی طرف مائل ہوئے ورنہ ۱۸۷۷ء سے قبل ان کی شاعری طنز و مزاح سے دور تھی" (۲۲) موضوعاتی اعتبار سے اکبر نے اپنی شاعری میں جس چیز کو سب سے زیادہ ہدف تنقید بنایا ہے وہ مغربیت ہے۔ اکبر مشرق کے دلدادہ تھے اور مغربیت سے متنفر اس میں وہ اس حد تک بڑھے ہوئے تھے کہ بعض اوقات حد اعتدال سے بھی گزر جاتے۔ "اودھ پنچ" نے سرسید اور علی گڑھ تحریک کے خلاف جو معرکے برپا کیے اکبر ان میں پیش پیش تھے۔

اکبر کے کلام میں طنز و ظرافت دونوں ہی پائی جاتی ہیں۔ کبھی وہ خالص طنز سے کام لیتے ہیں اور کبھی محض ظرافت سے اور اکثر ان کے امتزاج سے خوبصورت شعر تخلیق کرتے ہیں۔ اکبر نے طنز و مزاح کو ہر حربے اور ہر زاویے سے برتا ہے اسی لیے ان کے ہاں اتنی متنوع ظرافت پائی جاتی ہے اس پر مستزاد ان کی قادرالکلامی۔۔۔ان سب چیزوں نے مل کر اکبر کو نہ صرف اپنے عہد بلکہ اپنے عہد کے بعد بھی ایک زندہ و جاوید شاعر بنا دیا۔ اکبر الہ آبادی "اودھ پنچ" کے ابتدائی دور ہی سے اس سے منسلک ہو گئے تھے اس کا منظوم "نامہ بنام اودھ پنچ" "اودھ پنچ" کے جاری ہونے کے دوسرے ہی سال شائع ہوا تھا۔

"اودھ پنچ" سے اکبر الہ آبادی کی ایک اور حیثیت بھی سامنے آتی ہے اور وہ ہے نثر نگار کی حیثیت۔۔۔نثر میں بھی اکبر نے طنز و مزاح کا اسلوب اپنایا ہے۔ وہ الف ح۔ الہ آبادی کے نام سے نثری مضامین لکھتے تھے "کوئی کہتا ہے دیوانہ 'کوئی کہتا

ہے سودائی"۔۔۔"سسرال کی گالی کا برا ماننے ہو بھڑوا"۔۔۔ایک نادان خوش اعتقاد کی دعا" اور "لطیفہ عبرت و انگیز وحکمت آمیز" وغیرہ۔۔۔ان کے دلچسپ مضامین میں شمار ہوتے ہیں اگر چہ شاعری کی طرح اکبر نثر میں تو کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام نہ دے سکے۔ لیکن دلچسپ زبان اور ظرافت کا چٹخارہ ان کی نثر میں بھی موجود ہے۔ ان کی نثر نگاری کے بارے میں خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں:

> "اب تک ان کی نثر پر جتنا مواد ہاتھ آیا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ "اودھ پنچ" کے اجراء سے قبل انہوں نے نثر نہیں لکھی۔ انہیں نثر نگاری کا شوق "اودھ پنچ" کے اجراء سے ہوا۔۔۔ اکبر اس کے اجراء کے ساتھ ہی اس میں مضامین اور متفرق تحریریں چھپوانے لگے تھے۔ شروع کے چند برسوں میں انہوں نے بہت سے مضامین لکھے مگر جب ۱۸۸۰ء میں وہ سرکاری ملازمت میں آگئے تو مضامین کم تعداد میں لکھنے لگے۔ مگر اس کے باوجود "اودھ پنچ" کے دور اول کے آخر تک ان کے مضامین چھپتے رہے۔ مجھے "اودھ پنچ" کی فائلوں علی گڑھ میگزین کے اکبر نمبر اور انتخاب "اودھ پنچ" مرتبہ رضی کاظمی سے اکبر کے تقریباً چالیس مضامین حاصل ہوئے ہیں"۔(۲۳)

نواب سید محمد آزاد

نواب سید محمد آزاد ۱۸۴۶ میں ڈھاکہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق مشرقی بنگال کے ایک معزز خاندان سے تھا۔ ابتدائی تعلیم بھی اپنے آبائی شہر ہی میں آغا اصفہانی سے لی۔ آغا اصفہانی فارسی اور اردو کے جید اساتذہ میں سے تھے۔ انگریزی زبان اپنی ذاتی کاوشوں سے سیکھی، مگر پھر بھی اس میں مہارت حاصل کر لی۔

سرکار انگریزی کی ملازمت، عہدہ سب رجسٹراری سے شروع کی۔ لیکن رفتہ رفتہ مختلف مدارج طے کرتے ہوئے کلکتہ کے پریسیڈنسی مجسٹریٹ اور آخر انسپکٹر جنرل آف رجسٹریشن ہوئے۔ دو دفعہ بنگال کے ممبر منجانب گورنمنٹ نامزد ہوئے اور آئی ایس او (امپیریل سروس آرڈر) کا خطاب پایا۔ ۱۹۱۲ میں اپنے سرکاری فرائض سے سبکدوش ہو کر پنشن لی۔

نواب سید محمد آزاد "اودھ پنچ" کے نامور لکھنے والوں میں شمار ہوتے تھے منشی سجاد حسین اور سرشار کے بعد آزاد ہی ہیں۔ جنہیں صاحب اسلوب کہا جا سکتا ہے اگر چہ انہوں نے بھی "اودھ پنچ" کی مخصوص پالیسی کے تحت قلم اٹھایا مگر پھر بھی وہ اپنی انفرادیت قائم رکھنے میں کامیاب رہے۔ آزاد نے ایک فارسی اخبار "دوربین" مسلم لٹریری سوسائٹی کا پرچہ

تھا۔ اس کے بعد ۱۸۷۴ تک "اودھ اخبار" میں لکھتے رہے "اکمل اخبار" "دہلی" "آگرہ اخبار"، سفیر لدھیانہ"، "اخبار الاخبار"، وغیرہ میں بھی ان کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ لیکن ان کی اصل وجہ شہرت "اودھ پنچ" ہی ثابت ہوا اور اسی سے ان کی اصل پہچان بنی۔

آزاد کی تحریروں میں ہمیں بھرپور طنز ملتا ہے۔ یہ طنز مغربی تہذیب کے ساتھ ساتھ مشرقی تہذیب کے تیزی سے پلٹا کھانے اور نتیجے کے طور پر پیدا ہونے والی برائیوں پر ہے۔ اس سلسلے میں ان کے وہ فرضی خطوط جو اُنہوں نے انگلستان سے لکھے تھے اور اودھ پنچ میں پرانی روشنی کا نام و پیام کے عنوان سے شائع ہوتے رہے۔ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ نظریاتی طور پر وہ مغرب کے خلاف تھے۔ لہٰذا انہوں نے نہایت لطیف و دلچسپ لیکن تیکھے اور طنزیہ انداز میں مقلدین مغرب کو ہدف تنقید بنایا۔ اُنہوں نے مخالفت کا اظہار براہِ راست نہیں کیا بلکہ یورپ کی تہذیبی قدروں کی وکالت کچھ اس انداز سے کی ہے کہ پڑھنے والوں کو بجائے رغبت کے نفرت ہو جائے۔ اپنے اس حربے میں وہ کامیاب بھی رہے ہیں۔ رشید احمد صدیقی ان کی مزاح نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں: "مغرب اور مغربیت کے خلاف نواب آزاد نے جس معقول اور نشین پیرایہ میں طنز کی ہے۔ اس کا جواب بہ حیثیت مجموعی اُردو ادب میں ملنا دشوار ہے۔ آزاد کی طنز و ظرافت میں جو چیز نہایت نمایاں اور بامزہ ہے وہ ان کی خلقی شگفتگی ہے کینہ پروری اور زہرناکی کا عنصر کہیں نمایاں نہیں۔ اس اعتبار سے اُن کو اُردو ادب کا ہوریس اور کاچاسر کہنا ناموزوں نہ ہوگا۔ آزاد نے ہندوستان کے سیاسی اور معاشرتی رجحانات پر نہایت جامع طریق سے اظہار خیال کیا ہے۔ ان کی طنز و ظرافت اتنی صحیح اور جامع ادب و انشاء کے صحیح معیار کی اس درجہ کی حامل ہے کہ ان کے بقائے دوام پر دورائیں ہونا تقریباً ناممکن ہے۔"(۲۴) آزاد کا اودھ پنچ میں قسط وار شائع ہونے والا ناول نوابی دربار بھی طنز و مزاح کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس میں اُنہوں نے نام نہاد اور کاہل نوابوں کا خوبصورتی سے خاکہ اڑایا اور مسٹر جیمس کو مغرب کا نمائندہ کردار بنا کر تضحیک کا نشانہ بنایا ہے۔ طنز و مزاح کے حوالے سے آزاد کی وہ ڈکشنری بھی خاصی شہرت کی حامل ہے جس میں آزاد نے اپنے مخصوص اسلوب میں اپنے عہد کے ملکی و معاشرتی، سماجی و تہذیبی حالات و واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔ الفاظ کے معانی بیان کرتے ہوئے آزاد نے ملک کی سیاست و معاشرت پر بھرپور انداز میں تنقید کی ہے۔ اگرچہ جدید زمانے کی یہ نئی ڈکشنری ڈاکٹر جانسن اور عبید زاکانی کا تتبع ہے لیکن اُردو ادب میں یہ ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ رشید احمد صدیقی اس ڈکشنری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> حقیقت یہ ہے کہ یہ ڈکشنری بجائے خود اس عہد کی صحیح اور سچی تصویر ہے اور اسی عہد کی نہیں بلکہ چونکہ یہ حقیقت اور انسانی فطرت اور معاشرت پر مشتمل ہے اس لئے آئندہ

ایک نامعلوم مدت تک اس کی کار فرمائی رہے گی۔(۲۵)

چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:اولڈ پاپا۔اثبات حلال زادگی کے واسطے بے نظیر دلیل۔ بے ضرورت دنیا میں رہنے اور دنیاوی امور میں دخل دینے کو ہر وقت تیار آزادی نسواں کے لئے برق آفت۔انیسویں صدی میں مسلمانوں کی سب سے بڑی شامت۔ پارلیمنٹ:وہ پالی جہاں کا اصیل اور ٹینی دونوں لڑے۔تمدن کے دنگل میں حکمت عملی کے مطابق وزراء کے چت پٹے ہو جانے کا سہارا۔ گیدڑ بھبھکی، ہوائی بندوق کی آواز، کمزور کو دبانا،زبردست سے لڑنا۔ ممبران پارلیمنٹ کا آپس میں رازونیاز کسی کے جلے ہوئے گھر سے ناپنا۔

مرزا مچھو بیگ ستم ظریف

نام مرزا محمد مرتضیٰ عاشق تخلص، عرف مچھو بیگ ستم ظریف کے قلمی نام سے اودھ پنچ میں لکھتے تھے۔ان کے والد مرزا اصغر علی بیگ لکھنؤ کے شرفا میں شمار ہوتے تھے۔ان کے مورث اعلیٰ اٹک سے آکر لکھنؤ میں آباد ہوئے تھے۔ بچپن میں ورزش سے خاصا تکلف رہا۔ کیونکہ پیشہ آبا، سپہ گری تھا اور زندگی کا ابتدائی بیس بائیس سالہ عرصہ اسی غیر ادبی کام میں گزار دیا۔ لیکن چونکہ قدرت کی طرف سے شاعرانہ دل ودماغ ودیعت ہوا تھا اس لئے ۱۸۵۷ء کے بعد با قاعدہ طور پر شعر و سخن کی طرف متوجہ ہو گئے۔اسی زمانے میں مرزا نسیم دہلوی لکھنؤ آئے تو اُن کی صحبت اور شاگردی نے ستم ظریف کی شاعرانہ صلاحیتوں کو اور چمکا دیا یہ قدرت کی ستم ظریفی ہی ہے کہ بہترین شاعرانہ صلاحیتیں رکھنے کے باوجود ان کی وجہ شہرت شاعری کی بجائے نثر نگاری بنی۔اودھ پنچ کی ابتداء سے اپنی آخیر عمر تک کم و بیش ۳۳ برس اُن کے دلچسپ اور ظریفانہ مضامین اودھ پنچ کی زینت بنتے رہے۔ اپنی زندگی ہی میں ستم ظریف اپنے دور کے اساتذہ سخن میں شمار ہونے لگے اور اُن کے نثری مضامین ادبی اور تنقیدی حیثیت سے بے مثل قرار پائے۔ ستم ظریف کا مزاح خالصتاً پنچی رنگ کا حامل ہے۔ ظرافت اور بذلہ سنجی جیسی ان کی فطرت میں تھی۔ تحریر میں بھی سانگی طنز سے زیادہ مزاح وظرافت سے کام لیتے تھے اس لئے ان کی تحریر میں ایک طرح کی ٹھہری اور سنبھلی ہوئی کیفیت پائی جاتی ہے گھریلو زندگی، سماجی معاملات اور کبھی کبھار سیاست اُن کا ہدف بنتے تھے۔ اُن کی نظم ونثر کی مطبوعہ تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:"گلزار نجات میلاد شریف (منظوم) آفتاب قیادت۔(لیکچر کے انداز میں ایک ظریفانہ نظم) جو الہ آباد میں پڑھی گئی تھی۔ بہار ہند (اُردو محاورات کی ایک ناتمام لغت) مثنوی نیرنگ خیال بعض مضامین جو اودھ پنچ میں نکل چکے تھے اور چشم بصیرت کے نام سے علیحدہ شائع ہوئے۔"(۲۶) مضامین چکبست میں موصوف کا جو حلیہ درج ہے وہ درجہ ذیل ہے:

"دراز قامت، فربہ اندام صحیح وشدید القوی جسم و قوت کے اعتبار سے شاعروں میں ناسخ

ثانی کے نام کے مستحق ہے۔ رنگ البتہ ناسخ کے خلاف کھلتا ہوا گندمی تھا، پلی ٹوپی، انگرکھا گھٹنا لکھنؤ کی معمولی وضع آپ کو بھی مرغوب تھی لیکن آخر عمر میں بھی کبھی کبھی کوٹ پتلون بھی پہن لیتے تھے۔ لطیف و ظریف، خوش بیان و خوش گفتار اپنے چھوٹوں سے بھی ظرافت کو دریغ نہ کرتے تھے۔"(۲۷)

پنڈت تربھون ناتھ ہجر

پنڈت تربھون ناتھ سپرو پنڈت بشمبر ناتھ سپرو کے بیٹے تھے۔ ۱۸۵۳ء میں تحصیل چینا میں پیدا ہوئے۔ لیکن زندگی کا زیادہ حصہ فیض آباد میں گزرا۔ کچھ عرصہ گونڈہ میں بھی سکونت اختیار کی مگر دوبارہ فیض آباد آگئے عام دستور کے مطابق علوم مشرقیہ کی تعلیم مکتب میں حاصل کی۔ انگریزی تعلیم کے حصول کے لئے کینگ کالج لکھنؤ سے بھی منسلک رہے لیکن ایف اے کی ڈگری حاصل نہ کر پائے۔ اس کے بعد سلسلہ معاش کے لئے مختلف جگہوں پر گھومتے رہے۔ آخر کار اخبار نویسی کا مشغلہ اختیار کیا۔ کچھ عرصہ لکھنؤ میں وکالت بھی کی۔ صرف ۳۹ برس کی عمر میں مارچ ۱۸۹۳ء میں انتقال فرما گئے۔

ہجر منشی سجاد حسین کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔ منشی حسین اُن کے بارے میں کہتے تھے کہ اودھ پنچ کے سب سے پہلے خریدار اور قدر دان ہجر ی تھے ہجر نے نظم و نثر دونوں میں اپنی مہارت کا ثبوت دیا۔ اودھ پنچ میں شائع ہونے والے ان کے مزاحیہ نثری مضامین قارئین میں بے حد مقبول تھے۔ کافی عرصہ تک ان کے ایک یا دو مضامین باقاعدہ اودھ پنچ کی ہر اشاعت میں شامل ہوتے تھے۔ اُن کی فطری شوخی ظرافت، مخصوص ظریفانہ مزاج اور بذلہ سنجی اُن کی تحریر کا بھی حصہ بن گئی۔ وہ عوام و خواص ہر وہ قسم کے لوگوں کی بے اعتدالیوں اور خامیوں کو نشانہ تمسخر بناتے تھے۔ اپنی نثری تحریروں میں ہجر فسانہ آزاد کے قریب نظر آتے ہیں۔ لہٰذا ان کے ہاں افیون، چانڈو، بھنگ اور اسی نوع کی دوسری چیزوں کو خاصا آڑے ہاتھوں لیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے مضامین نشہ کی ترنگ اور دو دو چونچیں پیش کیا جاسکتا ہے۔

اودھ پنچ کے ساتھ ساتھ ہجر کے سنجیدہ اور معلوماتی مضامین بھی مختلف ہمعصر مثلاً مراسلہ کشمیر مراۃ الہند اور وکیل ہند وغیرہ میں شائع ہوتے رہتے تھے لیکن ان کی اصل وجہ شہرت اُن کے سنجیدہ مضامین نہیں بلکہ اودھ پنچ کی مزاحیہ نگاری کے ساتھ ساتھ ہجرہ اردو اور فارسی میں مشق سخن بھی کرتے تھے ابتداء میں اُنہوں نے سنجیدہ غزلیں بھی کہیں۔ لیکن اودھ پنچ سے وابستگی کے بعد اُنہوں نے طنز و مزاح سے بھرپور غزلیں کہیں۔ شاعری میں اُن کے مزاج کا اصل رنگ ان تحریفوں میں کھلتا ہے جو مغربی پیروڈی کی طرز پر لکھی گئیں۔ رتن ناتھ سرشاد اور اکبر لالہ کے کلام نظم و نثر

میں سے کچھ بھی کتابی شکل میں شائع نہ ہو سکا۔ بس جو کچھ ہے وہ اودھ پنچ کے صفحات ہی میں بکھرا پڑا ہے۔ ہجر انگریزی زبان کے لطائف وظرائف کو بھی اودھ پنچ کے لئے ترجمہ کرتے تھے۔

جوالا پرشاد برق

منشی جوالا پرشاد برق ۱۳۱ اکتوبر ۱۸۲۳ء کو بمقام سیتا پور میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم کا زمانہ وہیں بسر ہوا۔ ۱۸۷۸ء میں انٹرنس کا امتحان ضلع کھیری سے درجہ اول میں پاس کیا۔ پھر کینگ کالج لکھنؤ سے انگریزی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۸۸۳ء میں وکالت کی ڈگری حاصل کی۔ منشی کالی پرشاد کے ساتھ کچھ عرصہ تک پریکٹس کرتے رہے۔ ۱۸۸۵ء کے آخر تک وکالت چھوڑ کر منصف ہو گئے اس منصب میں اس حد تک مہارت بہم پہنچائی اور ترقی کی کہ قائم مقام ایڈیشنل جج اور سیشن جج کے منصب تک پُہنچے۔ ۱۹۰۵ء میں گورنمنٹ کی طرف سے گریفن کمیٹی کے ممبر مقرر ہوئے تھے۔ مارچ ۱۹۱۲ء کو بعارضہ طاعون انتقال کر گئے۔

جوالا پرشاد برق شاعری اور نثر نگاری میں یکساں مہارت رکھتے تھے۔ لکھنے لکھانے کا شغل بچپن ہی سے جاری تھا۔ لیکن لکھنؤ کے زمانہ قیام میں منشی سجاد حسین تربھون ناتھ ہجر اور احمد علی شوق کی صحبت نے ان کے اس شوق کو جِلا بخشی اور اُنہوں نے بھی اودھ پنچ میں لکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اودھ پنچ کو ترقی اپنے بام عروج تک پہنچانے میں جوالا پرشاد برق کا خاصا ہاتھ تھا۔ ان کی مختصر نظمیں بھی اودھ پنچ میں شائع ہوتی تھیں لیکن خصوصیت کے ساتھ جس نظم کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی وہ مثنوی بہار ہے۔

برق ترجمے کے فن میں بھی ماہر تھے۔ معشوقہ فرنگ رومیو جولیٹ کا منظوم ترجمہ ہے۔ شیکسپیئر کے کئی ناٹکوں کا لفظی ترجمہ بھی برق نے کیا ہے۔ انگریزی کے علاوہ برق نے بنگالی زبان کے مصنف، بنکم چندر چٹرجی کے ناولوں کے اُردو تراجم بھی کیے ہیں۔ اُن میں بنگالی دلہن، مار آستین وغیرہ شامل ہیں۔ تراجم کے علاوہ برق نے ملکی حالات ووسائل اور سیاست پر بھی طنزومزاح سے بھرپور مضامین لکھے جو اودھ پنچ کی پالیسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے لکھے تھے۔ البرٹ بل اور جوڈیشل کمشنری اودھ اسی طرح کے مضامین ہیں۔

برق نظم و نثر میں اپنی کوئی مخصوص انفرادیت قائم نہ رکھ سکے۔ ایک تو انہوں نے اپنی صلاحیتیں تراجم میں صرف کر دیں اور نثر میں تو واضح طور پر فسانہ آزاد کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ وہ سرشاد کے رتبے کو تو نہ پہنچ سکے لیکن اپنے طور پر وہ اس کی کوشش ضرور کرتے رہے۔ بہر حال برق اودھ پنچ کے ابتدائی دور کے مستقل لکھنے والوں میں شمار ہوتے تھے اور اودھ پنچ ہی کی بدولت اُن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

منشی احمد علی شوق قدوائی ۱۸۵۲ء۔ ۱۹۲۵ء

احمد علی شوق رام پور میں درس و تدریس کے شعبہ سے منسلک رہے، مزاج عملی تھا، زیادہ تر سنجیدہ اور عملی مضمون لکھے۔ "اودھ پنچ" میں بھی لکھا۔ "قاسم وزہرا" کے نام سے ایک ڈرامہ بھی لکھا، بعض دیگر تصانیف اودھ پنچ کے صفحوں پر جا بجا بکھری پڑی ہیں جہاں لطیفے، چٹکلے، فقرہ بازی، ضلع جگت، پھبتی یعنی طنز و مزاح کی ہر صنف کی مثالیں نہ صرف اس عہد کے سیاسی اور تاریخی و معاشرتی پس منظر کی ترجمانی کرتی ہیں بلکہ اس دور کے عام مذاق کی بھیتر جمانی کرتی ہیں۔ تماشہ دیکھئے کہ زیر عنوان شب برات کے بارے یوں لکھتے ہیں۔

> "یہ جلمونہی شب برات ایسی مہنگی میں اور جلے کو جلانے آئی آتش بازی و آتش بازی تو خاک نہیں، جی سنبھالنے کو گردش کا چکر، دورانِ سر کی چرخی داغ جگر کی مہتاب، آہ آتش فشاں کی ہوائی، ٹپ ٹپ ٹپکتے
> ہوئے آنسوؤں کی پھلجڑی، ہچکیوں کے پڑاتے موجود ہیں۔ رہا حلوا۔۔۔ سو یہاں فاقوں نے یونہی حلوا نکال رکھا ہے"۔(۲۸)

پنڈت برج نرائن چکبست ان کے بارے میں لکھتے ہیں "احمد علی شوق کے مضامین میں ظرافت کی شگوفہ کاری کے علاوہ زبان و محاورہ تحقیقات کا خاص لطف ہے"(۲۹) جنوری ۱۸۷۷ء سے دسمبر ۱۹۱۲ء تک تقریباً چھتیس سال تک اودھ پنچ شائع ہوا، اٹھارہ سو کے لگ بھگ شمارے نکلے، اس دوران بہت سے لوگوں نے اودھ پنچ میں لکھا، کچھ مصنفین مسلسل لکھتے رہے، کچھ وقتی طور پر۔ اودھ پنچ کے نامور لکھنے والوں کے علاوہ بھی اس کے صفحات میں ایسے بے شمار لوگوں کی فکری کاوشیں بکھری پڑی ہیں جو آج اتنے معروف نہیں ہیں مگر اس زمانے میں انہوں نے خوب لکھا۔

خدوخال

منشی سجاد حسین کی ادارت میں "اودھ پنچ" ۳۶ سال تک نکلتا رہا۔ اس دوران اس میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اخبار کا سرورق بدلتا رہا، مشتملات کے عنوانات بھی بدلتے رہے لیکن اخبار کے مزاج میں

کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ یہ اس نصب العین کے ساتھ صحافتی دنیا میں نمودار ہوا تھا کہ LIFE IS PLEASURE۔ ابتدائی شماروں کے سرورق پر ایک مضحکہ خیز خاکہ ہوتا جس میں ایک شخص کے مارے ہنسی کے زبان باہر نکلی ہوئی ہے، اس کے دونوں ہاتھوں میں کاغذات ہیں۔ داہنے ہاتھ کے کاغذ پر قیمت درج ہے بائیں ہاتھ کے کاغذ پر اسی اخبار کا اشتہار ہے۔ اس کی ایک آنکھ میں اودھ اور دوسری میں پنچ لکھا ہوا ہے۔ پھندنے والی ٹوپی پر تاریخ اشاعت، ٹوپی کی پٹی پر انگریزی حروف میں OUDH PUNCH درج ہے۔ اس شخص کی کمر کی پٹی پر LIFE IS PLEASURE تحریر ہے اور اس کے دونوں طرف دو فرشتوں نے جلد اور شمارہ نمبر کی تختی اٹھا رکھی ہے۔ یہ خاکہ آج کے معیار سے تو نہایت ناقص ہے لیکن اس زمانے کے اعتبار سے یقیناً اس میں اچھوتا پن اور دلچسپی کا سامان موجود تھا۔

''اودھ پنچ'' آٹھ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا، ہر صفحے پر کبھی تین کالم اور کبھی دو کالم ہوتے۔ ہر کالم میں عموماً ۳۵ سطریں۔ بعد میں چار صفحوں کا اضافہ ہو گیا تھا اور یہ بارہ صفحات پر چھپنے لگا تھا۔ سرورق پر بھی دواوں کے اشتہارات شائع ہونے لگے تھے۔ اخبار کے اشتہار سے معلوم ہوتا تھا کہ چندہ پیشگی وصول کیا جاتا تھا۔ البتہ ایک پرچہ بہ طور نمونہ درخواست پر بھیج دیا جاتا تھا نامہ نگاری کے خواہش مندوں سے پہلے کوئی مضمون منگوالیا جاتا تھا۔ مضمون معیاری ہونے کی صورت میں نامہ نگار کو متعین کر دیا جاتا تھا۔

vi. اودھ پنچ کی خدمات

اودھ پنچ نے اردو زبان و ادب میں طنز و مزاح کی ایک باقاعدہ روایت کا آغاز کیا۔ ''اودھ پنچ'' سے پہلے شاعری میں تو طنز و مزاح کے نمونے موجود تھے لیکن نثر میں قدیم داستانوں میں ظرافت کی جستہ جستہ مثالوں اور خطوطِ غالب کو چھوڑ کر ظریفانہ ادب کی کوئی روایت موجود نہیں تھی۔ ''اودھ پنچ'' نے پہلی بار نثر میں طنز و مزاح کا باقاعدہ آغاز کیا اور اپنے عہد کے سیاسی و سماجی اور بین الاقوامی مسائل و موضوعات کو ظریفانہ رنگ میں پیش کر کے ایک نئے رجحان کا در وا کیا۔ بلاشبہ یہ رجحان طبع زاد نہ تھا بلکہ مغرب سے مستعار تھا۔ لیکن اودھ پنچ کے معاونین کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مغربی طرز کے طنز و مزاح کو اپنے اندر جذب کیا اور پھر اسے اپنے عہد اور مسائل کے تناظر میں پیش کیا۔ گویا یہ نری تقلید نہ تھی بلکہ اس میں جدت، اختراع پسندی، اپنی انفرادیت کے اظہار، صحافتی میدان میں اپنی زبان کے امکانات کی تلاش اور اس کی حدوں کو وسعت دینے کا جوہر موجود تھا۔ ''اودھ پنچ'' نے طنز و مزاح کے آلے کو اپنی تہذیبی اقدار و روایات کے تحفظ کے لیے استعمال کیا اور مغرب کی اندھی تقلید کے زمانے میں قوم کے ہاتھ میں آئینہ تھما کر اسے اس تقلید کے نتائج سے آگاہ کیا۔ ''اودھ پنچ'' کی خدمات اور کارناموں کے اعتراف کے باوجود اس کے طنز و مزاح کے معیار پر متعدد اعتراضات کیے جاتے

ہیں چکبست کی رائے ہے کہ "اودھ پنچ کی ظرافت کو بحیثیت مجموعی اعلادرجے کی ظرافت کو نہیں کہہ سکتے۔اگر لطیف پاکیزہ ظرافت کارنگ دیکھنا ہے تو اردوزبان کے عاشق کو غالب کے خطوط پر نظر ڈالنا چاہیے"(۳۰) کشن پرشاد کول کے خیال میں: "معیاری حیثیت سے "اودھ پنچ" کے طنز وظرافت کے رنگ میں لطافت اور پاکیزگی نہیں تھی اور اس کے قہقہوں میں وہ جاذبیت اور اثر نہیں تھا جس کی عود ہندی، رقعات غالب اور اردوئے معلی کے پڑھنے والی طبیعتیں زیر لب مسکراہٹ کی عادی تھیں"(۳۱) قاضی عبدالودود نے "اودھ پنچ" کے طنز ومزاح کی ایک اہم خامی کی طرف اشارہ کرتی ہوئے لکھاہے کہ

> "اودھ پنچ میں ظرافت کی وہ قسم تو ملتی ہے جسے انگریزی میں وٹ کہتے ہیں لیکن ہیومر بہت کم ہے اودھ پنچ کے لکھنے والے اس سے ناواقف ہیں کہ ایجاز ظرافت کی جان ہے یہ قول گوئیے توس قزح بھی اگر دیر تک رہے تو کوئی اس کی طرف نہ دیکھے۔"(۳۲)

اودھ پنچ کامزاح بھی اخباری مزاح تھااس کے موضوعات بھی ہنگامی تھے جو مرورایام کے ساتھ دم توڑ گئے۔اودھ پنچ کے لکھنے والوں کے سامنے ادبی شہ پارہ تخلیق کرنا کبھی مقصد نہیں رہالہٰذاان کی تحریروں کو ادبی پیمانے پر جانچنا بھی ان کے ساتھ ناانصافی ہے۔ڈاکٹر وزیر آغانے ادبی اور صحافتی مزاح کافرق واضح کرتے ہوئے لکھاہے کہ

> "جس طرح ادب کی حیثیت مستقل ہے اور صحافت کی حیثیت محض ہنگامی بعینہ ادبی مزاح زندگی کے ان مضحک پہلوؤں پر استوار کرتا ہے جو عالم گیر انسانی حماقتوں سے جنم لیتے ہیں اور صحافتی مزاح محض ان ہنگامی ناہمواریوں سے تحریک لیتا ہے جو کسی خاص واقعے کی منت کش ہوتی ہیں اور جو وقت گزر جانے پر اپنی مضحک کیفیات تیزی سے کھونے لگتی ہیں۔"۳۳

پس اودھ پنچ کامزاح بھی صحافتی مزاح تھااور اس کی اکثر تحریروں کا اندازہ ویساہی تھا جیسے آج کل کے اخبارات کے فکاہیہ کالم۔ان کالموں میں عہد حاضر کی سیاسی وسماجی ناہمواریوں پر دلچسپ تبصرے اور فقرے بازی ہوتی ہے۔یہ ایک ہلکی پھلکی شگفتہ تحریر ہوتی ہے۔جسے قاری ذہن پر بوجھ ڈالے بغیر آسانی سے پڑھ سکتاہے اور پڑھ کر شگفتہ ہوسکتاہے۔اودھ پنچ کی تحریروں کی نوعیت بھی ایسی ہی تھی بلکہ دیکھا جائے تو اردو کی فکاہیہ کالم نگاری کا آغاز بھی اودھ پنچ سے ہوتا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ اسی کی کوششوں کے نتیجے میں اردو ادب میں بھی طنز ومزاح کی صنف کی راہیں کشادہ اور روشن ہوئیں۔ اس نے ہنسنے ہنسانے کی صلاحیت کو اعلی قومی اور تہذیبی مقاصد سے ہم آہنگ کیا۔بلاشبہ طنز ومزاح کا اس نے جو معیار قائم کیا اس میں خامیاں اور کمزوریاں موجود تھیں لیکن عجلت اور فوری ضرورت کے تحت لکھے جانے والے مزاح میں ہمیشہ

معیار کی عمدگی کی توقع عبث ہے۔ اسی اودھ پنچ کے مضامین میں طنز کی صفت تو بہ کثرت ملتی ہے۔ لیکن مزاح خال خال ہے اور یہ بھی کچھ کم حیرت انگیز بات نہیں کہ اس زمانے میں جب اخبارات کو اچھے لکھنے والے مشکل سے دستیاب ہوتے تھے، اودھ پنچ نے اس وقت کے معیار کے لحاظ سے عمدہ لکھنے والوں کی ایک بڑی ٹیم جمع کرلی اور یہ سب کے سب طنز و مزاح کی دشوار گزار اور سنگلاخ زمین پر اپنے قلم کے جوہر دکھاتے رہے جب کہ ابھی یہ زمین نئی تھی اور پوری طرح دریافت بھی نہیں ہوئی تھی۔ اودھ پنچ کی کامیابی کا ایک ناقابل تردید ثبوت اس کی مقبولیت تھی اس نے دیکھتے ہی دیکھتے اپنے پڑھنے والوں کا ایک وسیع حلقہ پیدا کرلیا۔ اس زمانے میں جب عام اخبار کی اشاعت دو تین سو ہوتی تھی اودھ پنچ اور اس کی تقلید میں نکلنے والے دیگر پنچ اخبارات پر تحقیق و تفتیش کا سلسلہ جاری ہے۔

منشی سجاد حسین کی علالت کے سبب اودھ پنچ ۱۹۱۲ میں بند ہو گیا تھا۔ پھر حکیم محمد ممتاز علی عثمانی نے اسے جسٹس کرامت حسین کے مشورے سے ۲۶ اکتوبر ۱۹۱۶ میں دوبارہ جاری کیا۔ ۱۹۳۳ میں اس کی اشاعت گھٹ کر صرف ۶۵۰ رہ گئی تھی۔ دور ثانی میں اودھ پنچ کم و بیش انیس سال تک نکلتا رہا حکیم صاحب کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے ظہیر حیدر نے اسے زندہ رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن ۱۹۳۴ میں یہ آخر کار بند ہو گیا ۔ دوسرا دور یقیناً مقبولیت کے لحاظ سے پہلے دور سے بہتر نہیں تھا۔ لیکن سرکاری رپورٹ میں اس کے لب و لہجے پر اظہار اطمینان کیا گیا۔ رپورٹر نے لکھا:

Its tone has changed for better.

vii. اودھ پنچ کی پالیسی

''اودھ پنچ'' بہ ظاہر تو مزاحیہ اخبار تھا لیکن سنجیدہ اور سماجی مسائل پر اس کا اپنا ایک نقطہ نظر تھا جسے وہ طنز و مزاح کے پیرائے میں ظاہر کرتا رہتا تھا۔ خوف اور مصلحت سے وہ بلند تھا، جس بات کو سچ سمجھتا تھا وہی لکھتا تھا، اس کی ایک سوچی سمجھی پالیسی تھی جس پر وہ مستقل مزاجی سے کاربند رہا۔ اس پالیسی کے نمایاں نکات یہ تھے:

الف: مغربی تہذیب اور سرسید کی مخالفت

ب: حکومت پر جرأت مندانہ تنقید

ج: انڈین نیشنل کانگریس کی حمایت

د: لکھنوی زبان و ادب کا تحفظ

مغربی تہذیب اور سرسید کی مخالفت

"اودھ پنچ" منظر عام پر آیا تو پورا ہندوستان اس وقت غلامی کی زنجیروں میں جکڑ چکا تھا۔ یہ غلامی سیاست و اقتدار کے دائرے سے نکل کر تعلیم، تہذیب، زندگی کے عام طور طریقوں میں مغرب کی اندھی تقلید کی صورت میں ظاہر ہو رہی تھی۔ یہ احساس عام ہو رہا تھا کہ تہذیب جس چیز کا نام ہے اس کے وارث انگریز ہیں اور ان کے مقابلے پر ہندوستانی اجڈ اور وحشی ہیں۔ لہذا انھیں متمدن اور مہذب ہونے کے لئے مغربی تہذیب کو آنکھ بند کر کے اختیار کر لینا چاہیے۔ "اودھ پنچ" اس غلامانہ ذہنیت کا دشمن تھا۔ چوں کہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم و تہذیب کے سب سے بڑے وکیل سر سید احمد خاں تھے اس لئے "اودھ پنچ" سر سید احمد خاں ان کے تعلیمی تحریک کا بھی بدترین مخالف تھا۔ اور یقیناً اس مخالفت میں وہ اکثر حد اعتدال سے بھی تجاوز کر جاتا تھا۔ مغربی تہذیب اور اس کے چرچے سے "اودھ پنچ" کو کتنی الجھن ہوتی تھی اس کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے کیا جا سکتا ہے:

"تہذیب! تہذیب!! تہذیب!!! سنتے سنتے کان بہرے ہو گئے ہیں۔ جدھر دیکھو تہذیب ہی تہذیب۔ اٹھنے بیٹھنے میں تہذیب، چلنے پھرنے میں تہذیب، ہگنے موتنے میں تہذیب، یاالٰہی! تہذیب کم بخت تو جان کی عذاب ہو گئی۔۔۔ ادھر انگریزی ہوئی ادھر دنیا میں تہذیب پھیلی۔ شرابی مہذب، بھنگیری مہذب۔ اس سرے سے اس سرے تک سب مہذب۔ دنیا بھر میں بڑے فعل چاہے کیوں نہ کرے۔ مہذب میں وہ ہی نہیں آئیں گے۔ یہ سب تو درکنار بعضے خدائی فوج دار ملکی ڈھنڈورچیوں کی تہذیب نے ناک میں دم کر دیا۔ روز نصیحت کے بہانے خدائی بھر کے آئیں بائیں شائیں بکا کرتے ہیں۔"(۳۴) اس قسم کی تلخ، ترش اور طنزیہ تحریروں میں بھی در پردہ اشارہ سر سید کی مصلحانہ کوششوں کی جانب ہوتا تھا اور مقصد ان کی مذمت ہی ہوتی تھی۔ مثلاً: "شیک ہینڈ کرتا ہوں میں اس ریفارمز سے دنیاوی ترقی حاصل کرنے کے غرض سے، عہد کرتا ہوں کی تجاوز نہ کروں گا ایک قدم بھی اس راستے سے جو راستہ میرا ریفارمر مجھے بتلائے (چاہے وہ جہنم کا راستہ ہو) نہ واسطہ رکھوں گا دین اور ایمان اور کل مذہبی خیالات سے کسی طرح مقدم سمجھوں گا خوشنودی یورپ والوں کو، خدا کی خوشنودی پر، تعمیل کروں گا ان کے احکام کی، احکام الٰہی کو چھوڑ کر، نہ فرق کروں گا حلال و حرام میں، قولاً ہو یا فعلاً۔ نہ گر دپھٹکوں گا ان پرانے ڈھکوسلوں کے جن کو فرض، واجب یا سنت مستحب کہتے ہیں۔۔۔ جھٹلاؤں گا حدیثوں کو۔۔۔ باطل سمجھوں گا اس کلام کو جس کو نادان اللہ کا کلام سمجھتے ہیں۔ حقیر سمجھوں گا ان لوگوں کو جو پابند ہوں گے مذہب کے۔۔۔ پلٹا دوں گا قرآن و حدیث کے معنی کو۔۔۔ موتوں گا سیدھا کھڑے ہو کر اور پاک سمجھوں گا ان چھینٹوں کو جو زمین سے اڑ کر منھ پر پڑیں۔ دریغ نہ کروں گا بنیاد اسلام کے کھدوانے چاہے مسجد ہو۔ منھ چوموں گا کتوں کا طاہر جان کر۔۔۔ شراب پیوں گا رمضان کے مہینے

میں فرض کرکے۔ کلمہ پڑھوں گا اہل یورپ کا کلمہ اسلام کے بدلے۔ گیند یا کرکٹ کھیلوں گا نماز کے بدلے۔لندن شریف کی زیارت کروں گا حج کے بدلے۔ تبرک سمجھوں گا اس کھانے کو جو جھوٹا ہو کسی انگریز کا۔ اے میرے ریفارمر! اگر لڑکھڑائیں میرے قدم ان راہوں پر چلتے ہوئے تو انجام میرا ہو ساتھ پرانی روشنی والوں کے اور نہ نصیب ہو مجھ کو اس پاک چیز کا جو بکسوں میں بند ہو کر ولایت سے آتی ہیں۔(۳۵)

''اودھ پنچ'' اور اس کے طنز نگاروں نے مغربی تہذیب اور اس چمک دمک کے کھوکھلے پن کو عیاں کرنے کے لیے طنز کے تمام ہتھکنڈے آزمائے۔ نواب سید محمد آزاد اودھ پنچ کے مستقل لکھنے والے تھے اور ''مغربیت'' سے سخت متنفر۔ انھوں نے اس تہذیب کے نقائص سے اپنے ہم وطنوں کو آگاہ کرنے کے لیے ایک دلچسپ طریقہ یہ نکالا کہ ہندوستان سے اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن جانے والے ایک طالبعلم سعید ازلی کے فرضی خطوط کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا۔ ان خطوں میں لندن کی زندگی اور وہاں کی تہذیب و معاشرت پر اس انداز سے انداز سے طنز کیا جاتا تھا کہ ان کا مضحک پہلو نمایاں ہو کر سامنے آجاتا تھا۔ یہ خطوط زیادہ تر ''مائی ڈیئر پاپا''، ''مائی ڈیئر عفت بیگم'' اور ''مائی ڈیئر مولانا اودھ پنچ'' کے نام لکھے گئے ہیں اور طنز و مزاح کا اعلیٰ نمونہ کہے جاسکتے ہیں۔مائی ڈیئر عفت بیگم کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

لندن سورٹن سٹریٹ نمبر ۲۲۸۹۵

تاریخ ۳۰جولائی ۱۸۷۸ء

مائی ڈیئر عفت بیگم

میرا پہلے پہل بسم اللہ مجریھا و مرسھا کہہ کر دریائے فراق میں کشتی ڈالنا اور بندرگاہ بمبئی سے جہاز دخانی پر چڑھنا کہ تمہاری فرقت مجھ پر سوار ہوئی۔ اکثر راتوں کو جہاز میں تمہارے گیسوئے مشکیں، موباف سرخ اور گرئی ملگجے دوپٹے کا خیال مجھے ستایا کرتا تھا مگر جب سے اس طلسماتی شہر لندن میں، میں نے قدم رکھا روز بہ روز صدمہ مفارقت گھٹتا گیا اور درد جدائی کی تکلیف کم ہوتی گئی۔ اب بہ خدا تمہاری محبت اسی قدر اور اسی طرح کی مجھے ہے کہ جیسے کسی کو اپنی پالی چڑیا یا کسی پیارے جانور کی محبت اور یاد ہوتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں، میں تم کو بھول گیا ہوں یا تمہاری محبت بالکل میرے دل سے مٹ گئی ہے بلکہ تمہاری حالت کا جب میں اس ملک کی حور نژاد عورتوں سے مقابلہ کرتا ہوں تو تم بالکل ایک نیم وحشی چارپایہ بن کر میرے دیدہ تصور میں آتی ہو اور میں اس سے نہایت پچھتاتا ہوں کہ کیوں میری پیدائش ہندوستان میں ہوئی۔ کیوں نیم وحشی گوشت کے ملنے ڈلنے والی چیز کو میرا باپ بنایا گیا اور کیوں تم سی معصوم نیم وحشی آدمی کے دائمی عیش و آرام کا میں میں ضامن ٹھہرا۔۔۔ کوہ قاف، سبز پری، لال پری، زرد پری، نیلم پری، سڑپٹر پری کے قصے لڑکپن سے سنا کرتا تھا اور

ان قصوں کو خیالی باتیں جانتا تھا مگر تمہاری جان کی قسم پریوں کا ملک یہی ہے۔ یہاں کی عورتیں آزادی کی ہوا کھا کر جیتی ہیں۔ ہر قسم کی تعلیم پاتی ہیں ہر مجلس و محفل میں بے تکلف ہو جاتی ہیں، گاتی بجاتی ہیں، ناچتی ہیں۔ ہر قسم کے مردوں کو خوش کرتی ہیں، عمدہ سے عمدہ شرابیں پیتی ہیں۔ سواریوں پر سیر کو نکلتی ہیں لباس صاف پریوں کا سا ہے۔ صرف پر کھونس دینے کی کسر ہے۔ غرضے کہ

مصالح جو ہو تا تو اڑ بھاگتی

میں یہاں پڑھنے آیا ہوں مگر کیا خاک کتاب دیکھوں۔ کوئی آن کوئی وقت کوئی لحظہ بھی تو آئینہ دل کسی پری وش کے جلوے سے خالی نہیں رہتا۔ جب کسی فرنگی کی واٹر سلک گون پر آنکھ پڑ جاتی ہے مجھے تمہارا گرنٹ کا پاجامہ کس نفرت سے یاد آتا ہے۔ جب کسی میم کو دوسرے صاحب کے ساتھ ناچتے کودتے دیکھتا ہوں تمھاری شرم ایک تیر کی طرح دل کے پار ہو جاتی ہے۔ جب کسی معتزز لیڈی کو بیف کے ٹکڑے پر ہاتھ صاف کرتے دیکھتا ہوں تو تمھارا چپاتیوں کو حنائی انگلیوں سے کھٹکنا یاد آتا ہے اور کیا جی گھبراتا ہے جس کسی مس کے سر سے جاکی کلب یا پمٹم کی بو آتی ہے تمھارے سر کے حنا کے تیل کے خیال اور اس کی بری بو کے تصور سے دماغ پراگندہ ہو جاتا ہے۔ جب کسی خاتون کو انٹا کھیلتے وقت پھرتی سے منی پوری ٹانگھن کی طرح تڑپ جاتے دیکھتا ہوں اور تمھارا مریضانہ اور نخرے سے کمر کو سو جگہ سے خم دینا اور چوکی پر سے طاق تک عطر لانے جانا یاد ہوتا ہے تو دل کو سخت صدمہ پہنچتا ہے۔ جب ایک روشن دماغ عورت کو دیکھتا ہوں کہ اپنی گفتار، رفتار اور ذہانت جودت سے بیس بیس جنٹل مین یعنی شریف مردوں کو خوش کرتی ہے تو اس وقت تاسف ہوتا ہے کہ تم عزیز مردوں کو دیکھ کر اس طرح مرجھا جاتی تھیں جس طرح لجالو۔۔۔ بھلا تم ہی خیال کرو کہ تم سے (میں؟) اور ایک جانور سے (میں؟) کیا فرق ہے۔ کھانا پینا سونا یہ سب کچھ تو ایک حیوان کو نصیب ہے۔ تم اگر تھوڑا سا کام اپنی موٹی عقل سے لو تو تم کو خود معلوم ہو جائے گا کہ دنیا ایک قدرتی عیش خانہ ہے اور بندگان خدا اس میں عیش و آرام کرنے آتے ہیں نہ کہ قیدی بن کے پاگل خانے اور مرغی خانے میں رہنے۔۔۔

راقم سعید ازلی

ازلی نئی روشنی کا نامہ پیام (۳۶)

''اودھ پنچ'' نے مغربی تہذیب کے جن تاریک پہلوؤں کی نشاندہی کی، حیرت انگیز طور پر سرسید کی نگاہ ان کی طرف نہیں گئی۔ حالاں کی سید محمد آزاد نے یہ خطوط ہندوستان میں بیٹھ کر لکھے تھے جب کہ سرسید نے تو مغربی تہذیب کا بہ چشم خود مشاہدہ کیا تھا۔ ''اودھ پنچ'' کو سرسید سے یہی شکوہ تھا کہ وہ مشرقی ہو کر مغرب کے پرچارک بنے ہوئے تھے۔ اور اسی لیے اس کے صفحات سرسید کی اصلاحی و مقصدی تحریک کے بخیے

اڑھیڑنے کے لیے وقف رہے۔۱۸۷۷ء سے ۱۸۹۳ء تک سرسید کے خلاف نظم و نثر میں اتنا کچھ لکھا گیا کہ انھیں یک جا کیا جائے تو کئی ضخیم جلدیں مرتب کی جاسکتی ہیں۔ ان مضامین میں سرسید کو کافر، کرسٹان، نیچری، فریبی، دھوکا باز اور گداگر تک کہا گیا سرسید نے علی گڑھ کالج کے لیے چندہ جمع کرنے کی مہم شروع کی تو اودھ پنچ نے اس کا بھی مذاق اڑایا:

"بھیک مانگنے کا نیچرل اور مہذب طریقہ

ارے کم بختو! مجھ کو روپیہ دو! ارے نالائقو! مجھ کو دو

ارے بیوقوفو! مجھ کو دو۔ ارے بے ایمانو! مجھ کو دو

ارے جاہلو! مجھ کو دو۔ اے کاہلو! مجھ کو دو۔ خدا کے واسطے

چاہے نہ دو مگر نیچر کی خاطر سے تو دو"(۳۷)

"اودھ پنچ" کو سرسید کی مغربیت پر ایک زبردست اعتراض یہ بھی تھا کہ وہ اس مغربیت کے زیر اثر دینی عقائد میں تحریف کے مرتکب ہوئے تھے اور دین کی ایسی تفسیر و تعبیر پیش کر رہے تھے جو مسلمانوں کے لیے کسی طرح قابل قبول نہیں ہوسکتے تھے۔ ملاحظہ ہو دو رباعیاں:

سید اسلام کی ہوا سے ناخوش — روزے سے نماز سے دعا سے ناخوش

معراج سے معجزے سے قطعی انکار — کافر ہیں فرمودہ خدا سے ناخوش

اسلام سے منحرف ہوا ہے سید — نیچر سے میل کھا رہا ہے سید

اس پر دعویٰ ہے یہ کہ سید قوم — کیا مکر کے جال ڈالتا ہے سید

یہ سرسید کی عالی ظرفی اور ضبط و تحمل کی غیر معمولی صلاحیت تھی کہ انھوں نے کبھی پلٹ کر "اودھ پنچ" کے ان حملوں کا جواب نہیں دیا۔ یہ حملے کبھی پر لطف ہوتے تھے اور کبھی ثقاہت سے گرے ہوئے۔ ایک پر لطف حملے کا انداز دیکھیے:

"کیوں حضرت! یہ آپ جب دیکھیے خواہ مخواہ کو ہمارے بوڑھے سید پر منھ آتے رہتے ہیں۔ آخر سبب؟ غرض؟ ہمارے سرسید نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟ یہ بھی کیا غضب ہے کہ احسان تو مانتے نہیں الٹا دھڑا باندھا جاتا ہے۔ پوچھو سید کی اس میں کیا خطا کہ جو طالبعلم یورپ جاتا ہے ایک میم صاحبہ بغل میں دبائے چلا آتا ہے۔ سچ پوچھو تو اس میں کسی کی خطا نہیں۔ یہ تو آپ بھی مانتے ہیں کہ کھیل کود بھی بچوں کی تعلیم کا ایک جزو ہے۔ اگر چار گھنٹے سخت محنت کی پڑھائی میں صرف ہوئے تو کم سے کم ایک گھنٹا کھیل کود میں جس سے طبیعت خوش

رہے۔ آپ اپنے بچوں کو نہیں خود ہی بازار سے کھلونے کھیلنے کے لیے لادیا کرتے ہیں؟ بس اس طرح سید کو سمجھ لیجئے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ آپ غیر مہذب ہیں۔ بچوں کے کھیلنے کو کھلونے میں لایئے گا تو چنوا، جھنجھنا، بانسری۔ سید یہ نہیں کرتے کہ وہ زمانے کے نشیب و فراز کو دیکھ بھال کر لونڈوں کو ولایتی کھلونوں پر لگاتے ہیں اور یوں ان کو جی بہلاتے ہیں۔"(۳۸) منشی سجاد حسین کو سرسید سے ان کی انگریز دوستی کی وجہ سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ لہٰذا ہندی اردو تنازعے میں اردو کی حمایت کے معاملے کے سوا شاید ہی کوئی ایسا مسئلہ ہو جس پر انھوں نے یا ان کے اخبار نے سرسید کے کسی نقطہ نظر سے اتفاق کیا ہو۔ یہ مخالفت اس حد تک بڑھی ہوتی تھی کہ جب غلام احمد قادیانی نے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا تو "اودھ پنچ" نے اس پر ایک طویل مزاحیہ آرٹیکل شائع کیا جس میں سرسید کو بھی گھسیٹ لیا اور انھیں یحییٰ ثانی قرار دیا۔

حکومت پر جرأت مندانہ تنقید

"اودھ پنچ" سیاسی معاملات و مسائل پر اظہار رائے کے معاملے میں نہایت جرأت مند واقع ہوا تھا۔ انگریزی اور ریاستی حکمرانوں کی خبر لینے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ چوں کہ اخبار سیاسی اعتبار سے باشعور تھا لہٰذا انگریزوں کی سیاست کے داؤ پیچ کو خوب سمجھتا تھا۔ بہ قول شفقت رضوی "انگریز کی سیاست کا اپنا ایک رنگ تھا۔ ظاہر میں مراعات و اصلاحات کے شاخسانے لیکن بہ باطن استحصال کی تدبیریں"۔ "اودھ پنچ" نے ان استحصالی تدبیروں کو اپنے مخصوص طنزیہ رنگ میں خوب منکشف کیا۔ عیسائیوں کی کتاب مقدس کے اسلوب میں ایک ایسی ہی تحریر کا نمونہ دیکھیے:

مبارک وہ کالے جو ستائے جاتے ہیں کیوں کہ آسمان کی راحت انھیں کے لیے ہے۔

مبارک وہ جو سول سروس کے لیے رنجیدہ ہیں کیوں کہ سرکار سے زبانی تسلی دی جائے گی

مبارک وہ قحط کے بھوکے پیاسے ہیں کیوں کہ پادریوں کی بہ دولت مسیحی مذہب سے مشرف ہوں گے۔

مبارک وہ جو سنگ دل ہیں کیوں کہ بعض خوشامدی رحم دل کہیں گے۔

مبارک وہ جو راست بازی کے لیے دھکائے جاتے ہیں کیوں کہ ان کی سچائی کے درخت کی جڑ مضبوط ہو جائے گی۔

۱۸۷۷ء میں دہلی میں دربار منعقد ہوا جس میں ملکہ برطانیہ کو قیصرہ ہند کا خطاب دیا گیا۔ اس دربار میں والیان ریاست نے خوشامد کے اظہار کے طور پر خوب سرگرمی دکھائی اور اپنے اپنے خزانوں کے منھ کھول دیے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی کا یہ دربار انگریز حکومت کی قوت و مقبولیت کے مظاہرے کی پہلی کوشش تھی اس لیے حکومت اس کی کامیابی کے لیے نہایت سنجیدہ اور پرجوش تھی۔ دربار کے اختتام پر "اودھ پنچ" نے اپنے تبصرے

میں ریاستی حکمرانوں کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اس نے لکھا: "صاحبو! دربار تو جس جگہ گزر گیا جہاں سرکار نے آنکھ بند کر کے اپنے خطاب قیصری کی تصدیق میں ہندوستانی امراء و رؤسا کو بڑے بڑے لمبے چوڑے بے بہا خطاب عطا فرمائے، تمغے دیے، جھنڈے پکڑائے، سلامیاں کسی کی بڑھائیں۔ کسی کو تازہ دیں، وہاں رئیسوں نے بھی جان پر کھیل کر قرض سے، دام سے، علاقے رہن رکھ کر خوب دولت صرف کی۔ سونے چاندی جواہرات کی اچھی چمک دکھائی مگر اب طوفان خطاب قیصری تمام ہوا۔ دربار کے نشے کا خمار آیا۔ والی جودھ پور جو علاقہ رہن رکھ کر روپیہ لائے تھے اس کی سوچ میں ہیں۔ سر سالار جنگ بہادر برار کی آس لگائے بیٹھے تھے وہ بھی اپنا منھ لے کر رہ گئے۔ وہ شکستہ خاطر ہیں جو معزز عہدے پانے کے متوقع تھے، ان کی کمر ٹوٹ گئی۔ ہمارے چیف کمشنر صاحب بہادر جب سے آئے ہیں پیچش میں مبتلا ہیں۔ خدا جانے دعوتوں میں کیا بے عنوانی ہوئی۔ تماشائی، ناخوانده مہمان جو دہلی گئے تھے۔ چار آدمیوں کے سامنے تو خوب دون کی لیتے ہیں مگر دل کا یہ حال ہے کہ مصارف بے سود کا رنگ جدا، تکالیف مالا یطاق کا غم الگ، دہلی کے دھکوں کا مزا زبان پر، دہلی کی خاک پھانکنے کی ندامت دل میں، اپنے ہی جی میں شرمندہ ہیں کہ لاحول ولا لوگوں کے بھرے میں آکر ہم بھی حماقت کر بیٹھے۔"(۳۹) انگریزوں کے ہاتھوں ہندستانیوں کے قتل کے آئے دن کے واقعات کی مذمت یوں تو اس زمانے کے اکثر اخبارات نے کی لیکن "اودھ پنچ" کی مذمت کا انداز ہی اور تھا۔ ایک ایسے ہی مضمون کا اقتباس درج ذیل ہے۔ اس کا عنوان ہے: "پہلے تلی بڑھتی تھی اب زخم بھی بڑھنے لگے"۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوستانی بڑے مکار، بات کا بتنگڑ، سوئی کا بھالا، رائی کا پہاڑ بنانے والے ہوتے ہیں۔ شاعری واعری میں تو خیر مبالغہ بے ضرر گناہ ہے۔ جس کا جتنا جی چاہے صرف کرے۔ اس سے کوئی سوشل یا پولیٹیکل خرابی براہ راست پیدا نہیں ہوتی۔ مگر ستم تو یہ ہے کہ یہ مقدمات معاملات میں اپنی صفت دکھاتے اور اس سے بڑے بڑے نقصانوں کا اندیشہ پیدا کر دیتے ہیں۔۔۔ اب ایک اس بات کو دیکھیے کہ جہاں کسی گورے یا صاحب بہادر نے ان کو ٹھونکا، ڈگ مارا یا ٹھوکر لگائی یا کسی بیتار سے زخم لگایا بس یہ فوراً مر گئے اور اس بے چارے پر مقدمہ خون کا کروا دیا۔ یہ مانا کہ اکثر ملزم چھوٹ جاتا یا خفیف سی سزا پا کر خاطر خواہ کیفر کردار کو نہیں پہنچتا مگر انصاف شرط ہے۔ آخر اس کو چند روز بیم ورجا میں رکھنا، مقدمے کی کشاکش جھیلنا، عدالت کی تکلیف اٹھانی تو پڑتی ہے۔۔۔

اخبار نے لکھا کہ قتل کے اس قسم کے واقعات میں قصور گوروں کا نہیں ہندوستانیوں کا ہوتا ہے کہ "یہ لوگ تلی بڑھا رکھتے ہیں جہاں ٹھوکر لگی وہ شیشی کی طرح ادھر ٹوٹی، اُدھر جام حیات لبریز ہو گیا۔ یہ ترکیب تو مدت

سے جاری تھی اب حال کے مقدمات جن میں زخم کے ذریعے سے موت بیان کی جاتی ہے۔ بھید کھلا کہ زخم تو لگتا ہے تھوڑا سا اور ہندوستانی صاحب مر جاتے ہیں پورے طور سے، پھر نعش پر زخم اتنا بڑھا دیا جاتا ہے کہ معلوم ہو زخم سے مرے ہیں۔ بھلا پوچھے اس مبالغے کا کوئی ٹھکانہ ہے۔۔۔ گوروں اور صاحب بہادروں کو پھانسنے کے واسطے (ہندوستانی) وہ کر گزرتے ہیں جو سنگ دل سا سنگ دل اور دشمن سا دشمن نہیں کر سکتا"

ہندوستان میں چندے کا رواج انگریزوں کے عہد حکمرانی میں پڑا۔ حتیٰ کہ سرکار بھی عوام سے کسی نہ کسی بہانے چندہ وصول کرنے لگی۔ چناں چہ جب لیڈی ڈفرن فنڈ کھلا تو "اودھ پنچ" نے اس رجحان کی ظریفانہ پر ظریفانہ انداز میں گرفت کی:

"چندوں نے ناک میں دم کر دیا ہے۔ مدرسے کا چندہ، شفا خانے کا چندہ، نمائش کا چندہ، علی گڑھ کا چندہ۔ یا اللہ چندہ نہ ہوا جان کا عذاب ہو گیا۔ دیتے دیتے اب رہ ہی کیا گیا ہے۔ ایک جان باقی رہ گئی ہے اسے چاہے خدا لے چاہے میاں چندہ صاحب۔ عجب مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ ہمارے چھوٹے لاٹ صاحب کو خیر سے ڈفرن فنڈ کی دھن بندھی ہے۔ پہلے تو دل دہی اور خوشامد سے وصول کیا۔ اب حضور نے آنکھیں دکھلانا شروع کی ہیں فرماتے کیا ہیں کہ فنڈ خاص الخاص قیصر ہند کی مرضی سے کھلا ہے۔ جس نے ہمیں چندہ دیا وہ خیر خواہ سرکار ہے۔ اب اس کا برعکس غور فرمایئے کیا نکلتا ہے۔ یعنی جو نہ دے وہ خیر خواہ سرکار نہیں۔ اگر غصہ آ گیا تو اس کو ان الفاظ میں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جو چندہ نہ دے وہ باغی" "اودھ پنچ" میں بے شمار ایسی تحریریں بھی ملتی ہیں جنھیں آج کی صحافتی زبان میں فکاہیہ کالم کہا جا سکتا ہے۔ ان کالموں میں سرکاری محکموں پر نہایت خوبصورت انداز میں تنقید کی گئی ہے۔ ایک ایسا ہی کالم نقل کیا جاتا ہے۔ اس کالم میں گھر گھر پانی پہنچانے والے دیسی سقے اور انگریزی نظام آب رسانی یعنی واٹر ورکس کے درمیان مکالمہ ہوتا ہے۔ کالم کا عنوان ہے: "سقے اور واٹر ورکس"۔

(و) دل تم کون ہو۔

(س) حضور میں سقے بہشتی لوگ

(و) آہا تم بڑے خراب شریر آدمی ہو۔ تم گرمیوں میں خلقت کو بڑی تکلیف دیتے ہو۔ جب دیکھتے ہو خلقت کو پانی کی بہت ضرورت ہے تب تم عین وقت پر بڑی تکلیف دیتے ہو۔

(س) مجھ پر کیا موقوف ہے۔ آپ نہیں تکلیف دیتے۔

(و) تم بعض وقت شرارت کرتے ہو کہ باوجود نوکر ہونے کے آقا کے گھر میں پانی نہیں پہنچاتے۔ کبھی کہتے ہو مشک پھٹ گئی۔ کبھی کہتے ہو ڈول کنویں میں گر گیا۔ کبھی رسی سے ڈول معہ گراری کنویں میں جا رہا۔ کبھی مشک چھوٹی کر کے پانی کم دیتے ہو۔

(س) آپ بھی تو باوجود ٹیکس لینے اور وعدہ کرنے کے کبھی کبھی پانی کے عوض صرف ہوا روانہ کرتے ہیں۔ کبھی عذر ہے کہ کل بگڑ گئی۔ کبھی نل مرمت طلب ہو گیا۔ دو، دو چار دن نل میں قفل لگا رہتا ہے اور خلقت پانی کے لیے ترستی ہے۔

(و) دل ہمارا کارخانہ بڑا ہے۔ ہزاروں جھگڑے رہتے ہیں۔ پورے پورے شہر کو پانی پہنچانا ہوتا ہے۔ اگر ذراسی بات ہو گئی تو ایسی بڑی شکایت نہیں چاہیے۔

(س) تو جناب آپ میری تنخواہ کے مقابلے میں محصول ہزاروں لاکھوں نہیں لیتے بلکہ مجھے تنخواہ کہیں بعد میں ملتی ہے آپ پیشگی وصول کر لیتے ہیں اور اگر کبھی ناغہ کرتا ہوں تو مالک کو اختیار ہوتا ہے کی موقوف کرے، جرمانہ کرے۔ اتنے دن کی تنخواہ مجرا لے۔ اور آپ تو بڑے مزے میں رہتے ہیں۔ بھلا جس محلے میں پانی نہیں پہنچاتے اس کو ٹیکس واپس دیتے ہیں؟ سچ پوچھیے تو ہر بات میں آپ مجھ سے درجے بڑھے ہوئے ہیں۔ میں اگر دس کو تکلیف دیتا ہوں تو آپ ہزاروں کو۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میں چھوٹا شریر ہوں تو آپ بڑے ورنہ کام، خدمت اور شرارت میں یکساں ہی ہیں اور مجھے تو مالک سزا بھی دے سکتے ہیں۔ آپ سب سے بری ہیں۔ پھر فرمایئے میں زیادہ قابل ملامت ہوں یا آپ۔ میں اگر قزاق ہوں تو آپ سکندر۔ میں شرارت کا قطرہ ہوں تو آپ سمندر۔

(و) چپ رہ بد معاش۔ گستاخ۔ باغی۔ ہماری برابری، ہماری شان میں گستاخی کرتا ہے۔ ہم میونسپل بورڈ کی حمایت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ تیرا ابھی کوئی پشت پناہ ہے۔ راقم تشنہ کام(۴۰)

"اودھ پنچ" کے اوپر دیے گئے اقتباسات میں بے باکی کے ساتھ شوخی وطنازی پائی جاتی ہے لیکن کبھی کبھی اخبار کا لہجہ حکومت کے خلاف انتہائی تندو تیز اور تلخ بھی ہو جاتا تھا۔ عمال حکومت کت مظالم پر اس جرأت مندانہ احتجاج کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:"جو لوگ حکومت، دولت، رشوت کے مرد افگن نشے سے بدمست الو کی دم فاختہ ہو کر غربا کے خون ناحق کو سبیل کا پانی جان کر خون ریزی اور سفاکی کو اپنے مقطع چہرے کا غازہ بناتے ہوں، بے گناہوں کا گلا گھونٹ کر بے جان کرنا ان کی نام وری کا سبب ہے۔ خون ناحق نے ان کے چہرے کو سرخ نہیں سیاہ کر دیا ہے۔ بے ایمانی کی کیچڑ میں جس کی بدبو سے شیطان کا دماغ بھی پراگندہ ہو جائے ،لت پت ہیں۔۔۔ دنیا میں ان کے حکام کو جو بندہ طمع اور غلام حرص ہیں۔ گرم گرم سبزی روپہلی نوالے کھلا کھلا کر شرابیں پلا کر رضامند کر لیں۔ بعض بے گناہوں کو گولیوں سے اڑائیں۔ پھانسیاں دیں۔ کسی کے ہاتھ پر بچھو سے ڈنک لگوائیں۔ مرچوں کے تو بڑے ان کے منہ پر چڑھائیں۔ کولھو میں ڈال کر پیسیں ان کے خون کا گارا بنایا جائے، ان کی ہڈیوں کی دیواریں چنوائی جائیں لیکن دنیا فانی ہے۔ ان سختیوں کا زمانہ عنقریب ختم

ہو جائے گا مگر عقبیٰ کے وبال کا پنسارہ ان کے کاندھوں پر ہو گا اور عذاب میں وہ گرفتار ہوں گے کہ دنیا کے عذابات جو یوم ظلم سے قیامت تک جمع کئے جائیں اس کی گرد کو چھو نہیں سکتے۔ پرائی جان کا لینا کسی نابالغ کی دولت کا لینا نہیں ہے۔ خون ناحق کا عوض ہو جاتا ہے اور ضرور ہوتا ہے"۔(۴۱)

انڈین نیشنل کانگریس کی حمایت

منشی سجاد حسین کے نزدیک ہندوستان اور ہندوستانیوں کی غلامی ایک ذلیل ترین حقیقت تھی۔ جسے وہ کسی صورت میں قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے اور چوں کہ کانگریس قومی اتحاد کے نعرے کے ساتھ میدان سیاست میں اتری تھی اور بتدریج حکومت خود اختیاری کے مطالبے کی جانب بڑھ رہی تھی لہذا کانگریس کے قیام کے دو سال بعد انھوں نے باقاعدہ کانگریس میں شمولیت اختیار کرلی۔ اودھ پنچ کا جھکاؤ بھی واضح طور پر کانگریس کے حق میں ہو گیا۔ حالاں کہ اس زمانے میں مسلماں سرسید کی قیادت میں کانگریس سے بالکل الگ تھلگ تھے۔ لیکن منشی سجاد حسین کو بھلا یہ کیسے گوارا ہو سکتا تھا کہ وہ سرسید کی کانگریس سے علیحدہ رہنے کی ہدایت کو قبول کر لیتے۔ انھوں نے نہ صرف کانگریس کی کھل کر حمایت کی بلکہ لکھنؤ میں کانگریس مخالف جلسوں کو ناکام بنانے کے لئے "اودھ پنچ" کو پوری قوت سے استعمال کیا۔ اس طرح مسلمانوں کے اخبارات میں "اودھ پنچ" واحد اخبار تھا جس نے کانگریس کی پشت پناہی کی۔ ۳۱ دسمبر ۱۸۹۹ء کو لکھنؤ میں کانگریس نے جلسے کے انعقاد کا اعلان کیا۔ کانگریس کے مخالف مسلمانوں نے اسے ناکام بنانے کے لئے اپنے ایک الگ جلسے کا منصوبہ بنایا۔ اس کے لیے اشتہار چھاپے گئے۔ اشتہار میں ایک جملہ یہ تھا کہ "اس جلسے میں مع اعزا و احباب کے شرکت فرمائیں اور گورنمنٹ کے خیر خواہ بنیں"۔ منشی سجاد حسین کو موقع مل گیا۔ انھوں نے "انڈے بچے والی چیل چلہار" کے عنوان سے ایک کالم لکھ کر جلسے کے منتظمین کا خوب مذاق اڑایا۔ کالم میں کہا گیا: "بھلا یہ کیوں کر ممکن ہے کی بی کانگریس صاحبہ لکھنؤ مرحوم میں جان تازہ پھونکیں، چہرے کی رونق بڑھانے خراماں خراماں تشریف لائیں اور بی آنٹی صاحبہ چپ شاہ کی بالکی نموہی بنی، منھ میں گھنگھنیاں بھرے بیٹھی رہیں۔ اجی توبہ کیجئے بولیں اور پیچ کھیت بولیں اس طرح بولیں جیسے ارہر کے کھیت میں پنہدیت بٹیر، بلکہ گلا پھاڑ کے غل مچا کے، سارا شہر سر پر اٹھا کے جس میں یہاں سے لندن تک خبر ہو جائے کہ لکھنؤ میں بھی کچھ آنٹی بھائی ہیں"۔۔۔(۴۲)

"اعزا و احباب" کی جلسے میں شرکت کی دعوت پر طنز کرتے ہوئے لکھا کہ: "جب سارا گھر یوں شریک ہو گا تو اس دن ضرورت کا سامان بھی ہمراہ ہو گا خواصیں، پیش خدمتیں، شیر خوار جس کے ابھی ٹیکا لگا ہو گا اور دانہ ابھرنے یا دانت نکلنے کی وجہ سے چڑچڑا ہو گا پھر اس کا گہوارہ، پالنا، جھنجھنا، چسنی، انا، چھوچھو مع برادر رضاعی

اس کے علاوہ بکری کا بچہ، چند خرگوش اور چینی چوہے، طوطے کا پنجرا جو خاص اس مصلحت سے آئے گا کہ بولنے والوں کی بولیاں یاد کرے۔ باورچی خانے کا بگلہ، انا کے صاحب زادے نطفہ نا تحقیق کا پالا ہوا۔ لینڈی کتے کا پلہ۔ چھوٹی صاحب زادی کا گلہری کا بچہ، بی گربہ خانم مسماۃ پس، کبوتروں کا بک، مرغی کا ٹاپہ، بٹیروں کا تھیلا، بیگم صاحبہ کا پان دان یعنی سب کچھ دان، آفتابہ، آئینہ، اگال دان، طشت، تسلہ، لوٹا، ڈھولک، پایاں، منجیرے، بچھونے، گاؤ، بچے کے پوتڑے، نہالچے، لحاف، توشک، سلامتی سے سب ہی ہوا چاہتیں۔ پس معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا کیا سامان کیا گیا ہے اور ہاں بڑی بات تو رہی جاتی ہے یعنی ان سب کا کرایہ کون ادا کرے گا؟"چکبست نے منشی سجاد حسین کے کانگریسی کارکن بننے پر لکھا کہ:"انڈین نیشنل کانگریس چوں کہ قومی اتحاد کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی لہذا یہ بھی اس پولیٹیکل تحریک کے دل وجان سے مددگار ہوگئے تھے۔ اس صوبے میں منشی سجاد حسین کانگریس کے رکن تھے اور باوجود بہت سے انقلابات کے جن کے دھچکے سے اکثر قدم ڈگمگا گئے، منشی صاحب موصوف آخر دم تک اپنی وضع پر قائم رہے"۔(۴۳)

لکھنوی زبان وادب کا تحفظ

اودھ پنچ کو لکھنؤ کی زبان اور لکھنؤ کا ادب نے حد عزیز تھا اور اس معاملے میں ان کی حساسیت تعصب کے درجے پر پہنچی ہوئی تھی۔ چناں چہ "اودھ پنچ" کے چار یادگار ادبی معرکوں کا تجزیہ کیا جائے تو اس کے پیچھے لکھنوی عصبیت ہی کار فرما نظر آئے گی۔ پہلا معرکہ تورتن ناتھ سرشار کے "فسانہ آزاد" کے خلاف تھا جو قسط وار "اودھ اخبار" میں شائع ہو رہا تھا۔ "اودھ پنچ" کو یوں بھی اودھ اخبار سے اس کی سرکار پرستی کی وجہ سے پرخاش تھی اور وہ منشی نول کشور کے کاروباری اپیروچ کی وجہ سے "اودھ اخبار" کو "بنیا اخبار" لکھتا تھا۔ سرشار پہلے "اودھ پنچ" سے وابستہ تھے لیکن منشی نول کشور نے انھیں مدیر بنانے کی پیش کش کی تو وہ "اودھ اخبار" سے منسلک ہوگئے۔ "اودھ پنچ" کو "فسانہ آزاد" کی زبان اور محاوروں پر اعتراض تھا۔ اس کی رائے میں سرشار نے اودھ کی بیگمات کی جو زبان لکھی تھی وہ کنیزوں اور نچلے طبقے کی عورتوں کی زبان تھی۔ دوسرا معرکہ مولانا الطاف حسین حالی کی "مقدمۂ شعر و شاعری" کے خلاف برپا ہوا۔ "اودھ پنچ" کو مولانا حالی کے شعری نظریات سے بھی اختلاف تھا کیوں کہ حالی نے روایتی شاعری کو عفونت میں سنڈاس سے بھی بدتر قرار دیا تھا اور شاعری کو نیچر سے قریب ہونے پر اصرار کیا تھا۔ اودھ پنچ کو اصل غصہ اس بات پر تھا کہ حالی نے اپنی کتاب میں بری شاعری کی تمام مثالیں لکھنوی شعرا کے کلام سے اخذ کی تھیں۔ حالی کے خلاف تنقید و اعتراض کا سلسلہ عرصے تک جاری رہا۔ مخالفانہ مضامین اس سرخی کے تحت شائع کیے جاتے تھے:

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے

میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

تیسرا معرکہ داغ دہلوی کے خلاف تھا۔ داغ کا قصور یہ تھا کہ وہ "دہلوی" تھے اور شعر وادب کی دنیا میں ان کا بڑا شہرہ تھا۔ "اودھ پنچ" نے ان پر اعتراضات کا آغاز کیا تو معاملہ داغ کی شاعری سے بڑھ کر ان کے حسب نسب اور صورت و سیرت تک جا پہنچا۔ "اودھ پنچ" کا چوتھا اور سب سے طویل معرکہ شنکر نرائن چکبست کی مرتبہ مثنوی گلزار نسیم کے سلسلے میں ہوا۔ چکبست نے ۱۹۰۵ء میں اس مثنوی کو مرتب کر کے اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ اس مقدمے پر عبدالحلیم شرر نے اپنے رسالے "دل گداز" میں ایک تنقیدی تبصرہ لکھا اور اس کی بعض فروگزاشتوں پر گرفت کی۔ "اودھ پنچ" نے اس کا سخت جواب دیا اور یوں میدان کارزار گرم ہو گیا۔ اس تنازعے میں ملک کے نامور لکھنے والے شریک ہو گئے۔ "اودھ پنچ" نے عبدالحلیم شرر کے خلاف ۳۲ مضامین شائع کیے جن میں ۳۰ مضامین منشی سجاد حسین نے لکھے۔ شرر کے کارٹون بھی چھاپے گئے۔ ان ادبی معرکوں کے علاوہ بھی "اودھ پنچ" نے وقتاً فوقتاً مختلف غیر لکھنوی شعرا کے خلاف جو کچھ لکھا اس کا محرک بھی لکھنوی عصبیت ہی تھی مثلاً شاد عظیم آبادی جن کی غزلوں میں زبان و بیان کی غلطیاں نکال کر اصلاح دینے کی کوشش کی گئی۔

مضحک کردار کی تخلیق میں مصنف کو بہت محنت کرنا پڑتی ہے تب جا کر معاشرتی ناہمواریوں یا طرح طرح کے عجیب حرکتوں سے مزاح پیدا ہوتا ہے۔ مضحک کردار میں لچک نہیں ہوتی، ایک عام انسان کی طرح اگر مضحک کردار بھی خود کو ڈھال لے تو پھر سنجیدگی آجائے گی لہٰذا کمال ہوشیاری سے مزاح نگار اس کردار کو لے کر چلتا ہے۔ اس کردار کی تخلیق کے بہت سے مقاصد ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ۱۔ معاشرے میں ہونے والے ظلم و جبر کی نشاندہی ۲۔ انسانی زندگیوں کا اندرونی مشاہدہ کرنے کے لئے ۳۔ ماضی کی غلطیوں سے اصلاح کے لئے ۴۔ اخلاقی، مذہبی، معاشرتی، سیاسی زوال کے جائزے کے لئے۔

دراصل مضحک کردار ایک فرد کا نہیں بلکہ پورے معاشرے کا عکاس ہوتا ہے جس سے ہمیں اس فرد کے تمام حالات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے اور اس معاشرے کا بھی۔ مختلف اصناف ادب کے کرداروں کا اپنا اپنا اسلوب ہے، ہر مضحک کردار کی اپنی خصوصیات ہیں۔ معاشرتی ناہمواریوں پر تنقید کرنے کے لیے مضحک کرداروں سے مدد لی جا سکتی ہے اور ان کے ذریعے بڑی تلخ بات بھی آسانی سے دوسروں تک پہنچائی جا سکتی ہے۔ اودھ پنچ کے مصنفین نے بھی یہی راستہ اختیار کیا اودھ پنچ کے چند مضحک کردار درج ذیل ہیں:

حاجی بغلول

حاجی بغلول" مضحک کرداروں میں خاص اہمیت کا حامل ہے جسے " منشی سجاد حسین نے تخلیق کیا، جوں ہی قاری حاجی بغلول کو پڑھنا شروع کر دیتا ہے، اس کی مکمل توجہ حاجی بغلول کی طرف مبذول ہو جاتی ہے۔ حاجی بغلول کا کردار ان لوگوں پر تنقید بھی ہے جو خود کو بہت عقلمند سمجھتے ہیں اور ہر مسئلے میں آگے بڑھ کر رائے پیش کرتے ہیں۔ اس کردار کی تخلیق کا مقصد ہنسانے کے علاوہ دعوت فکر دینا بھی ہے۔ اس کردار نے اردو ناول کے ساتھ منشی سجاد کو بھی زندہ رکھا۔

احمق الذی

احمق الذی کا مضحک کردار بھی منشی سجاد حسین کا ہے، اگرچہ اس کردار کے مضحک ہونے پر بعض لوگوں کو اعتراض ہے تاہم اس میں مزاح کے بہترین نمونے تلاش کئے جاسکتے ہیں لہٰذا ہم اس کردار کو مضحک کرداروں کی فہرست میں شامل کرتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر شمع افروز زیدی " سجاد حسین کے ناول "حاجی بغلول" اور احمق الذی اردو ظرافت کی " تاریخ میں خصوصی مقام کے مستحق ہیں، انہیں پڑھئے تو انگریزی کے مشہور ادیب چارلس ڈکنز کے مزاحیہ شاہکار (Pickwick Papers) کا سا لطف حاصل ہو گا"۔ (۴۴) مضحک کردار نہایت اہم اور پرانا حربہ ہے، قدیم سے جدید تک اس حربے نے اپنے انداز سے سفر طے کیا۔ شاہی درباروں سے ٹیلی ویژن کے پروگرام تک اور مزید لطائف کی شکل میں خاص طور پر سکھوں اور پٹھانوں کے حوالے سے مضحک کردار پیش کئے جاتے ہیں۔ مضحک کردار اپنی شخصیت میں لچک نہیں رکھتے لہٰذا ناہمواری وجود میں آتی ہے۔ حالات سے عجیب و غریب انداز میں ٹکرانا مضحک کرداروں کا خاصا ہے جو مزاح کا باعث بنتا ہے۔

۳۔ "اودھ پنچ" کے موضوعات

"اودھ پنچ" نے مذہبی عصبیت سے بالاتر ہو کر ہر اس چیز کو موضوع بنایا جس کا تعلق برصغیر کے سیاسی، سماجی، تہذیبی، اخلاقی اور مذہبی مسائل سے تھا۔ زندگی کا کوئی پہلو یا گوشہ اس کے مزاحیہ اسلوب کا نشانہ بنے بغیر نہ رہا۔ خواہ یہ برطانیہ کا خارجی، استعماری نظام ہو، انسانی آزادی کو پامال کرنے کی ناپاک کوششیں ہوں، رقابت، حرص اور طمع کی اخلاق سے گری ہوئی مذموم کوششیں ہوں۔ عالمی جنگ کے سلسلے میں جرمنی اور برطانیہ کی رقیبانہ ہوسناکیاں ہوں۔ تخت و تاج کے لیے بھائی بھائی کا تصادم ہو۔ حکومت برطانیہ کی عیارانہ پالیسیاں ہوں، ہندوستانی والیان ریاست کی رنگ رلیوں، ہوسناکیوں اور غلامانہ ذہنیتوں کے بھونڈے خاکے ہوں، آزادی کے لیے ہندوستانیوں کی تڑپ ہو، برصغیر کے تہذیبی یا مذہبی تہوار ہوں، سیاسی حقوق کے تحفظ کے لیے کانگرس کی تگ و دو ہو، علی گڑھ تحریک اور مغرب پرستی کے خلاف صدائے احتجاج ہو، نام

نہاد جدیدیت کا مضحکہ اڑانا ہو' ادبی مخالفین کے چھکے چھڑانا ہوں یا اصلاح زبان کی کوششیں ہوں' کیا ہے جو "اودھ پنچ" کے صفحات پر بکھرا ہوا نظر نہیں آتا۔ "اودھ پنچ" اتنے بے شمار موضوعات سے کس طرح عہدہ برآ ہوتا تھا؟ یہ تو" اودھ پنچ" کی اٹھاون سالہ زندگی کی تاریخ کے ورق ورق پر کندہ ہے۔ جسے ڈاکٹر شارب نے مختصر لفظوں میں یوں بیان کیا ہے:

> "اودھ پنچ نے ایک ہی وقت میں ایک معلم' ایک مسخرے' ایک لیڈر' ایک واعظ' ایک مصلح' ایک ناصح اور ایک محتسب کی طرح تمام کام انجام دیئے ہیں" (۴۵)

"پنچ نگاروں کے ہاں نہ تو موضوعات کی کمی تھی اور نہ لکھنے کی صلاحیت کی۔ ان کی چلبلی طبیعتیں مچلتی رہتیں اور نوک قلم کسی بھی واقعہ کے مضحک پہلو دیکھ کر بے چین ہو جاتی۔ پھر ان کے قلم کے تیروں سے بچنا محال تھا۔" اودھ پنچ" کے موضوعات کے بارے میں لکھتے ہیں: "اودھ پنچ" کے مضامین کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ دنیا کا کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جو "اودھ پنچ" کے ظریفوں کی گلکاری سے خالی رہتا ہو۔ اس کے علاوہ لکھنؤ کے طرز معاشرت کی پر مذاق اور دلکش تصویروں سے اس کے صفحے اکثر رنگین نظر آتے تھے۔ محرم' چہلم' عید' شب برات' ہولی' بسنت کے جلسے' عیش باغ کے میلے' رقص و سرود کی محفلیں' مشاعرے' عدالت کی روبکاریاں' مرغ بازی' بٹیر بازی کے ہنگامے' الیکشن کے معرکے ایسے مشغلے تھے جو ہمیشہ "اودھ پنچ" کے ظریفوں کی نظر میں رہتے تھے۔ اور ان کی طبیعتوں کے لیے تازیانوں کا کام دیتے تھے۔ ساقی نامے' برہے' بارہ ماسے' دوہے' ٹھمریاں' غزلیں' رباعیاں وغیرہ نذر کرنے میں اکثر نامہ نگار خاص ملکہ رکھتے تھے۔ منشی سجاد حسین ہر ہفتہ ایک چھوٹا سا مضمون "لوکل علیہ الرحمۃ" کے عنوان سے لکھتے تھے جس میں اکثر موسم کی تبدیلیاں ایسے ظریفانہ رنگ میں دکھائی جاتی تھیں کہ پڑھنے والا ہنستے ہنستے لوٹ جائے۔" (۴۶) مذہبی اعتبار سے اودھ پنچ بالکل غیر متعصب اور غیر جانبدار رہتا تھا۔ گویا یہ صحیح معنوں میں قومی ہندوستانی اخبار تھا۔ جس کی دلچسپیاں اور ہمدردیاں بلا امتیاز رنگ و نسل اور مذہب و ملت اہل ہندوستان کے ساتھ تھیں۔ اودھ پنچ کو خود اس کا اعتراف تھا:

> "اودھ پنچ کو کسی خاص مذہب سے تعلق نہیں وہ ظرافت کے ساتھ ساتھ تمام دنیا کی اخلاقی اصلاح کا فرض ادا کرتا ہے" (۴۷)

عید شب برات کا موقع ہو یا ہولی' دیوالی اور بسنت کت تہوار ہوں اودھ پنچ بھرپور تیاری کے ساتھ اس میں شریک ہوتا تھا۔ ہولی اور بسنت کے موقع پر اودھ پنچ کے پرچے سرخ اور زعفرانی رنگ کے کاغذ پر شائع ہوا کرتے

تھے۔ اور اودھ پنچ کے شعراء اس خوشی کے موقع پر ساقی نامے، بہاریہ غزلیں اور ترانے وغیرہ بڑے جوش و خروش سے لکھتے تھے اور اودھ پنچ انہیں خاص اہتمام سے شائع کرتا تھا۔

اودھ پنچ نے اپنی اٹھاون سالہ زندگی میں جس موضوع کو سب سے زیادہ برتا اور جس کو سب سے زیادہ ہدف تنقید بنایا وہ انگریزی تمدن اور انگریز پرستی تھی اور غالباً اسی ضمن میں سرسید تحریک اور ان کے رفقاء کی سرگرمیاں بھی اودھ پنچ کا نشانہ بنیں۔ یہ موضوع اودھ پنچ میں اتنا عام ہے اور اتنے تواتر سے ملتا ہے کہ بغیر کسی کاوش کے کئی ایک مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ اکثر اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اودھ پنچ انگریزوں اور سرسید تحریک پر طنز کا کوئی موقع نہیں گنواتا۔ یہاں تک کہ بعض اوقات محض تنقید برائے تنقید پر ہی اتر آتا ہے۔ سرسید احمد خان اور علی گڑھ تحریک سے اودھ پنچ کو جو شکایت تھی اس کا ذکر اودھ پنچ نے اپنی ۱۸۸۹ء کی ایک اشاعت میں "معلم الملکوت پیر نیچر کے نام چھٹی" کے عنوان سے یوں کیا ہے: "مائی ڈیئر سرسید!" شاید تم کو تعجب ہوگا کہ میں نے ان محبت آمیز الفاظ سے تم کو یاد کیا اور پھر ایسی ضرورت کے وقت تمہاری مدد پر آمادہ ہوتا ہوں۔ مجھ کو بے شک ملال تھا کہ تم نے باوجود میری اس درجہ حقوق اور عنایتوں کے بھی میری رفاقت کی کچھ پرواہ نہ کی اور لارڈ ڈفرن کو ترجیح دے کر میرے خلاف بیعت کرلی۔ واقعی تمہاری ایک بہت بڑی غلطی تھی جو میرے مشن سے علیحدہ ہوکر معاملات ملکی کی جانب رجوع ہوئے اور یکایک تم نے دین کی خدمت کی رخنہ اندازی سے اپنے خیالات کو پھیر کر بالکل پولیٹیکل کرلیا مگر نہیں۔۔۔ مجھے ایک زمانے میں علی گڑھ کے طلباء کو نماز روزہ کا پابند دیکھ کر نہایت رنج ہوا تھا۔۔۔ مگر معاف کرنا میں تمہاری پیش بندیوں کو اس وقت نہ سمجھ سکا۔۔ ۔ جس خوبی سے تم نے شکار کھیلا اس کے شکریے کا اظہار بھی ضروری ہے خانقاہ اور مسجد کے رتبہ سے کالج کو تماشہ خانہ اور تھیٹر کردینا تمہارے ہی بائیں ہاتھ کا ایک کھیل تھا"

یہ تحریر اودھ پنچ کے مخصوص رنگ کی عکاس ہے۔ اس میں اودھ پنچ اور علی گڑھ تحریک کے جو اختلافات تھے اس کی پوری طرح عکاسی ہوگئی ہے۔ سرسید احمد خان کے نظریات و خیالات اور علی گڑھ تحریک کی بھرپور مخالفت کے علاوہ انگریزوں کی تضحیک کا بھی کوئی موقع اودھ پنچ نے اپنے ہاتھ سے نہیں گنوایا۔ وہ ہنسی مذاق اور لطیفے بیان کرتے ہوئے انگریزوں اور انگریزی اصلاحات پر ایسی گہری طنز کرتا کہ قاری پر ان کی اصلیت ظاہر ہوئے بغیر نہ رہتی۔

اودھ پنچ کی یہ خدمات بھی فراموش نہیں کی جاسکتیں کہ اس نے ہندوستان کے باشندوں کو سیاسی طور پر باشعور بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اہم سیاسی موقعوں پر اودھ پنچ عوام کا ترجمان بن جاتا اور سیاسی لیڈروں کی دو عملی کا پول کھول کر رکھ

دیتا تھا۔ "مولانا پیچ کی نوٹ بک میں گاندھی کے فاقے پر موقوف تھا ہنگامہ قوم" کے عنوان سے اودھ پنچ لکھتا ہے: "لیجئے صاحب جو ہم نے کہا تھا وہی ہوا۔ قانون شکنی کے پہلے التواء پر تو انتہا گیر لیڈروں نے صرف ناک بھوں چڑھائی تھی اور اب جو دوسری مرتبہ التواء کا اعلان ہوا تو؟

سیاسی شعور کو اجاگر کرنے اور عوام میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کے علاوہ خالصتاً ادبی نقطہ نظر سے بھی اودھ پنچ کی خدمات نا قابل فراموش ہیں۔ ادب اور صحافت میں طنز و مزاح کے فروغ کے علاوہ اردو زبان کی خدمت میں بھی اودھ پنچ پیش پیش رہا۔ اودھ پنچ کا دعویٰ ہے کہ اس نے زبان کی تصحیح کی طرف خاص توجہ دی ہے۔ سید حیدر عباس کی کتاب روح ادب پر تبصرہ کرتے ہوئے اودھ پنچ لکھتا ہے: "یہ مختصر کتاب مشتمل ہے بعض ایسے الفاظ کی تصحیح پر جنہیں عوام ہی نہیں خواص بھی استعمال کرتے ہیں۔ اودھ پنچ اٹھارہ انیس سال سے یہی خدمت انجام دے رہے رہا ہے مگر کسی نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا کہ یہ کام توجہ و قدر کے قابل ہیں یا قدح و اعراض کے لائق۔ بااین ہمہ دلی مدعا یہی تھا کہ لوگ اس طرف متوجہ ہو جائیں کیا معنی کہ زبان ہی ایک ایسی چیز ہے جس کے وسیلے سے دین و دنیا کے تمام مطالب ظاہر کیے جاتے ہیں۔ اگر وہی غلط ہوئی تو پھر دونوں جہان غلط" (۴۸) اودھ پنچ پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اس کی عبارت اکثر اوقات ابتذال اور فحاشی کی حدوں کو چھونے لگتی تھی۔ لیکن عوام کے اخلاق کی اصلاح کا اودھ پنچ کو خود خیال تھا۔ اس کا مجموعی رویہ اصلاح احوال ہی تھا۔ "فحش کیا ہے"؟ کے عنوان سے اودھ پنچ نے جو کچھ لکھا اس میں بھرپور معاشرتی طنز چھپی ہوئی ہے: "کابل میں کوئی سینما گھر نہ تھا بڑی مشکلوں سے نادر شاہ نے تصویریں دکھانے کی اجازت دی۔ مگر ساتھ ہی فلم کے طومار سے اتنے ٹکڑوں کے خارج کر دینے کی بھی تاکید کر دی جن میں عاشق و معشوق کی بوسہ بازی اور معاشقہ منقوش ہے بلکہ وہ حصص بھی جن میں دوسری بد اخلاقیوں کی گھاتیں یاروں کو چند بول خرچ کرنے پر با آسانی یاد ہو جاتی ہیں۔ انہوں نے بورڈ آف سنسر قائم کر دیا جو طومار کو اچھی طرح دیکھنے بھالنے کے بعد پاس کرے گا۔ افسوس کابل' دشمن تہذیب کابل' ابھی تک اس وحشت میں مبتلا ہے جس کا نام "غیرت" ہے۔ اسے ہندوستان کی طرف دیکھنا چاہیے جو یورپ کی ہر ایک گندی۔ اے توبہ مہذب چیز پر اندھوں کی طرح گر پڑتا ہے۔ جس کی خلوت اور جلوت میں اب کوئی فرق نہیں رہا۔ جس نے بڑے بڑے اہل قلم بھڑوے پیدا کر دیئے جو صرف ناچنے والے نہیں بلکہ اعلیٰ درجے کی فحبات کی تصویریں چھاپ چھاپ کے دنیا میں پھیلاتے اور پیٹ پالتے ہیں۔ قانون کی کتابوں میں فحش سے مراد وہ تصویر یا عبارت یا نقش یا فعل ہے جس کے معائینے سے ہیجان پیدا ہونے کے بعد انسان بد اخلاقی پر آمادہ ہو جائے۔ خدا جانے اس حد میں فلم آتی ہے یا نہیں

۔۔۔بہر حال قانونی کونسل سے التماس ہے کہ وہ "فحش" کی قانونی تعبیر سے مطلع فرمائے"(۴۹) اودھ پنچ کے موضوعات کے اس تفصیلی جائزے کے بعد ہمیں ڈاکٹر خورشید الاسلام کی اس رائے سے اتفاق کرنا ہی پڑتا ہے:

> "اودھ پنچ کے صفحات میں آپ کو موضوعات کی رنگارنگی الفاظ کی کثرت خیالات وجذبات کی بے جا فراوانی کمتر مسکراہٹوں اور بیشتر قہقہوں کی وہ طغیانی نظر آئے گی کہ الاماں اور ایسا معلوم ہوگا کی فطرت نے خزانوں کے در کھول دیئے ہیں اور یہ ساری دولت بے ضرورت اور بے خیال لٹائی جارہی ہے"(۵۰)

۴۔ سیاسی کارٹون کا آغاز

اردو کی مزاحیہ صحافت میں پہلی بار کارٹون کا آغاز کیا۔ اودھ پنچ کی ظرافت میں کارٹون کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ اگرچہ اس میں کارٹون "لندن پنچ" کی تقلید میں شائع ہونا شروع ہوئے تھے۔ بہر حال اودھ پنچ اردو کا پہلا اخبار تھا جس نے کسی خاص واقعہ کے مضحک پہلوؤں کو نمایاں کر کے پیش کرنے یا اپنے کسی حریف کو نیچا دکھانے کے لیے مغربی طرز پر کارٹون کو آغاز کیا۔ اس بناء پر فرقت کاکوروی لکھتے ہیں "لندن پنچ" کے کارٹون دیکھ کر انہوں نے مشرقی تہذیب اور کلچر کی روشنی میں نئے کارٹون بنوائے اس زمانے کا مشہور مصور رام بہادر تھا"(۵۱)

اودھ پنچ کے سرورق پر بھی کارٹون بنے ہوتے تھے۔ یہ کارٹون ہو بہو "لندن پنچ" کی تقلید میں شائع ہوتے تھے۔ اندر کے صفحات میں کبھی پورے صفحے پر ایک ہی کارٹون ہوتا یا کبھی ایک سے زائد کارٹون بھی پورے صفحے پر ہوتے۔ یہ کارٹون یا تو "لندن پنچ" سے جوں کے توں نقل کر لیے جاتے یا پھر تھوڑی بہت ترمیم کے بعد شامل اشاعت کیے جاتے اودھ پنچ کا کارٹونسٹ ایڈیٹر کے مشورے اور ہدایت کے مطابق کارٹون سکیچ کرتا "مسٹر پنچ" کی شکل جو اودھ پنچ کے صفحات پر نظر آتی ہے ہو بہو "لندن پنچ" کا چربہ نظر آتی ہے۔ بہر حال اودھ پنچ کی اہمیت کارٹون صحافت کی اولیت کی وجہ سے ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسرے مزاحیہ اخبارات اور رسائل نے بھی اپنی اشاعتوں میں کارٹون شائع کرنا شروع کر دیئے جو ایک روایت کی شکل میں مربوط ہو کر موجودہ عہد تک صحافت کا جزو لاینفک بن گئے ہیں اور آج ہمیں ہر اخبار اور رسالے میں خواہ وہ مزاحیہ ہو یا سنجیدہ ہو۔ کارٹون اور کیری کیچرز نظر آتے ہیں۔

۵۔ اودھ پنچ کی اشاعت کا مقصد اور اس کے اثرات

منشی سجاد حسین کی ادارت میں نکلنے والا یہ اخبار طنز و ظرافت کا بہترین شاہکار تھا۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ طنز و مزاح کے فروغ کے لئے بہترین زمانہ وہ ہوتا ہے، جب سماج مختلف طبقوں میں بٹ جاتا ہے، بنیادی اقتدار میں کش مکش شروع ہو جاتی ہے۔ اکثریت کسی خاص روش کی مخالف بن جاتی ہے، سماجی، معاشی، مذہبی اور سیاسی زندگی میں بے چینیاں پیدا ہونے لگتی ہیں اور نئی تہذیب و کلچر کی آمد سے قدیم و جدید میں ردوبدل اور مخالفت و موافقت کے جھگڑے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ایسے میں ناپسندیدگی اور رضامندی طنز و ظرافت کو جنم دیتی ہے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ چناچہ ظرافت کے لئے مناسب وقت و فضا نے اس اخبار کو خوب چمکایا۔

دراصل اودھ پنچ کا دور طنز و مزاح کا دور تھا۔ عوام کے مزاج و مذاق میں ظرافت اور طبعی اس طرح بس گئی تھی کہ سنجیدہ مضمون نگار اور شعراء بھی عوام نے تقاضوں سے مجبور ہو کر ظرافت نگاری کی طرف مائل ہو گئے تھے لیکن کچھ ایسے بھی تھے جن کا خلقی جوہر شوخی اور ظرافت نہ تھا بلکہ رسماً اس میدان میں آئے تھے ایسے لوگوں کی کوششوں سے کھوکھلا اور بے کیف مزاح پیدا ہوا اور ظرافت و خوش طبعی نے اخلاق و آداب اور تہذیب و تمدن کا دامن چھوڑ کر فحش نگاری اور طعن و تشنیع کا رنگ اختیار کر لیا۔ لیکن یہاں ہدایات واضح کر دینی ضروری ہے کہ اودھ پنچ نے صرف طعن و تشنیع اور پھکڑپن کی حیثیت کا ہی مزاح نہیں پیش کیا بلکہ مزاح کے بڑے دلچسپ نمونے پیش کئے اس کے علمبرداروں میں کچھ ایسے لوگ تھے جو خود بھی قہقہہ لگاتے اور دوسروں کو بھی قہقہہ لگانے پر مجبور کرتے اور کچھ ایسے افراد تھے جو خود مسکراتے تک نہ تھے لیکن ان کے کارناموں سے سننے والے ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ ڈاکٹر خورشید السلام اس کی ظرافت کے بارے لکھتے ہیں:

> گو کہ اودھ پنچ کی ظرافت ثقیل مگر نمک سے خالی نہیں۔ کہیں کہیں عریاں ہے مگر پھر بھی ناگوار نہیں۔ الفاظ کی بازی گری ہے لیکن اس میں فطری روانی بھی ہے۔ وہ قہقہوں سے فروغ پاتی ہے لیکن بدسلیقہ نہیں۔ اس کا طنز تیز ہے مگر زہرناک نہیں، اس میں یکسانیت ہے مگر ہر چار قدم کے بعد فضا کچھ اس طور پر بیدار ہوتی ہے جیسے اندھیرے میں یک بہ یک جگنو چمک اٹھتے ہوں۔(۵۲)

اودھ پنچ سے قبل طنز و مزاح میں شوخی کا فقدان تھا کیونکہ اس دور تک کوئی نمایاں سیاسی شعور بیدار نہیں ہوا تھا۔ ایسے میں اودھ پنچ نے وقت کے تقاضوں کا احساس کر کے ایک طرف مشرقیت کی پرانی اور غلط روایتوں کی طرف سے منھ موڑا اور دوسری طرف مغرب کی نئی تہذیب کی مخالفت کی۔ بہر کیف یہ اس عہد کا آئینہ دار ہے جب مغربیت کا سیلاب

مشرقیت کے ہر اب و رنگ کو اپنے ساتھ بہائے لئے جا رہا تھا۔ اودھ پنچ نے طنز و مزاح کی لوٹ لیکر معاشرے کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔

اودھ پنچ نے لکھنوی تہذیب و معاشرت کی مذاق اور پر کشش عکاسی کمال خوبی کے ساتھ کی ہے۔ محرم، چہلم، شب برات، ہولی، دیوالی بسنت کے میلے، عیش باغ کے میلے، رقص و سرور کی محفلیں، مشاعرے، عدالت کی روبکاریاں، مرغ بازی اور بٹیر بازی کے ہنگامے اور اکشن کے معرکے جیسے مضامین اس میں شائع ہوتے تھے۔ اس میں ساقی نامے، بارہ نامے، دوہے، ٹھمریاں، غزلیں اور رباعیاں اور دیگر اصناف سخن میں طنز و مزاح میں پیش کیا جاتا، موسم کی تبدیلیاں ایسے ظریفانہ انداز میں دکھائی جاتیں کہ پڑھنے والے ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ روز مرہ کے چھوٹے چھوٹے چٹکلے اور لطیفے بھی اس کی شان تھے اس کی زبان لکھنؤ کی بول چال کی زبان تھی اور اس کے سبھی مضمون نگار زبان کے استعمال میں کامل تھے جس کی وجہ سے اُردو میں ظریفانہ ادب کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ سیاسی اعتبار سے اودھ پنچ بڑا ترقی پسند تھا۔ وہ ہنسی ہنسی میں انگریزی راج کے تشدد اور اقتصادی لوٹ مار پر شدید چوٹیں کرتا تھا۔ قوم پرستی اور قومی یکجہتی کا علمبردار ہونے کی وجہ سے انگریزی تہذیب و معاشرت کی خوب دھجیاں اڑاتا تھا۔ اس کے مطابق ہندوستانی معاشرے میں پیدا شدہ ساری خامیاں مغربی تہذیب کی دین تھیں۔ اس لئے اس میں مغربی تہذیب و معاشرت کے خلاف بڑی جلی کٹی باتیں ہوئیں جو شائع ہوتے ہی لوگوں کی زبان پر آ جاتیں لوگ ہفتوں بلکہ مہینوں اس لطیفوں چٹکلوں، اشعار، اور فقروں سے چٹخارے لیتے اور قہقہے لگاتے۔

اودھ پنچ انگریزیت کے علاوہ سرسید تحریک اور حالیؔ کی نئی شاعری کا بھی بڑا نقاد تھا یہ سرسید تحریک کی نہ صرف مخالفت کرتا بلکہ سرسید کے نورانی دماغ سے جو مذہبی اصلاح کی شعاعیں نکلتی تھیں ان پر بھی خاک ڈالنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس نے علی گڑھ کالج کو مذہبی کا مرکز قرار دے کر اس کے بانی کو سر نیچر کا خطاب دیا اور نیچر نے مذہب کا مضحکہ اڑانے میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا۔ اودھ پنچ نے زبان و شاعری کی اصلاح کے چند کارنامے انجام دیئے۔ پہلے کارنامے کے تحت اودھ پنچ نے فسانہ آزاد پر اعتراضات شائع کئے، خالص اعتراض یہ تھا کہ جو بیگماتی زبان اس میں استعمال کی گئی ہے وہ محلات کی زبان نہیں بلکہ ماماؤں اور منحلائیوں کی زبان ہے۔ اس کی مخالفت و موافقت میں عرصے تک مضامین شائع ہوتے رہے۔ دوسری کارنامے کے تحت اودھ پنچ نے مولانا الطاف حسین حالی کی شاعری پر حملہ کیا۔ حالی سے دو اعتراضات تھے ایک تو یہ کہ اُن کی شاعری کا مفہوم ہی غلط ہے جس کی وہ شاعری سمجھتے ہیں۔ محض قافیہ پیمائی اور فطری شاعری کی لطافت اور رنگینی سے خالی ہے دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اُنہوں نے اپنے مقدمے میں مصنوی ا اور خلافِ نفرت شاعری کی

جس قدر مثالیں دی ہیں اُن کا زیادہ تر حصہ لکھنؤ کے شعراء کے کلام سے لیا گیا ہے اُن اعتراضات کی بوچھار بھی ایک مدت تک جاری رہی۔

تیسرا ہنگامہ داغ کی شاعری کے متعلق تھا۔ اودھ پنچ کے ظرافت نگاروں کے دنوں میں لکھنؤ اور دہلی کے رنگ کی قدیم رقابت موجود تھی۔ اس لئے وہ داغ کی شاعرانہ عظمت کو کبھی قبول نہ کر سکے۔ دوسری طرف داغ کے شاگرد اپنے استاد کی شاعری پر تمام لکھنؤ کو قربان کر چکے تھے۔ شاگردوں کی بد مذاقی کا خمیازہ استاد کو اٹھانا پڑا۔ اودھ پنچ کے صفحات سے اعتراضات کی چنگاریاں عرصہ دراز تک اُڑائیں۔ اس بارے میں چکبست کہتے ہیں۔ ان اعتراضات سے داغ کی شہرت میں فرق نہ آیا مگر تھوڑے زمانے تک ہنسنے ہنسانے کا مشغلہ قائم رہا۔

اودھ پنچ کا آخری یادگار معرکہ گلزار نسیم کا مباحثہ ہے۔ مولانا شرر نے گلزار نسیم کی زبان و شاعری پر اعتراضات شائع کئے اور کہا کہ مثنوی اصل میں آتش کی تصنیف ہے اور نسیم کا نام فرضی ہے۔ اودھ پنچ نے جواب دیا کہ اگر مثنوی آتش کی ہے تو اس میں زبان و محاورے کی شرمناک غلطیاں کیونکر نظر آتی ہیں۔ جب شرر اس جواب سے مطمئن نہ ہوئے تو اودھ پنچ کی بجھتی ہوئی چنگاری ایک بار پھر بھڑک اٹھی۔ گلزار نسیم کا قصہ تو درکنار رہا شرر کی زبان دانی اور نثر نگاری پر اعتراضات شائع ہونے لگے۔

اودھ پنچ کی اشاعت سے اُردو ادب کو بہت فائدہ پہنچا۔ اُردو نظم میں رعایت لفظی اور ضلع جگت کو ہی شاعری کا اصل جوہر سمجھا جاتا تھا۔ اودھ پنچ کے شعراء عوام کے مذاق و مزاج کو سمجھتے ہوئے تھے اس لئے انھوں نے شاعری میں نئے خیالات کو نئے انداز میں نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا۔ اس سے اُردو نثر نگاری کو بھی ایک نئی راہ ملی۔ نثر پر جو تصنع اور تکلف کا پردہ پڑا تھا ختم ہوا۔ کیونکہ اس سے قبل اردو نثر میں وحیب علی بیگ سرور کا رنگ رواں تھا۔ غالب اپنے خطوط کے ذریعے اس میں نمایاں تبدیلی لائے اور اودھ پنچ کے نثر نگاروں نے تمام نثری کارنامے پیش کر کے اسے قابلِ تعریف بنایا۔ آج اُردو نثر میں جو پاکیزہ اور سلیس روش جاری ہے اس کی ایجاد اودھ پنچ سے ہی ہوئی ہے اس بات کا اعتراف کشن پرساد کول ان الفاظ میں کرتے ہیں:

گھروں سے کھینچ کے کشتوں پہ کشتے ڈالے ہیں
نہ گور ہے نہ کفن ہے نہ رونے والے ہیں

اودھ پنچ سے اُردو طنز و مزاح میں ایک نئے سباب کا آغاز ہوتا ہے اس سے قبل یہ ہجو، ہزل، پھکڑ، پھبتی، فاشی اور ابتدال کی صورت میں ہجویات کی لیکن اصل کارنامہ اودھ پنچ نے انجام دیا، اس کے مزاح نگاروں نے آزادانہ ڈھنگ سے مزاح نگاری کے سارے جوہر پیش کیے اور طبیعت کی شوخی و ذہنی فکر سے ظرافت کو پروان چڑھایا۔ اس طرح ظرافت سے جو فروغ ملا، اسی میں بعد کے مزاح نگاروں نے شوخی کو کم کر کے ادبی رنگ کا اضافہ کیا، زبان و بیان کو نکھار اور متانت، سنجیدگی کی ملاوٹ کر کے دورِ جدید کے لائق بنایا آج دورِ جدید میں طنز و مزاح کو ایک مستقل صنف کی حیثیت سے جانا جاتا ہے اس کا سہرا بھی اودھ پنچ کو ہی جاتا ہے یعنی طنز و مزاح کو فروغ دینے اور جدید تصور کو پیش کرنے میں اودھ پنچ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

اودھ پنچ کا اصل مقصد قومی اصلاح تھا اس کی اشاعت سے قوم میں بیداری پیدا ہوئی۔ اس نے معاشرے کی خامیوں کو ہدف نظر بنا کر اس طرح پیش کیا کہ اس سے قوم و معاشرے کی اصلاح ہو۔ حاصل یہ ہوا کہ اس کی طنز و ظرافت کے ذریعے تمام ادبی، ثقافتی، معاشرتی، مذہبی اور سیاسی مسائل حل ہوئے۔ اُردو صحافت میں بھی یہ سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی صحافت نے اُردو ادب کے فروغ اور ہندوستانی قوم کی فلاح و بہبود کے لئے جو کارنامے انجام دیئے وہ بھلائے نہیں جاسکتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد صغیر عالم خاں کہتے ہیں:

> "ایک رسالہ اودھ پنچ ایسا تھا جس نے ادبی، معاشرتی، معاشی، اخلاقی اور آگے چل کر سیاسی معاملات میں بھی رہنمائی کی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ طنز و مزاح کے سنجیدہ اسلوب کا اُردو میں اضافہ کر دیا تھا۔" (۵۴)

۶۔ تحریکِ آزادی میں اودھ پنچ کا کردار

اودھ پنچ معاشرت میں قدامت اور سیاست میں جدیدیت کا قائل تھا۔ اودھ پنچ نے اپنی پالیسی کے ذریعے ملک و قوم کی خدمات ایسے وقت میں انجام دیں جب ہندوستان کے حریت پسند عوام اپنی آزادی اور تہذیب کی حفاظت کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔ آسمان سیاست پر بے چینی اور انتشار کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اودھ پنچ نے ایسے ہی وقت میں ملک کے عصری تقاضوں کو پورا کیا۔ اس کے مدیر منشی سجاد حسین نے ملک کی آزادی میں حصّہ لیا۔ اور ملک کی خدمت اور تحفظ کے لئے متعدد سیاسی مضامین لکھے۔ منشی سجاد حسین بذاتِ خود کانگریسی ذہن رکھتے تھے اور اس دور میں جنم لے رہے سیاسی مسائل کو پیش کرنے کے لئے انڈین نیشنل کانگریس کی حمایت میں کچھ نہ کچھ سپردِ قلم کرتے رہتے

تھے۔وزیر آغا اودھ پنچ کے عہد کے سیاسی تناظر کو پیش نظر رکھتے ہوئے رقمطراز ہیں۔اودھ پنچ اپنے زمانے کی انقلابی تبدیلیوں کے خلاف رد عمل کے طور پر نمودار ہوا تھا۔یہ وہ زمانہ تھا کہ ۱۸۵۷ کے ہنگامے نے زندگی سے شگفتگی اور آسائش چھین لی تھی اور اس کے چہرے پر سنجیدگی کی تیوریاں پیدا کر دی تھیں۔سیاسی، سماجی اور ادبی ماحول میں سنجیدگی اور انہماک کا دور دورہ تھا۔انتہائی پستی اپنے جوبن پر تھی اور ایسا سیاسی معمول ہو تا تھا کہ گویا ہر شخص اپنے طوفانی بہاؤ کے ساتھ ایک تنکے کی طرح بہتا چلا جائے گا۔ایسے میں اودھ پنچ نے فرد کو روک کر اس کے ہاتھ میں آئینہ تھما دیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ ایک لمحہ کے لئے اس میں اپنی صورت دیکھنے کی تکلیف گوارا کرے۔جب اسے آئینے میں ایک انتہائی سنجیدہ چہرہ مضحکہ خیز حرکات کرتا نظر آیا تو فرد کو ندامت بھی محسوس ہوئی اور اس کے جوش و انہماک میں اعتدال پیدا ہو گیا۔چنانچہ اودھ پنچ نے قوم کے طوفانی دریا کو کناروں سے چھلکنے اور یوں ہی تباہی اور بربادی پھیلانے سے بروقت روکنے کی انتہائی کوشش کی اور اس دریا سے طنز و ظرافت میں دھیما پن پیدا کرنے کے قابلِ رشک کام سر انجام دیا۔(۵۵)وزیر آغا اس سلسلے میں مزید لکھتے ہیں۔

> اودھ پنچ کے ذریعہ تاریخی کام سجاد حسین کی مساعی کا رہین منت ہے۔سجاد حسین خود بلا کے لکھنے والے تھے اور وہ آج بھی حاجی بغلول، طرحدار لونڈی، اور احمق الدین کے مصنف کی حیثیت سے مقبول خاص و عام ہیں۔ان تصانیف کے علاوہ انہوں نے انتہائی دلچسپ اور طنزیہ انداز میں لکھے ہیں۔علاوہ ازیں اودھ پنچ میں لوکل اور مواقفت کے زیر عنوان ان کے جو مضامین چھپے تھے۔ان میں ملک کے سیاسی، موسمی اور سماجی حالات پر وہ بڑی دلیری سے طنز کرتے تھے۔(۵٦)

سجاد حسین نے متعدد سیاسی اور سماجی مضامین سپرد قلم کئے نیز ان مضامین میں اپنے عہد کے سیاسی مسائل پیش سے بھی بحث کی۔سجاد حسین کے مضامین میں انڈے بچے والی چیل چلہاڑ عوام و خواص میں از حد مقبول ہوا۔اس کے علاوہ کھلے خط سربستہ مضامین نیچر کا مارشل لاء مٹی خراب خلق میں مہر و وفا کی ہے، ہڈیوں پر میری لڑتے تھے، جھنجھٹ کا یہ مزا ہے کہ ہوں بھی وہ بے قرار، پروفیسر اودھ پنچ کے پولیٹیکل اقلیدس، بے مار کی توبہ، ٹیکس کی دُم، ابرِ کامل اور سرکار انگلیشیہ، منہ لگائے ڈومنی گائے تال بے تال، یہ مبارک جنگ کا چندہ ہے۔پولیٹیکل باغ و بہار یعنی قصہ چہار درویش، قانون اور اس کا دم ترمیم وغیرہ مضامین خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

سجاد حسین کانگریس کے حامی تھے اور آخر تک کانگریس کے علم بردار رہے۔اس لئے انہوں نے طنز و مزاح کے پیرائے میں برطانوی حکومت کی کوتاہیوں اور بدعنوانیوں کا پردہ ایسے دور میں فاش کیا جبکہ سیاسی رہنماؤں کے لئے لب کشائی بھی

مشکل تھی۔ انہوں نے انگریزوں کی عمل داری کی ان پالیسیوں کے خلاف لکھا جو عوام کے منافی تھیں۔ یہ مضامین طنز و مزاح کے پردے میں پیش کئے گئے تھے اس لئے قانون کی گرفت میں بھی نہیں آسکے اور استہزار کا پہلو بھی برقرار رہا۔ ان مضامین میں پہلی بار سیاست کو طنز و مزاح کا موضوع بنا کر پیش کیا گیا۔ منشی سجاد حسین کا مضمون انڈے بچے والی چپل چلہاڑ اس دور کا تخلیق کیا ہوا ہے جب انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے ایک طبقہ پیدا ہو چکا تھا۔ لہٰذا سجاد حسین کی مخالفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"بھلا یہ کیوں کر ممکن ہے بی کانگریس صاحبہ لکھنؤ مرحوم میں جان تازہ پھونکنے، چہرے
کی رونق بڑھانے خراماں خراماں تشریف لائیں اور بی اینٹی صاحبہ چپ شاہ کی بالکی نمو ہی
منہ میں گھنگھنیاں بھرے بیٹھی رہیں۔ اجی تو یہ کیجئے بولیں اور بیچ کھیت بولیں۔" (۵۷)

سجاد حسین طنز و مزاح کے پیرائے میں کچھ کہہ جاتے ہیں اور اپنے خیالات کا اظہار بھرپور انداز میں کر دیتے ہیں۔ سجاد حسین کے خطوط بھی سیاسی اعتبار سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ خطوط انہوں نے بحیثیت مدیر اودھ پنچ مختلف اوقات میں مختلف افسران بالا کو تحریر کئے تھے، خط کا ایک حصہ ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی پنڈت جوالا پرشاد برق ہیں۔ انہوں نے طنز و مزاح اور تحریف کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے جوالا پرشاد برق کو اُردو ادب ہور لیس اور چاسر کہا ہے۔ پنڈت جوالا پرساد برق کے بیشتر تراجم ملتے ہیں۔ انہوں نے چند ایسے مضامین بھی لکھے جن میں سیاسی اور ملکی مسائل پر سیر حاصل بحث مل جاتی ہے۔ اُن کا ایک مضمون البرٹ بل بطور خاص قابلِ توجہ ہے۔

طنز و مزاح نگاروں میں نواب سیّد محمود آزاد کا نام بڑی خصوصیت کا حامل ہے۔ وہ اپنے تلخ تجربات کو شوخی و ظرافت کے پیرائے میں پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے خطوط میں مغربی تہذیب اور ثقافت کا مضحکہ اڑایا ہے۔ انہوں نے تحریفات کے انداز میں ایک ڈکشنری بھی تحریر کی تھی جس میں انہوں نے ظریفانہ پیرائے میں بعض تلمیحات کے معنی بتائے ہیں۔ اودھ پنچ کے بعد طنز و مزاح کا عبوری دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور کے مزاح نگاروں میں مہدی افادی، محفوظ علی بدایونی، نیاز فتح پوری، سجاد یلدرم، سلطان حیدر جوش، ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، سجاد انصاری، قاضی عبدالغفار، ملّا رموزی، وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔

۷۔ اُردو ادب و صحافت میں طنز و مزاح کا باقاعدہ آغاز

اُردو صحافت میں طنز و مزاح کا رواج اودھ پنچ کے اجراء سے ہوتا ہے جو ۱۸۵۷ کا واقع ہے۔ تاہم اس سے قبل بھی اُردو اخبارات میں تنقید، رائے زنی اور کہیں کہیں طنز کی جھلکیاں ضرور نظر آجاتی ہیں۔ مثلاً اُردو اخبار کے بارے میں جسے ۱۸۵۷ میں مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی باقر نے دہلی سے جاری کیا تھا۔ بدر شکیب صاحب لکھتے ہیں: "اس اخبار میں انگریزی عملداری پر سنجیدہ تنقید کی جاتی تھی جو بعض اوقات طنز کی صورت اختیار کر لیتی تھی جس سے اس زمانے کے حالات اور انگریز دشمنی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔"(۵۸) اس طرح مولانا عبدالمجید سالک رقم طراز ہیں:

> ۱۸۵۷ کے ہنگامے سے پہلے بھی اور بعد میں بھی جتنے اخبارات نکلے قومی شکایات اظہار، حکومتی اقدامات کی تنقید، خبروں کی بہم رسانی اور پڑھنے والوں کی علمی اور ثقافتی خدمت میں برابر مصروف رہے۔"(۵۹)

لیکن بدر شکیب اور مولانا سالک کے ان بیانات سے قطع نظر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بہ حیثیت مجموعی اس زمانے کی اردو صحافت میں طنز و مزاح کے ان شوخ رنگوں کا قطعی فقدان ہے جو بعد ازاں اودھ پنچ کے زمانے میں نمودار ہو کر مقبولِ خاص و عام ہوئے اس کی دو ایک نمایاں وجوہ ہیں۔ ایک تو یہی کہ اس زمانے میں ابھی ہندوستان میں کوئی نمایاں سیاسی شعور بیدار نہیں ہوا تھا اور واقعات و تحریکات سے متعلق ایک عام ہندوستانی کے ردِ عمل میں وہ شدت موجود نہیں تھی جو بعد ازاں مغربی تعلیم کے باعث اور انگریزی عملداری کے خلاف سرعت سے پھیلتی ہوئی سیاسی بے چینی کی وجہ سے پیدا ہوئی اور دوسری یہ کہ زمانے کے اُردو نثر پر تکلف اور تصنع کا اس درجہ تسلط تھا کہ طنز و مزاح کے اُبھرنے اور رواج پانے کے بہت کم امکانات تھے۔

انیسویں صدی کے نصف اوّل میں فرنگ کے خلاف شمالی ہند کے لوگوں کا کوئی نمایاں ردِ عمل تاریخ میں نہیں ملتا تاہم اس دور میں معاشرے کے پر سکون سطح کے نیچے سیاسی اور سماجی بیداری کا جو کوہ آتش سلگ رہا تھا وہ اس صدی کے نصف آخر میں دو بڑے ہنگاموں کی صورت میں نمودار ہوا۔ ان میں سے ایک ہنگامہ ۱۸۵۷ کے غدر کے نام سے مشہور ہے اور ایک مٹتی ہوئی سلطنت کی آخری کروٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرا ہنگامہ آزادی کی وہ پر امن جدوجہد ہے جو ایک نمایاں، سیاسی اور سماجی بیداری کی پیداوار تھی اور جس کا سب سے بڑا مظہر وہ اخبار تھا جس نے اودھ پنچ کے نام سے نہ صرف اجنبی حکومت اور اجنبی تہذیب کو ہدف نظر بنانے کی سعی کا آغاز کیا بلکہ جس نے عام سوشلی اور ملکی معاملات کے بارے میں بھی اپنی آراء کو بڑے بیباکانہ انداز میں الفاظ کا جامہ پہنایا۔

اُردو صحافت میں اودھ پنچ کی اہمیت کی تین وجوہ ہیں۔ پہلی تو یہ کہ اودھ پنچ نہ صرف اُردو پہلا مزاحیہ اخبار تھا بلکہ اس نے پہلی بار اُردو میں مغربی طنز و مزاح کے حربوں کو بھی استعمال کیا دوسری یہ کہ سیاسی اور مجلسی مسائل پر بھرپور طنز کا آغاز اودھ پنچ سے ہی ہوا۔ اودھ پنچ سے قبل محض نکتہ چینی یا ایک حد تک تنقید ضرور موجود تھی لیکن ظرافت کے بیشتر عناصر کا افسوس ناک حد تک فقدان تھا۔ تیسری یہ کہ اودھ پنچ وہ پہلا اُردو اخبار تھا جس نے کسی خاص واقعے کے متعلق اپنی رائے دینے یا کسی چیز کے مضحک پہلو کو نمایاں کر کے پیش کرنے یا محض حریف کو ذلیل کرنے کے لئے کارٹون کا استعمال بھی کیا۔ البتہ صحافتی مزاح کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو طعن و تشنیع کی وہ روِش جسے اودھ پنچ نے خاص طور پر اپنایا اور جس کی مدد سے اس اخبار نے معاصرین کی پگڑیاں اچھالنے، اُنہیں ذلیل کرنے اور بعض اوقات دلائل کی بجائے محض ابتذال اور پھکڑ پن سے کام لینے کی کوشش کی، خاص قابلِ اعتراض روِش تھی۔ اس قدر کہ آج بھی اودھ پنچ کی پیشانی پر ایک بدنما دھبے کی طرح نظر آتی ہے۔

اودھ پنچ کے روحِ رواں سجاد حسین تھے اُردو صحافت میں طنز و مزاح کا باوا آدم کہنا چاہیئے۔ ان کی طبیعت میں بلا کی شوخی تھی اور وہ اودھ پنچ کے صحافت میں لوکل اور موافقت زمانہ کے عنوان سے سیاسی اور سماجی معاملات پر بڑے دلچسپ طنزیہ انداز سے بحث کرتے تھے۔ سیاسی زندگی میں وہ کانگریس کے ہم نوا اور سرسید احمد خاں کی تحریک کے مخالف تھے۔ اودھ پنچ کو انہوں نے اپنے سیاسی مسلک کی ترویج و اشاعت کے لئے وقف کر لیا تھا۔ اتفاق سے بعض ایسے معاون بھی مل گئے جن کے قلم سے تیر اور یہ سارا گروہ مل کر اُردو صحافت میں ایک ایسی بلند آواز کی صورت اختیار کر گیا جو نہ صرف ملک کے کونے کونے میں سنی گئی بلکہ جس نے سیاسی مسائل پر بھی اپنے اثرات مرتسم کئے۔ اس ضمن میں اس بات کا اعادہ مقصود ہے کہ وہ اودھ پنچ کی یہ آواز کچھ ضرورت سے زیادہ سخت اور تیز تھی۔ اور کئی بار اس کے باعث ملک کے تعلیم یافتہ طبقے کا ایک حصہ ابتذال اور پھکڑ پن میں بھی مبتلا ہوا۔ اس زمانے میں شاید زیادہ لوگوں کو اس ظریفانہ لہجے میں کوئی ایسی قابلِ اعتراض بات نظر نہ آئی ہو لیکن اب کہ حالات پر وقت کی گرد جم چکی ہے اور یہ قصے ایک داستان پارینہ کا درجہ اختیار کر چکے ہیں۔ نیز وہ جذباتی کش مکش بھی باقی نہیں جس سے اس لہجے کو تحریک ملی تھی۔ یہ روِش یقیناً صحافتی مزاح کے معیار سے پست نظر آتی ہے۔ ابتذال اور پھکڑ پن اور طعن و تشنیع کی اس روِش سے قطع نظر مسائل پر سجاد حسین کی بحث کا ظریفانہ انداز ایک تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔

اودھ پنچ اپنی طرز کا پہلا اخبار تھا اور اس کی مقبولیت کا اندازہ محض اس بات سے ممکن ہے کہ اخبار ایک باقاعدہ تحریک کا پیش رو ثابت ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستان بھر میں پنچی اخبارات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ ۱۸۵۷ میں پنجاب پنچ نکلا۔ بنگال پنچ اور دہلی پنچ ۱۸۸۰ میں ظاہر ہوئے۔ باوا آدم پنچ اور راجپوتانہ پنچ نے ۱۸۸۱ میں جنم لیا۔ سرپنچ ۱۸۸۳ میں بمبئی سے نکلا۔ ۱۸۸۵ میں جعفر زٹلی اور دکن پنچ نکلے۔ ۱۸۸۶ میں سرپنچ نے میرٹھ سے سر نکالا اور ۱۸۸۷ میں چلتا پرزہ اور ملّا دوپیازہ نمودار ہوئے۔ اُن کے علاوہ ظریفانہ رنگ میں کئی اور پرچے بھی نکلے جن میں اخباروں کا قبلہ گاہ، بانکی پور پنچ، پاٹے خاں، شیخ چلّی، اور البیلا خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اسی زمانے میں گورکھ پور سے ریاض خیر آبادنے ریاض الاخبار نکالا۔ فتنہ اور عطر فتنہ بھی اس کے ساتھ ہی نکلا کرتے تھے۔ فتنہ میں مختصر نثر کے شوخ اور ظریفانہ مضامین ہوتے تھے، اور عطر فتنہ میں اس زمانے کے شعراء کا منتخب کلام۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ ان میں سے کسی بھی اخبار کو مقبولیت نصیب نہ ہو سکی جو اودھ پنچ کو حاصل تھی۔

حوالہ جات

۱۔ رشید امجد، ڈاکٹر، مرتب، مزاحمتی ادب اُردو ، اکادمی ادبیات پاکستان ، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۴۸

۲۔ http://daanish.pk/3245/ (مورخہ: ۱ فروری ۲۰۱۹ء بوقت ۸:۳۳ رات)

۳۔ احمد جاوید، تیری دنیا کا افسانہ

۴۔ محمد اکرم، شیخ، رودکوثر ، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۵۷ء، ص ۶۰۲

۵۔ فتح محمد ملک، ''خیال کا خوف'' مشمولہ: تعصبات، مکتبہ فنون لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۳۵

۶۔ احمد خان، سرسید، اسباب بغاوت ہند، مسلم یونیورسٹی پبلشرز، علی گڑھ، ۱۹۵۸ء، ص ۲۷

۷۔ حسن عسکری، محمد، ''ہمارا ادبی شعور اور مسلمان'' مشمولہ: انسان اور آدمی، مکتبہ جدید، لاہور، ۱۹۵۳ء، ص ۱۹۳

۸۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، فسانہ آزاد ایک تنقیدی جائزہ، اردو رائیٹرس گلڈ، الہ آباد، ۱۹۴۰ء، ص ۹

۹۔ محمد زکریا، ڈاکٹر خواجہ، اکبر الہٰ آبادی تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

۱۰۔ حسن عسکری، محمد، ''ہمارا ادبی شعور اور مسلمان'' مشمولہ: انسان اور آدمی، مکتبہ جدید، لاہور، ۱۹۵۳ء، ص ۱۶۴

۱۱۔ ایضاً ص ۱۶۵

۱۲۔ اودھ پنچ، لکھنو، شمارہ ۱۵، ص ۵۳

۱۳۔ رشید احمد صدیقی، طنزیات و مضحکات، قومی کونسل برائے فروغ اُردو، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء، ص ۲۳

۱۴۔ عبد السلام خورشید، ڈاکٹر، فن صحافت، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۴۴ء ص ۱۸

۱۵۔ رشید احمد صدیقی، طنزیات و مضحکات، قومی کونسل برائے فروغ اُردو، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء، ص ۱۰۰

۱۶۔ رؤف پاریکھ، اُردو نثر میں مزاح نگاری، انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی، ۱۹۸۹ء، ص ۱۰۷

۱۷۔ اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر، اردو نثر میں طنز و مزاح، بیت الحکمت، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۹۸

۱۸۔ اودھ پنچ، لکھنو، شمارہ ۱۸، ۱۹۶۷ء

۱۹۔ ممتاز حسین جونپوری، ''منشی سجاد حسین'' مشمولہ: نقوش شمارہ نمبر ۵۹، ادارہ فروغ اُردو ایبک روڈ، لاہور، اکتوبر ۱۹۰۶، ص ۴۴

۲۰۔ ممتاز حسین جونپوری، ''منشی سجاد حسین'' مشمولہ: نقوش شمارہ نمبر ۵۹، ادارہ فروغ اُردو ایبک روڈ، لاہور، اکتوبر ۱۹۰۶، ص ۴۵

۲۱۔ مصباح الحسن قیصر، اردو طنز و ظرافت اور منشی سجاد حسین، امین آباد پارک، لکھنؤ، ۱۹۷۸ء، ص ۷۹

۲۲۔ محمد زکریا، ڈاکٹر خواجہ، اکبر الہ آبادی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۱۵

۲۳۔ اکبر الہ آبادی، نامہ بنام اودھ پنچ، مشمولہ: اودھ پنچ، لکھنؤ، ۴ مئی ۱۸۷۸ء، ص ۳

۲۴۔ رشید احمد صدیقی، طنزیات و مضحکات، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی ۱۹۹۳ء، ص ۷۹

۲۵۔ ایضاً ص ۷۶

۲۶۔ بابو سکینہ، رام، تاریخ ادب اردو گلوب پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۵۲۰

۲۷۔ چکبست لکھنوی، مضامین چکبست، امین آباد، لکھنؤ، ص ۱۹

۲۸۔ اودھ پنچ، لکھنؤ، اگست ۱۸۷۸ء، ص ۳۵۷

۲۹۔ نقوش، لاہور، جنوری ۱۹۵۹ء، ص ۲۵۵

۳۰۔ چکبست لکھنوی، مضامین چکبست، امین آباد لکھنؤ، ص ۶۰

۳۱۔ پرشاد کول، کشن، اودھ پنچ کے نورتن، مشمولہ: علی گڑھ میگزین طنز و ظرافت نمبر، ۱۹۵۲ء، ص ۵۶

۳۲۔ عبدالودود، قاضی، چند اہم اخبارات و رسائل، ادارہ تحقیقات اُردو، پٹنہ، ۱۹۹۳ء، ص ۶۲

۳۳۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو ادب میں طنز و مزاح، ایجو کیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۰ء، ص ۲۵

۳۴۔ اودھ پنچ، لکھنؤ، جلد ۱۸ نمبر ۱۹۲۳ء جولائی، ص ۱۹

۳۵۔ اودھ پنچ، لکھنؤ، جلد ۱۸ نمبر ۱۹۲۳ء اگست، ص ۲

۳۶۔ اودھ پنچ، لکھنؤ، جلد ۱۸ نمبر ۱۹۲۳ء دسمبر، ص ۲۳

۳۷۔ اودھ پنچ، لکھنؤ، جلد ۱۹ نمبر ۱۹۲۳ء جنوری، ص ۱۰

۳۸۔ اودھ پنچ، لکھنؤ، جلد ۲۱ نمبر ۱۹۲۳ء مئی، ص ۹

۳۹۔ اودھ پنچ، لکھنؤ، جلد ۲۱ نمبر ۱۹۲۳ء مئی، ص ۹

۴۰۔ اودھ پنچ، لکھنؤ، جلد ۸ نمبر ۱۹۲۳ء کتوبر، ص ۸

۴۱۔ اودھ پنچ، لکھنؤ، جلد ۸ نمبر ۱۹۲۳ء اکتوبر، ص ۵

۴۲۔ اودھ پنچ، لکھنؤ، جلد ۲ نمبر ۱۹۳۲ء مارچ، ص ۱۸

۴۳۔ اودھ پنچ، لکھنؤ، جلد ۵ نمبر ۱۹۲۸ء مارچ، ص ۸

۴۴۔ اودھ پنچ، لکھنؤ، جلد ۵ نمبر ۱۹۲۸ء مارچ، ص ۷

۴۵۔ شمع افروز زیدی، ڈاکٹر، اردو ناول میں طنز و مزاح، پروگریسو بک ڈپو، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۱۸۸

۴۶۔ شارب، ڈاکٹر، تنقیدی مطالعے، امین آباد، لکھنؤ، ۱۹۸۴ء، ص ۸۳

۴۷۔ چکبست لکھنوی، مضامین چکبست، امین آباد، لکھنؤ، ص ۱۷

۴۸۔ اودھ پنچ، لکھنؤ، جلد ۵، ۱۸۹۰ء جولائی، ص ۴

۴۹۔ اودھ پنچ، لکھنؤ، جلد نمبر ۱۸، ۲ جون ۱۹۳۳ء، ص ۱۰

۵۰۔اودھ پنچ، لکھنؤ، جلد نمبر ۱۸، ۲جون ۱۹۳۶ء، ص ۹

۵۱۔خورشید الاسلام، ڈاکٹر، طنز و ظرافت، مشمولہ: نقوش مزاح نمبر، ص ۸

۵۲۔فرقت کاکوروی، اردو ادب میں طنز و مزاح، ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ، ۱۹۵۷ء ص ۱۳۹

۵۳۔خورشید السلام، ڈاکٹر، تنقیدیں (طنز و ظرافت)، ص ۲۱

۵۴۔کشن پرساد کول، "اودھ پنچ کے نورتن" مشمولہ "علی گڑھ میگزین طنز و ظرافت نمبر، ۱۹۵۶ء، ص ۶۶

۵۵۔صغیر عالم خان، ڈاکٹر محمد، جگر بسوانی حیات اور کارنامے، ص ۲۳

۵۶۔وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو ادب میں طنز و مزاح ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۰ء، ص ۱۲۳

۵۷۔وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو ادب میں طنز و مزاح، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۰ء، ص ۶۵

۵۸۔اودھ پنچ، لکھنؤ، جلد سوم شمارہ نمبر ۳۰ نومبر ۱۸۹۹ء، ص ۸

۵۹۔بدر شکیب، اردو صحافت، ص ۱۴۳

۶۰۔مولانا عبدالحمید سالک، اردو صحافت، ۱۹۵۳ء، ص ۱۷۷

باب نمبر۲

اودھ پنچ کی نثر میں جدید مغربی تعلیم اور اس کے اثرات پر مزاحمت کا تنقیدی جائزہ

غدر کے بعد انگریزوں کے ظلم وستم نے ہر طرف خوف وہراس کا ماحول پیدا کر دیا تھا، کیوں کہ انھوں نے لوگوں کو صرف موت ہی نہیں دی تھی بلکہ ایسی موت دی تھی جس سے موت بھی تھر اگئی تھی اور اب جو مسلمان باقی بچ بھی گئے تھے تو وہ اب اس لائق نہ رہے تھے کہ زندہ رہ سکیں۔ کیوں کہ اس حادثے کے بعد معاشرہ اور روایتی نظام سب درہم برہم ہو گیا تھا۔ معاشرت کے طور طریقے بدل گئے تھے، صنعت و حرفت میں انقلاب آچکا تھا۔

ہندوستانیوں کی بغاوت کو کچل دینے کے بعد انگریزوں نے ان سے دل کھول کر انتقام لیا۔ ہر طرف قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا۔ لاکھوں بے گناہ مرد، عورت، بوڑھے اور بچوں کو قتل کر کے درختوں پر لٹکا دیا گیا جن کو چیل کوے نوچ نوچ کر کھا گئے۔ علم وہنر کے تمام مراکز برباد ہو گئے۔ دلی جو شان و شوکت میں اپنی مثال نہیں رکھتی تھی، آج ظلم و بربریت کا شکار ہو کر ویران ہو چکی تھی۔ جامع مسجد سے راج گھاٹ کے دروازہ تک ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے بیابان جنگل ہو۔ یہاں پر بربادی اور اینٹوں کے ڈھیر کے علاوہ کچھ نظر نہ آتا تھا۔ کنویں تک لاشوں سے پٹے پڑے تھے۔ بقول ظہیر دہلوی:

گھروں سے کھینچ کے کشتوں پہ کشتے ڈالے ہیں
نہ گور ہے نہ کفن ہے نہ رونے والے ہیں

چنانچہ ۱۸۵۷ء کے غدر نے ہندوستانیوں خاص کر مسلمانوں کو اور بھی زیادہ پست کر دیا تھا۔ انھیں تباہی کے اس اندھیرے غار میں دھکیل دیا جہاں مایوسی اور اندھیرے کے سوا کچھ نہ تھا۔ مسلمانوں کی سیاسی، سماجی زندگی بالکل تباہ و برباد ہو چکی تھی اور انگریزوں کا ہندوستانیوں پر مستقل قبضہ ہو چکا تھا۔ انگریزوں نے غدر کے بعد مسلمانوں کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ اس لئے بنایا تھا کیوں کہ انھوں نے ہندوستان کو مسلمانوں کے ہاتھوں سے ہی چھینا تھا۔ ایسے حالات میں اودھ پنچ کا مزاحمتی رویہ فطری عمل تھا اس گھٹن زدہ ماحول میں مجلہ نے اپنی بات کہنے کے لیے طنز و مزاح کا اسلوب اپنایا۔

سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کی قومی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ان کی سماجی، مذہبی، اخلاقی اور تعلیمی اصلاح کا جو بیڑہ اٹھایا علی گڑھ تحریک اس کی عملی صورت ہے۔ سرسید نے اعلیٰ اور جدید تعلیم ہی کو قوم کے مرض کا اصلی علاج قرار دیا۔ کیوں کہ سرسید غدر سے پہلے کے ہندوستانی سماج سے بھی واقف تھے اور مغربی اثرات کے ساتھ جدید دور کے گہرے نقوش بھی دیکھ رہے تھے۔ ان کی نظر غدر کے بعد کی تباہیوں پر بھی تھ67ی اور وہ مغرب کی ترقیوں اور اس کی لائی ہوئی برکتوں سے بھی آگاہ تھے۔ وہ انگریزی سامراج کی مصلحت اندیشیوں سے بھی واقف تھے۔ سرسید کے آباواجداد ایران کے شہر دامغان سے

شاہجہاں کے زمانے میں ہندوستان آئے تھے اور اکبر شاہ ثانی کے زمانے تک مغل خاندان سے منسلک رہے۔ سر سید کے والد میر متقی کا دربار سے خاص واسطہ رہا۔ لہٰذا سر سید بھی اپنے والد کے ساتھ دربار میں جایا کرتے تھے۔ اور انھیں خلعت بھی ملتا تھا لیکن ۱۸۵۷ء میں اپنے والد کے انتقال کے بعد ہی انھوں نے دربار سے اپنا رشتہ منقطع کر دیا تھا کیوں کہ وہ حکومت کی جھوٹی شان و شوکت کو اچھی طرح بھانپ چکے تھے، اسی لیے انھوں نے دربار کے مقابلے میں انگریزی ملازمت اختیار کرنا بہتر سمجھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سر سید بہت پہلے ہی مسلمانوں کے مستقبل سے آگاہ ہو چکے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے مسلمانوں کی حالت اور بھی بدتر کر دی۔ حالاں کہ اس ہنگامے میں ہندو بھی برابر کے شریک تھے، لیکن انگریزوں نے بغاوت کا محرک کار سب سے زیادہ مسلمانوں کو ہی ٹھہرایا۔ اس طرح ان کی حالت سدھرنے کے بجائے اور بھی زیادہ بگڑ گئی۔ ہر گلی کوچہ اور بازار میں مسلمانوں کا قتل ہوا۔ بے گناہوں کو بھی نہ بخشا گیا۔

ان حالات کے نتیجہ میں انھوں نے ایک ایسی تحریک کی بنیاد ڈالی جس نے انیسویں صدی میں ہندوستانی مسلمانوں کو مستقبل کی طرف نئی روشنی دکھائی۔ ان کی سماجی اور تاریخی حیثیت متعین کی۔ یہ ایک ایسی ہمہ گیر تحریک تھی کہ جس نے دورِ بیداری میں آگے بڑھنا اور وقت کے تقاضوں کو پورا کرنا سکھایا۔ اس تحریک نے مسلمانوں کے واسطے آئینِ نو کی روشنی کے لیے ان کی ذہنی اور سماجی زندگی کے تمام دریچے کھول دیے۔ اس نے تہذیب و تعلیم کے ہر گوشے میں مغرب اور جدید تعلیم سے مستفید ہونا، جدید کی خوبیوں کو قدیم کے حسن میں سمونا سکھایا۔ کیوں کہ انگریزوں کے اقتدار کے بعد مسلمانوں میں آگے بڑھنے کی ہمت اور صلاحیت باقی نہیں رہی تھی بلکہ یہ لوگ آگے بڑھنے سے بدکتے تھے اور پیچھے پلٹنا ان کے لئے ممکن نہ تھا۔ لیکن پھر بھی ان کے دلوں میں ماضی کی قدیم عظمت ان کی زندگی کا ایک قدیم سرمایہ بنی ہوئی تھی۔ اس کے لیے یہ لوگ اپنے ماضی پر ہی ناز کرتے رہتے تھے لیکن اس تحریک نے قدیم بندھنوں کو توڑ کر مغربی اثرات کو قبول کرنے کی دعوت دی۔ نئی تعلیم اور اس کے فوائد کو حاصل کرنے کی ترغیب دی، مادی ترقی سے بہرہ اندوز ہونے، نیز عقلیت کی بنا پر مذہب کو سمجھنے کی کوشش کرنے کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ یہ وہ تحریک تھی جس نے پہلی بار شمالی مغربی ہندوستان میں نئے مغربی علوم و سائنس کا چرچا عام کیا۔ انگریزی تعلیم کی ضرورت و اہمیت سے لوگوں کو خاص کر مسلمانوں کو آگاہ کیا، اس تحریک نے مسلمانوں پر خصوصی توجہ اس لیے دی تھی کہ مسلمان اس وقت سب سے زیادہ پس ماندگی کی حالت میں مبتلا تھے۔ ہندوؤں کی سیاسی، سماجی، مذہبی اور معاشرتی اصلاح راجہ رام موہن رائے کی تحریک بنگال سے ہو چکی تھی۔ لہٰذا انیسویں صدی کی یہی وہ تحریک تھی جس کو جدید اثرات سے متاثر ہونے والی دوسری اہم کڑی بھی کہا جاتا ہے۔ یہ تحریک پورے ہندوستان کی تاریخی و سماجی ترقی کے لیے ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس تحریک نے ہندوستان کی تاریخی کش مکش کے اس پر آشوب دور میں ہندوستانی قوم کے

ایک بڑے حصے کو زندہ رہنا اور ملکی مفاد کے لائق بننا سکھایا۔ سرسید کا خاص اور اہم مقصد مسلمانوں کو سائنس اور ٹیکنالوجی سے روشناس کرانا تھا۔ سرسید کی یہ تحریک خالص مسلمانوں کے لیے ہی نہیں تھی بلکہ ہندوؤں کی اصلاح کے لیے بھی تھی۔ بس فرق اتنا تھا کہ ہم وطنوں کی اصلاح راجہ موہن رائے بہت پہلے کر چکے تھے، اس لیے وقت اور حالات نے اس کا رخ مسلمانوں کی طرف موڑ دیا تھا۔ سرسید احمد خاں نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں کبھی تفریق نہیں کی تھی۔ ایک موقع پر انھوں نے اس طرح کہا تھا کہ: ”میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مثل اپنی دونوں آنکھوں کے سمجھتا ہوں۔ لفظ قوم سے میری مراد ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے۔ یہی وہ معنی ہیں جس میں، میں لفظ نیشن کی تعبیر کرتا ہوں۔“ (۱) ۱۸۵۷ء کی ناکامی نے سرسید کو اس نتیجہ پر پہنچایا کہ ہندوستانیوں کے لیے ایک ایسی درسگاہ قائم کرنی چاہیے جہاں تمام مغربی علوم اور انگریزی کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم بھی دی جائے اور مفید مشرقی علوم بھی سکھائے جا سکیں۔ جہاں تعلیم ہی نہیں ذہنی و اخلاقی تربیت اور محبت و اخوت کا سبق بھی دیا جا سکے۔ لہٰذا یہی خاکہ ذہن میں لے کر انھوں نے مدرستہ العلوم کے قیام کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ سرسید کے ذہن میں تعلیم و علم کا بہت وسیع مفہوم تھا اسی لیے انھوں نے انفرادی تعلیم پر تنقید کرتے ہوئے قومی تعلیم کا تصور پیش کیا۔ انھوں نے انفرادی تعلیم پر اعتراض کرتے ہوئے کہا:

> ”جس وقت اولاد کی تربیت کا ذکر آتا ہے تو رئیسوں اور دولت مندوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہم اپنی اولاد کی تعلیم خاص اپنے اہتمام سے اور ہر ایک علم کے عالم نوکر رکھ کر بخوبی کر سکتے ہیں۔ بعضوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہم کو اپنی ہی اولاد کی تعلیم و تربیت کی فکر کرنی کافی ہے۔ مگر یہ ایک بڑی غلطی ہے اور خود اولاد کے ساتھ دشمنی کرنی ہے، جہالت اور ناتربیتی وبا کی مانند ہوتی ہے۔ جب تک تمام شہر اس بد ہوا سے پاک نہ ہو، کوئی ایک گھر اپنے تئیں اس سے بچا نہیں سکتا۔“ (۲)

اس کے علاوہ سرسید نے تمام قدیم رسم و رواج اور ان علوم پر بھی کھل کر تنقید کی جنھوں نے مسلمانوں کو بے حس، بے عمل بنا دیا تھا۔ انھوں نے طرح طرح سے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اپنے اندر نئے زمانے کے تقاضوں کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کرو، لکیر کے فقیر بن کر مت بیٹھو۔ اسی سلسلے میں ایک مرتبہ پٹنہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ: ”تم اپنے بزرگوں کے حال سے مقابلہ کرو۔ آپ کے بزرگ جس زمانے میں تھے انھوں نے اپنے تئیں اس زمانے کے لائق بنا لیا تھا، اس لیے وہ دولت اور حشمت اور عزت سے نہال تھے اور جس زمانے میں کہ ہم ہیں ہم نے اپنے تئیں اس زمانے کے لائق نہیں بنایا، اس لیے نکبت اور ذلت میں ہیں۔“ (۳) اس طرح سرسید نے علم کے پرانے تصور کو رد کیا، ان کے ذہن میں علم قومی ترقی کا راستہ

اور معاشی بہبود کا ایک ذریعہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ علم ایک ذہنی عیاشی نہ ہو، بلکہ سماج کی بہتری اس کا نصب العین اور مطمح نظر ہو۔ قدیم طریقہ تعلیم کے متعلق سرسید نے اپنی ایک اور تقریر میں کہا کہ:

> "مسلمانوں میں کچھ تعلیمی تحریک ہوتی ہے تو ان کی سعی ہمیشہ اسی بات پر مرکوز ہوتی ہے کہ وہی پرانا موروثی طریقہ تعلیم کا اور وہی ناقص سلسلہ نظامیہ درس کتب کا اختیار کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں اسی پرانے طریقہ پر مسلمانوں کے کئی مدرسے تعلیم کے لیے جون پور، علی گڑھ، سہارن پور، کان پور، دیوبند، دہلی و لاہور میں جاری کیے ہیں۔ میں نہایت سچے دل سے کہتا ہوں کہ وہ محض بے فائدہ اور محض لغو ہیں ان سے کچھ بھی قومی فائدہ ہونے کی توقع نہیں۔" (۴)

سرسید نے قوم کی بھلائی جدید تعلیم کو حاصل کرنے میں ہی دیکھی تھی لیکن قوم اس وقت اپنے فرسودہ رسم و رواج اور فرسودہ تعلیم کو کسی بھی طرح چھوڑنے پر راضی نہ تھی۔ سرسید نے قوم کی اس حالت پر افسوس کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا تھا کہ:

> "ایسے ایسے مدرسوں سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی ان کو نکالنے والا نہیں۔ ہائے افسوس! امرت تھوکتے ہیں اور زہر نگلتے ہیں۔ افسوس! ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں اور مگرمچھ کے منھ میں ہاتھ دیتے ہیں۔ مرجھائے ہوئے درخت کی جڑ میں پانی دینے کی بجائے اس کے پتوں پر پانی چھڑکتے ہیں اور سوکھے ہوئے چشموں سے نہریں کھود کر پانی لانے کی توقع کرتے ہیں۔ پچھلا طریقہ تعلیم واقعی بہت اچھا تھا لیکن وہ تیلیاں جس ڈور سے بندھی تھیں ٹوٹ گیا اور اب دوسرا ڈور ان کے باندھنے کو ہونا چاہیے۔" (۵)

سرسید قدیم تعلیم کے بجائے جدید تعلیم کی حمایت میں جی جان سے لگ گئے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جدید تعلیم ہی قوم کو اس تاریک گڑھے سے نکال سکتی ہے جس میں وہ دن بدن گرتی چلی جا رہی ہے۔ سرسید نے انگریزی ملازمت کے دوران ہی قوم کی کمزوری اور اس کی بدحالی پر غور و فکر کرنا شروع کر دیا تھا، لیکن ابھی انہیں سہی راستہ نہیں مل پا رہا تھا، کہ اسی کش مکش کے دوران انھیں انگلستان جانے کا موقع ملا۔ وہ اس موقع کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اسی لیے انھوں نے اپنا سارا اثاثہ بیچ ڈالا یہاں تک کہ اپنا مکان بھی فروخت کر ڈالا۔ سرسید وہاں گھومنے پھرنے نہیں گئے تھے بلکہ وہاں کی ہر چیز کو دیکھ کر وہ اپنی قوم کے بارے میں سوچتے۔ غرض یہ کہ انھوں وہاں کے سفر سے سبق اور نصیحت حاصل کی۔ سرسید وہاں ایک سال تک مقیم رہے، وہیں پر ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ ہندوستان میں ایک تعلیمی درس گاہ بنائی جائے، کیوں کہ کیمبرج یونیورسٹی کے طرزِ تعلیم پر غور کرتے ہوئے اسی طرز پر اعلیٰ تعلیم کے لیے درس گاہ کا خاکہ ذہن میں بنایا تھا، تا کہ ہندوستان لوٹنے پر اسی طرز

کی درس گاہ یہاں قائم کر سکیں جس میں اعلیٰ مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی دینی تعلیم اور ان کی خصوصی ضروریات تعلیم پر نظر رکھی جائے تاکہ عام مسلمانوں کو مغربی تعلیم کی طرف توجہ اور رغبت پیدا ہو اور وہ پوری طرح اس سے مستفید ہو سکیں۔ سرسید بڑے ہی غورو خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ اعلیٰ تعلیم ہی وہ بنیادی چیز ہے جس کے ساتھ سماج میں ہر طرح کی خوبیاں پیدا ہونے لگتی ہیں اور جس کے نتیجے میں قومیں ترقی کی منزلیں طے کرتی ہیں۔ لہٰذا انھوں نے اپنے اصلاحی خاکہ میں عملی طور پر اسی کو مرکز بنایا اور انگلینڈ سے واپسی کے بعد ہی اپنی پوری توجہ اس طرف مرکوز کر دی۔ واپس آنے کے بعد سب سے پہلے انھوں نے ۱۸۷۰ء میں تہذیب الاخلاق کا پہلا شمارہ جاری کیا۔ اس رسالہ کے شائع کرنے کا مقصد سوئی ہوئی قوم کو جگانا تھا۔

علی گڑھ تحریک کے وجود میں آنے کا سب سے اہم سبب قوم کی پست حالت تھی۔ اُنیسویں صدی کی اس تحریک نے مری ہوئی قوم میں جان ڈالی۔ اس سے پہلے تمام تحریکیں خالص مذہبی تھیں لیکن علی گڑھ تحریک نے مذہب کے ساتھ ساتھ جدید تقاضوں کو بھی اپنایا۔ اس سے پہلے قوم مغربی علوم سے کوسوں دور بھاگتی تھی، کیوں کہ اس کے ذہن و دل پر قدیم تعلیم چھائی ہوئی تھی۔ لیکن سرسید نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ اس کو اس روایتی بندھن سے آزادی دلائی۔ ایک جگہ کہتے ہیں کہ:

> "کیا تم خیال کرتے ہو کہ ایسی کتابوں سے جن میں صرف یہ بات لکھی ہو کہ فلاں سنہ میں فلاں بادشاہ ہوا اور فلاں سنہ میں مر گیا۔ انسان کے اخلاق کی درستی اور قومی تربیت ہو سکتی ہے؟ نہیں، صاحبو! ہر گز نہیں ہو سکتی جب تک کہ ایک قوم کے اخلاق اور اس کی بھلائیاں اور برائیاں تفصیل سے نہ بتائی جاویں اور طرح طرح کی تقریروں اور مباحثوں سے ان کی بھلائی برائی ظاہر نہ کی جاوے دل میں اثر نہیں ہوتا۔" (۶)

سرسید نے مغربی تعلیم کے فوائد کو بخوبی سمجھ لیا تھا۔ امرتسر کے ٹاؤن ہال میں "اتحاد باہمی" پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ: "اگر گورنمنٹ نے ہمارے حقوق اب تک ہمیں نہیں دیے ہیں تو ہائی ایجوکیشن وہ چیز ہے کہ خواہ نہ خواہ طوعاً کرہاً ہم کو دلا دے گی۔" (۷) جدید تعلیم کی تعریف کرتے ہوئے سرسید نے کہا کہ: "دوستو! یہ نہ کہنا کی مجھ کو اس انگریز کے مانند جس کو صرف امورہ رنگنا آتا ہے۔ امورہ رنگ ہی آتا ہے، مگر میں سچ کہتا ہوں کہ جو چیز تم کو اعلیٰ درجہ پر پہنچانے والی ہے وہ صرف ہائی ایجوکیشن ہے۔ جب تک ہماری قوم میں ایسے لوگ پیدا نہ ہوں گے ہم ذلیل رہیں گے اور ان سے پست رہیں گے اور عزت کو نہیں پہنچیں گے جس پر پہنچنے کو ہمارا دل چاہتا ہے۔" (۸) تعلیم کے معاشی اور سیاسی فائدے بھی ان کے پیش نظر تھے۔ کہا کرتے تھے کہ:

> "وہ ملک دولت مند نہیں ہوتا جس میں دوسرے ملک کی چیزوں کی تجارت ہوتی ہے بلکہ

> وہ ملک دولت مند ہوتا ہے جس کی چیزوں کی تجارت دوسرے ملکوں میں ہوتی ہے۔ ہم کو چاہیے کہ دوسرے ملکوں میں آڑھ اور کمپنیاں قائم کریں اور ملک کی پیداوار اور قدرتی چیزوں سے جو زمین میں گڑی پڑی ہیں ان سے فائدہ اٹھاویں۔" (۹)

سرسید کے نزدیک جدید تعلیم ہی مسلمانوں کی پریشانی کا واحد علاج تھا۔ اس لیے انھوں نے اپنی ساری توجہ اسی طرف مبذول کردی، لہٰذا اس کے لیے انھوں نے طرح طرح کے منصوبے بنائے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے قیام کا مقصد ہی یہ تھا کہ ملک میں ہر طرف تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں۔ اس کے سالانہ جلسوں میں مختلف علاقوں کی تعلیمی پیش رفت کا جائزہ لیا جائے، یہی نہیں بلکہ علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام بھی اسی مقصد کے تحت کیا گیا۔ ان کے تعلیمی منصوبوں میں علی گڑھ اورینٹل کالج کو خالص اہمیت حاصل ہے۔ یہی وہ کالج تھا جس کے لیے سرسید نے اپنی زندگی کو اس کی ترقی واستحکام کے لیے وقف کردیا تھا۔ اس کے لیے انھیں کافی محنت اور جدوجہد کرنی پڑی، لیکن وہ ہمت نہیں ہارے۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا پہلا جلسہ ۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء کو بہ مقام علی گڑھ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں منعقد ہوا۔ اس کانفرنس کے مقاصد اوّلاً حسب ذیل قرار دیے گئے: (۱) مسلمانوں میں مغربی تعلیم کو اعلیٰ درجہ تک پہنچانے میں کوشش کرنا (۲) مسلمانوں کی تعلیم کے لیے جو انگریزی مدرسے مسلمانوں کی طرف سے جاری ہوں ان میں مذہبی تعلیم کے حالات دریافت کرنا اور تامقدور عمدگی سے اس تعلیم کے انجام پانے میں کوشش کرنا (۳) علوم مشرقی اور دینیات کی تعلیم جو علمائے اسلام جابجا بہ طور خود دیتے ہیں۔ اس کو تقویت دینا اور اس کو بدستور قائم اور جاری رکھنے کی مناسب تدبیریں عمل میں لانا (۴) جو تعلیم قدیم طرز پر دیسی مکتبوں میں جاری ہے اس کے حالات کی تفتیش کرنا اور ان میں جو تنزل ہو گیا ہے اس کی ترقی اور توسیع کی تدبیریں اختیار کرنا۔ قرآن خوانی اور حفظ قرآن کے لیے جو مکتب جاری ہیں اور جن کو روز بروز تنزل ہوتا جاتا ہے ان کے حالات کی تفتیش کرنا اور ان کے قائم رکھنے اور استحکام دینے کی تدبیریں عمل میں لانا۔

۱۲ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو سرسید، سید حامد کے ساتھ ولایت سے بنارس آئے۔ یہاں آکر انھوں نے مسلمانوں کی خاص توجہ دی (کیوں کہ انھوں نے یہ سفر اسی مقصد کے لیے کیا تھا) اس میں انھیں دو مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ (۱) مسلمانوں کے مذہبی اوہام، انگریزی میں تعلیم سے نفرت اور (۲) ایجوکیشن کے مفہوم سے ناواقفیت۔ رسالہ تہذیب الاخلاق کے پہلے شمارے میں سرسید نے رسالہ کے مقاصد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "اس پرچے کے اجرا سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجے کی سولیزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے، تاکہ جس حقارت سے سویلائزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز مہذب قوم

کہلادیں۔"(۱۰)

بعد کے ایک پرچے میں اس مقصد کی تفصیل یوں بیان کی ہے:

"جب ہم کسی قوم کو تہذیب کی طرف مائل کرتے ہیں تو ہم کو یہ ضرور ہے کہ ہم یہ بھی بتا دیں کی اس قوم کو کن کن چیزوں میں تہذیب کرنی چاہیے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے جو حالات ہیں ان کے لحاظ سے ہمارے خیال میں آتا ہے کہ مفصلہ ذیل چیزیں ہیں جن کی تہذیب پر ان کو متوجہ ہونا چاہیے:
(۱) آزادیٔ رائے (۲) درستی عقائد مذہبی (۳) خیالات وافعال مذہبی (۴) تدقیق بعض مسائل مذہبی (۵) تصحیح بعض مسائل مذہبی (۶) تعلیم اطفال (۷) سامان تعلیم (۸) عورتوں کی تعلیم (۹) ہنر وفن حرفہ"(۱۱)

اس کو بند کرنے کی بھی کئی وجہیں تھیں: (۱) کالج کو ترقی دینے کی فکر (سرسید ۱۸۹۷ء میں پنشن لے کر ملازمت سے سبک دوش ہوگئے کیوں کہ ملازمت کے دوران وہ کالج کے لیے چندہ وصول کرنا معیوب سمجھتے تھے۔) (۲) وقت اور پیسے کی کمی (۳) تفسیر القرآن کو مکمل کرنا (۴) مسلمان کافی حد تک بیدار ہو چکے تھے۔ تہذیب الاخلاق کی اہمیت یہ ہے کہ مخالفت کے باوجود بھی اپنے مقصد میں کافی حد تک کامیاب رہا۔ مخالفت بھی ایسی تھی کہ جو بڑے بڑے اخبارات کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ مثلا :(۱) کان پور سے نورالآفاق میں مضامین لکھے گئے (۲) رسالہ اشاعۃ السنۃ میں بھی مخالفت ہوئی اور یہی وہ رسالہ ہے جس نے سرسید کو کافر، مرتد اور کرستان وغیرہ القاب و آداب سے نوازا۔ (۳) مجلہ اودھ پنچ میں تو سرسید کی مخالفت کے علاوہ شاید ہی کچھ اور ہو۔ باوجود مخالفت کے تہذیب الاخلاق نے کافی حد تک اپنے اعراض ومقاصد میں کامیابی حاصل کی اور قوم کو بیدار کیا اور جدید علوم وفنون سے روشناس کر دیا۔

ایم۔ اے۔ او کالج کا قیام اور جدید تعلیم کا تصور:

سرسید احمد خاں چوں کہ غدر کے دوران ہی اس حقیقت سے واقف ہوگئے تھے کہ مسلمانوں کو ذلت اور پستی سے باہر نکالنے کا واحد ذریعہ جدید تعلیم کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس لیے انھوں نے سفر انگلستان کے دوران ہی مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آشنا کرانے کے منصوبے شروع کر دیے تھے۔ ان منصوبوں میں پہلا تہذیب الاخلاق کا اجراء اور دوسرا مدرسۃ العلوم کا قیام تھا، جس کے لیے انھوں وقت سے پہلے ہی ۱۸۷۶ء میں پنشن لے کر نوکری سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ ادھر تہذیب الاخلاق کے ذریعے بھی مسلمان کافی حد تک بیدار ہو چکے تھے۔ اس لیے اب سرسید کی ساری توجہ کا مرکز مدرسۃ العلوم ہی تھا۔ ۲۴ء مئی ۱۸۷۵ء کو مدرسۃ العلوم مسلمانان، یعنی محمڈن اینگلو اورینٹل (اے۔ ایم۔ او) کا قیام عمل میں آیا اور اس کا بنیادی پتھر لارڈ لٹن

وائسرائے ہند کے ہاتھوں ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو علی گڑھ میں رکھا گیا۔ بہ ظاہر تو یہ مسلمانوں کی تعلیم کے لیے قائم ہوا تھا لیکن اس میں تمام مذاہب کے لوگ تعلیم حاصل کرتے تھے اور کرتے ہیں۔ اس میں کسی بھی طرح کے تعصب کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اس کا صرف ایک ہی مقصد تھا کہ سب ہندوستانیوں کی ترقی ہو اور وہ بھی یورپی اقوام کی طرح عزت ووقعت کی نگاہ سے دیکھے جائیں۔ حالاں کہ سرسید خالص جدید تعلیم کے ہی حامی نہ تھے بلکہ انھوں نے لوگوں کی توجہ مذہب کی جانب مرکوز کرائی۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان دین اور دنیا دونوں کو ساتھ لے کر چلیں، ان میں سے ہر ایک کا پلڑا برابر ہو۔ اگر ایک بھی پلڑا برابر نہ ہو گا تو پھر قوم نہ دین کی رہے گی اور نہ دنیا کی۔ اس بات کو انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں بھی بیان کیا ہے۔ سرسید نے ۱۸۷۶ء کی اپنی ایک اسپیچ میں کہا تھا کہ:

> "یاد رکھو سب سے سچا کلمہ لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے، اسی پر یقین کرنے سے ہماری قوم ہماری قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ یاد کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے ۔ پھر اگر تم آسمان کے تارے ہو گئے تو کیا؟ پس امید ہے کہ تم ان دونوں باتوں (یعنی علم اور اسلام) کے نمونے ہوگے اور جبھی ہماری قوم کو عزت ہو گی۔" (۱۲)

ہندوستان کے لوگوں کے لیے جس قسم کا نظام تعلیم انگریزوں نے رائج کیا (وہ انتظامی ڈھانچا ہو یا تعلیم) ان سب کا مقصد ایک ہی تھا کہ یہاں کے لوگوں خصوصاً مسلمانوں سے شوکت پاستان اور عظمت ماضی کا تصور چھین لیا جائے اور اس کے بجائے انہیں دوامی غلامی کا طوق پہنا دیا جائے تا کہ وہ دوبارہ ۱۸۵۷ء جیسی بغاوت نہ کر سکیں۔ اس مقصد کے لیے سب سے زیادہ مفید کام تعلیمی اداروں سے لیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ یورپ سے اساتذہ درآمد ہوئے تعلیمی ادارے بنائے گئے اور ایسا نظام تعلیم رائج کیا گیا جس نے چند برسوں میں لوگوں کے ذہنوں کو بدل کر رکھ دیا۔

انگریزوں نے ہندوستانیوں کو تعلیم دینے کی ذمہ داری اس لیے قبول کی اس سے ان کے چار بڑے مقاصد وابستہ تھے۔ اول یہ کہ جدید علوم بالخصوص فلسفہ اور سائنس وغیرہ لوگوں کے دلوں سے اپنی قدیم روایات کی بابت نفرت پیدا کر دیں گے اور بالعموم مذہب بیزاری پر منتج ہوں گے۔ دوم یہ کہ ہندوستان میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گا جو انگریزی تہذیب و معاشرت کو اپنے لئے ایک مثالی نمونہ قرار دے گا۔ اور اس کی تقلید کرے گا۔ سوم اس سے انتظامیہ کے معمولی اور کم تنخواہ پانے والے عہدے دار پیدا ہوں گے جو انگلستان سے منگوائے جانے والے ملازموں کے مقابلے میں بہت کم تنخواہ پر کام کریں گے۔ اس کے علاوہ وہ برطانوی حکومت کی بقا کو اپنی بقا سمجھتے ہوئے سلطنت برطانیہ کے استحکام میں مصروف رہیں گے۔ چہارم یہ کہ اس سے برطانوی تہذیب اور عیسائیت کا فروغ ہو گا۔

پہلے دو مقاصد کے حصول کا طریقہ یہ تھا کہ ہندوستان کے پرانے نظام تعلیم کے نقائص بڑھا کر بیان کیے جائیں۔ اس کے نصابات پر شدید نکتہ چینی کی جائے اور ان میں بیان کیے گئے نظریات اور روایات کے متعلق احساس کمتری پیدا ہو۔ انگریز ماہرین تعلیم کا یہ خیال تھا کہ ہندوستان کا پرانا نصاب تعلیم خطرناک ہے۔ اس کو پڑھ کر لوگ سلطنت برطانیہ کے وفادار نہیں بن سکتے:

> As long as the natives are left to brood over their former independence, their sole specific for improving their condition is, the immediate and total expulsion of the English. A native patriot of the old school has no notion of any-thing beyond this: his attention has never been called to any other mode of resorting the dignity and prosperity of the country. It is only by the infusion of European ideas that a new direction can be given to the national views.(۱۳)

یورپی تعلیم کے حصول سے مزاج میں تغیر آجاتا ہے، لوگ اپنے ماضی سے نفرت کرنے لگتے ہیں اور ان کی خواہش ہوتی ہے کہ انگریزوں کے زیر سایہ حفاظت سے رہیں اور ویسے ہی لگیں۔ ان کے خیال میں ہندوستان کے لوگ جدید علوم کو پڑھیں گے تو قدیم نظریات کو ترک کر دیں گے۔ اسی طرح نئے علوم ان کی مذہبی کتابوں کی خامیاں بھی ان پر ظاہر کر دیں گے۔ اسی طرح جدید تعلیم کو عیسائیت کی تبلیغ و ترویج کا ایک ذریعہ بنایا گیا۔ خصوصاً مشنری اداروں میں تبلیغ اور بائبل کی تدریس پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ سرسید زمانے کے مطابق مسلمانوں میں تبدیلی کے خواہاں تھے، لیکن سرسید کے یہی خیالات و افکار ان کے اختلاف کی وجہ ثابت ہوئے۔

اودھ پنچ منظر عام پر آیا تو پورا ہندوستان اس وقت تک غلامی کی زنجیروں میں جکڑ چکا تھا۔ یہ غلامی سیاست و اقتدار کے دائرے سے نکل کر تعلیم، تہذیب اور زندگی کے چال چلن میں مغرب کی اندھی تقلید کی صورت میں ظاہر ہو رہی تھی یہ احساس عام ہو رہا تھا کہ تہذیب جس چیز کا نام ہے اس کے وارث انگریز ہیں اور ان کے مقابلے ہر ہندوستانی اجڈ اور وحشی ہیں لہٰذا انھیں متمدن اور مہذب ہونے کے لیے مغربی تہذیب کو آنکھ بند کر کے اختیار کر لینا چاہیے۔

اودھ پنچ اس غلامانہ ذہنیت کا دشمن تھا۔ چوں کہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم و تہذیب کے سب سے بڑے وکیل سرسید احمد خاں تھے۔ اس لیے اودھ پنچ سرسید اور ان کی تعلیمی تحریک کا بھی بدترین مخالف تھا اور یقیناً اس کی مخالفت میں وہ

اکثر حد اعتدال سے بھی تجاوز کر جاتا تھا۔ مغربی تعلیم و تہذیب اور اس کے چرچے سے اودھ پنچ کو کتنی الجھن ہوتی تھی اس کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے کیا جا سکتا ہے۔

"تہذیب! تہذیب! تہذیب!!! سنتے سنتے کان بہرے ہو گئے ہیں۔ جدھر دیکھو تہذیب ہی تہذیب۔ اٹھنے بیٹھنے میں تہذیب، چلنے پھرنے میں تہذیب، ہگنے موتنے میں تہذیب، یا الٰہی! تہذیب کم بخت تو جان کی عذاب ہو گئی۔۔۔۔۔۔۔ ادھر انگریزی ہوئی اُدھر دنیا میں تہذیب پھیلی۔ شرابی مہذب، بھنگی مہذب۔ اس سرے سے اُس سرے تک سب مہذب۔ دنیا بھر میں بڑے فعل چاہے کیوں نہ کرے۔ تہذیب میں وہ ہی آئیں گے۔ یہ سب تو در کنار بعضے خدائی فوج دار ملکی ڈھنڈورچیوں کی تہذیب نے ناک میں دم کر دیا۔ روز نصیحت کے بہانے خدائی بھر کی آئیں بائیں شائیں بکا کرتے ہیں۔" (۱۴)

اودھ پنچ نے جدید تعلیم کے جن تاریک پہلوؤں کی نشاندہی کی، حیرت انگیز طور پر سرسید کی نگاہ ان کی طرف نہیں گئی۔ حالاں کہ سیّد محمد آزاد نے یہ خطوط ہندوستان میں بیٹھ کر لکھے تھے جب کہ سرسید نے تو مغربی تہذیب کا بہ چشم خود مشاہدہ کیا تھا۔ اودھ پنچ کو سرسید سے یہی شکوہ تھا کہ وہ مشرقی ہو کر مغربی تعلیم کے پرچارک بنے ہوئے تھے۔ اور اسی لیے اس کے صفحات سرسید کی اصلاحی و مقصدی تحریک کے بخیے ادھیڑنے کے لیے وقف رہے۔ ۱۸۷۷ء سے ۱۸۹۳ء تک سرسید کے خلاف نظم و نثر میں اتنا کچھ لکھا گیا کہ انھیں یکجا کیا جائے تو کئی ضخیم جلدیں مرتب کی جا سکتی ہیں۔ ان مضامین میں سرسید کو کافر، کرسٹان، نیچری، فریبی دھوکا باز اور گداگر تک کہا گیا سرسید نے علی گڑھ کالج کے لیے چندہ جمع کرنے کی مہم شروع کی تو اودھ پنچ نے اس کا بھی مذاق اڑایا:

"بھیک مانگنے کا نیچرل اور مہذب طریقہ
ارے کم بختو! مجھ کو روپیہ دو! ارے نالائقو! مجھ کو دو
ارے بیوقوفو! مجھ کو دو۔ ارے بے ایمانو! مجھ کو دو۔
ارے جاہلو! مجھ کو دو۔ اے کاہلو! مجھ کو دو۔ خدا کے واسطے چاہے نہ دو مگر نیچر کی خاطر تو دو" (۱۵)

اودھ پنچ کو سرسید کی مغربیت پر ایک زبردست اعتراض یہ بھی تھا کہ وہ اس مغربیت کے زیر اثر دینی عقائد میں تحریف کے مرتکب ہوئے تھے اور دین کی ایسی تفسیر و تعبیر پیش کر رہے تھے جو مسلمانوں کے لیے کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتے تھے۔ ملاحظہ ہوں دو رباعیاں:

سید اسلام کی ہوا سے ناخوش

روزے سے نماز سے دعا سے ناخوش
معراج سے معجزے سے قطعی انکار
کافر ہیں فرمودہ خدا سے ناخوش

اسلام سے منحرف ہو اب سید
نیچر سے میل کھا رہا ہے سید
اس پر دعویٰ ہے یہ کہ ہے سید قوم
کیا مکر کے جال ڈالتا ہے سید

یہ سرسید کی اعلیٰ ظرفی اور ضبط و تحمل کی غیر معمولی صلاحیت تھی کہ انھوں نے کبھی پلٹ کر اودھ پنچ کے ان حملوں کا جواب نہیں دیا۔ یہ حملے کبھی پر لطف ہوتے تھے اور کبھی ثقاہت سے گرے ہوئے۔ ایک پر لطف حملے کا انداز دیکھیے: "کیوں حضرت! یہ آپ جب دیکھیے خواہ مخواہ ہمارے بوڑھے سید پر منھ آتے رہتے ہیں۔ آخر سبب؟ غرض؟ ہمارے سرسید نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟ یہ بھی کیا غضب ہے کہ احسان تو مانتے نہیں الٹا دھڑا باندھا جاتا ہے۔ پوچھو سید کی اس میں کیا خطا کہ جو طالب علم یورپ جاتا ہے ایک میم صاحبہ بغل میں دبائے چلا آتا ہے۔ سچ پوچھو تو اس میں کسی کی بھی خطا نہیں۔ یہ تو آپ بھی مانتے ہیں کہ کھیل کود بھی بچوں کی تعلیم کا ایک جزو ہے۔ اگر چار گھنٹے سخت محنت کی پڑھائی میں صرف ہوئے تو کم سے کم ایک گھنٹا کھیل کود میں جس سے طبیعت خوش رہے۔ آپ اپنے بچوں کو نہیں خود ہی بازار سے کھلونے کھیلنے کے لیے لا دیا کرتے ہیں؟ بس اسی طرح سید کو سمجھ لیجیے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ آپ غیر مہذب ہیں۔ بچوں کے کھیلنے کو کھلونے میں لائیے گا تو چٹوا، جنجھنا، بانسری۔ سید یہ نہیں کرتے وہ زمانے کے نشیب و فراز کو دیکھ بھال کر لونڈوں کو ولایتی کھلونوں پر لگاتے ہیں اور یوں ان کا جی بہلاتے ہیں۔

ہم خوش ادھر وہ خوش اُدھر اپنی پسند سے
ہم ہتھکڑی سے شاد ہیں وہ دست بند سے" (۱۶)

منشی سجاد حسین کو سرسید سے ان کی انگریز دوستی کی وجہ سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ لہٰذا ہندی اردو تنازعے میں اردو حمایت کے معاملے کے سوا شاید ہی کوئی مسئلہ ہو جس پر انھوں نے یا ان کے اخبار نے سرسید کے کسی نقطۂ نظر سے اتفاق کیا ہو۔ یہ مخالفت اس حد تک بڑھی ہوتی تھی کہ جب مرزا غلام احمد قادیانی نے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا تو اودھ پنچ نے اس پر ایک

مزاحیہ آرٹیکل شائع کیا جس میں سرسید کو بھی گھسیٹ لیا اور انھیں یحیٰ ثانی قرار دیا۔ ڈاکٹر طاہر مسعود کے مطابق: "منشی سجاد حسین سرسید اور ان کی تحریک کے کے کڑے ناقد تھے۔ اس مخالفت کے پیچھے بھی انگریز دشمنی کا جذبہ کار فرما تھا۔ وہ ساری زندگی مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب کا مذاق اڑاتے رہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کا اپنا اخبار بھی اسی تقلید کا نتیجہ تھا۔ "پنچ لندن" جب پہنچتا تھا تو منشی سجاد حسین اس کا بہ غور مطالعہ کرتے تھے اور اپنے مصور رام بہادر کو اس کے کارٹونوں کے عین مطابق کارٹون بنانے کی ہدایت دیتے تھے۔ مغربی مصنفوں اور مغربی اخبار سے متاثر ہو کر انھوں نے اردو میں مغربی انداز کے طنز و مزاح کو داخل کیا۔ فرق یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ انگریزوں سے سیکھا اسے انگریزوں ہی کے خلاف استعمال کیا۔" (۱۷)
اودھ پنچ انگریزوں اور سرسید کی تحریک پر طنز کرنے کا کوئی موقع نہیں گنواتا۔ یہاں تک کی بعض اوقات محض تنقید برائے تنقید پر ہی اتر آتا ہے۔ سرسید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک سے اودھ پنچ کو جو شکایت تھی۔ اس کا ذکر اودھ پنچ میں سجاد حسین نے اپنی ۱۸۸۹ء کی ایک اشاعت میں "معلم الملکوت کی پیر نیچر کے نام چٹھی" کے عنوان سے یوں کہا ہے:

> "مائی ڈیر سرسید!
> "شاید تم کو تعجب ہو گا کہ میں نے ان محبت آمیز الفاظ سے تم کو یاد کیا اور پھر ایسی ضرورت کے وقت تمہاری مدد پر آمادہ ہوتا ہوں۔ مجھ کو بے شک ملال تھا کہ تم نے باوجود میری اس درجہ حقوق اور عنایتوں کے بھی، میری رفاقت کی کچھ پرواہ نہ کی اور لارڈ ڈفرن کو ترجیح دے کر میرے خلاف بیعت کر لی۔ واقعی تمہاری ایک بہت بڑی غلطی تھی جو میرے مشن سے علیحدہ ہو کر تم معاملات ملکی کی جانب رجوع ہوئے اور یکایک تم نے دین کی رخنہ اندازی سے اپنے خیالات کو پھیر کر بالکل پولیٹیکل کر لیا مگر نہیں۔" (۱۸)

یہ تحریر اودھ پنچ کے مخصوص رنگ کی عکاس ہے۔ اس میں اودھ پنچ اور علی گڑھ تحریک کے جو اختلافات تھے اس کی بھی پوری طرح عکاسی ہو گئی ہے۔ سرسید احمد خان کے نظریات و افکار کو بھی اودھ پنچ نے طنز کا نشانہ بنایا، لکھتا ہے: "اس' یہ کیا کلمہ کفر بک دیا۔ ذری زبان سنبھال کے 'دیکھیے پیر جی بر امان جائے گے۔ ماشااللہ یہ طنز انیچری کہے جانے کی بھی ایک ہی ہوئی۔ اے حضرت "گرو جی" سے پوچھیے نیچر نے ان میں حلول کیا ہے ان کا تن' من' دھن سب نیچر ہے۔ خلاف نیچر تو ان میں کچھ ہے ہی نہیں۔ پھر اس میں کوئی طنز کیوں کرنے لگا اور اس کی حاجت ہی کیا رہی جبکہ وہ خود ہزار مرتبہ ہندو نیچر ہونے کا دعویٰ کر چکے اور ڈنکے کی چوٹ نیچری بن چکے۔ ان کے نزدیک مذہب 'ملت' دین' ایمان' خدا' رسول سب (معاذاللہ) نیچر ہی نیچر ہے۔ ہر جگہ

نیچر کا جلوہ' ہر شے میں نیچر کا کرشمہ' ان کے قول میں' فعل میں' کھانے میں' پینے میں' اٹھنے میں' بیٹھنے میں بالکل نیچر ہی نیچر ہے۔ سوتے جاگتے نیچر کے زور سے' بولتے چالتے نیچر کی مدد سے الغرض وہ کون سی زمین ہے جہاں آسمان نہیں"۔(۱۹) اودھ پنچ براہ راست سرسید کا نام لے کر بھی طنز کرنے سے باز نہیں آتا۔ مثال کے طور پر سرسید احمد خان نے "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کی جو مہم شروع کی تھی اودھ پنچ نے اُس کو بھی تضحیک کا نشانہ بنایا لکھتا ہے:

> " ہمارے سرسید گلے میں جھولی ڈال چیلوں کو ساتھ لے کر دکن کی طرف گداگری کے واسطے نکلنے والے ہیں۔ خدا اس فقیر کی جھولی کو طرح طرح کے ٹکڑوں سے بھرا پرا واپس لائے سچ ہے ایک زمانہ تھا کہ سید صاحب اور ترکیبوں سے روپیہ وصول کرتے تھے کبھی قوم کو سبز باغ دکھاتے' کبھی ڈانٹتے' کبھی ڈپٹ کر' کبھی غیرت دلا کر' کبھی قلم کے زور سے مطلب نکالا' کبھی سحر بیانی سے رنگ جمایا' اب ضعیفی کا زمانہ' بہت سی باتوں میں کمی' اب سہل لٹکا یہی سوجھا کہ اس معزز طریقہ سے کچھ وصول کرلو"(۲۰)

سرسید احمد خان کے نظریات وخیالات اور علی گڑھ تحریک کی بھرپور مخالفت کے علاوہ انگریزوں کی تضحیک کا بھی کوئی موقع اودھ پنچ نے اپنے ہاتھ سے نہیں گنوایا۔ وہ ہنسی مذاق اور لطیفے بیان کرتے ہوئے انگریزوں اور انگریزی اصلاحات پر ایسی گہری طنز کرتا کہ قاری پر ان کی اصلیت ظاہر ہوئے بغیر نہ رہتی۔ ایک مثال دیکھیں:"ایک خانساماں سے برتنوں کی الماری گر پڑی۔ آواز سے میم صاحبہ کی آنکھ کھل گئی۔ فوراً خانساماں کو بلایا۔ نہایت بد دماغ تھیں۔ کہنے لگیں کی تم سوّر ابھی جہنم کو جاؤ۔ خانساماں مقتضائے وقت دیکھ کر کچھ نہیں نہ بولا اور چپ چاپ گھر کو چلا گیا۔ ایک ہفتہ بعد خانساماں پھر روبرو میم صاحبہ کے گیا اور کہنے لگا۔ غریب پرور! میں نہایت دشواری و جانفشانی سے جہنم تک پہنچا۔ لیکن وہاں گوروں کا سنگین پہرا جو باہر کھڑا تھا۔ اس نے مجھے ٹوکا۔ اندر جانے سے روکا۔ میں نے کہا میں ہرگز ہرگز نہ مانوں گا۔ میم صاحبہ کا حکم کیوں کر ٹالوں گا۔ اس نے یہ سن کر اپنے افسر کو اطلاع دی جو اندر سے نکلا اور کہا کیوں کر آیا ہے؟ میں نے کہا فلانی میم صاحبہ نے جہنم کو بھیجا ہے اس نے جواب دیا کہ یہاں نیٹوکا کچھ کام نہیں یہ تو بڑے آدمیوں کی جگہ ہے۔ میم صاحبہ کا غصہ فرو ہو چکا تھا۔ یہ سن کر خفت سے مسکرائیں اور خانساماں قصور معاف فرمایا"(۲۱)

سرسید اور علی گڑھ تحریک کو طنز و تمسخر کا نشانہ بنایا ہے اور آزادیٔ نسواں کی سخت مخالفت کرتے ہوئے ایسے حضرات کی طنز و تضحیک کی ہے جو اس کے بڑے طرفدار تھے جب سرسید احمد خان مسلمانوں کی سیاسی سماجی اور مذہبی اصلاح کے لیے قدم اٹھایا تو منشی سجاد حسین اودھ پنچ کے ذریعے اس کی مخالفت کی۔ ایک ہندوستانی کے ہی ہاتھوں ہندوستانی تہذیب کے نشانات مٹتے اور مغربی تہذیب کا چراغ جلتے دیکھ کر انھیں ضبط نہ ہو سکا۔ چنانچہ سرسید احمد خاں کی ذات کو لیکر استہزاء اور طنز و تضحیک کے

ایسے وار چھوڑتے جن میں ان کی شخصیت کو مسخ کرنے کی کوشش کی جاتی۔ انھوں نے سرسید کو سر نیچر کا خطاب دے کر علی گڑھ کو ایک لادینی ادارہ اور مغربی تہذیب و تمدن کی اشاعت کا مرکز بنا کر طنز و تمسخر کا نشانہ بنایا۔ تحریک سرسید پر لکھے ہوئے ان کے مضامین علی گڈھ کالج' علی گڈھ کی شہرت، سید صاحب کے واسطے ضروری کام، چھیڑ سید سے چلی جائے اسد' قابل ذکر ہیں۔ سرسید کی تعلیمی کانگریس پر اس طرح طنز کرتے ہیں:۔

> "سرسید کی تعلیمی کانگریس کے اس قدر اجلاسوں کا نتیجہ اس طرح غائب ہے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ اس پر طرہ یہ کہ اب اس بیچاری کا کہیں تھل بیڑہ نہیں لگتا۔ دھوبی کے کتے کی طرح گھر کا نہ گھاٹ کا۔ پٹنے والوں نے دور سے دھتا بتائی اب بمصداق دست شکستہ وبال گردن یہ بھی علی گڈھ کے گلے میں لٹکائی جائیگی اگر کوئی دوسرا غیرت مند ہوتا تو ایسے فضول ڈھکوسلے کو کب کا خیر باد کہہ چکا ہوتا۔ مگر بے شرمی و بے حیائی بھی استقلال کے واسطے ایسی جگہ بڑی نعمت ہے ہم سمجھتے ہیں بہتر ہوتا کہ اس پیرانہ سالی میں اس سالانہ بازیچہ اطفال سے کنارہ کشی کی جاتی ورنہ اندیشہ ہے حقا شماری کرنے والے فہرست ممبران کی نقل کام میں لایا کریں گے"(۲۲)

انھوں نے آزادئ نسواں اور تعلیم نسواں کی بھی سخت مخالفت کی۔ مغربی اثرات سے خواتین میں انگریزی تعلیم اور بے پردگی کا جو دور دورہ شروع ہو گیا تھا اس سے وہ ہمیشہ نالاں رہے اور اس کی ذمہ داری انھوں نے ان مصلحین کے سر تھوپی جو تعلیم نسواں اور بے پردگی کی حمایت میں اصلاح کے نعرے لگا رہے تھے چنانچہ انھوں نے اپنے اکثر مضامین میں خواتین سے زیادہ ان حضرات کو طنز و تضحیک کا نشانہ بنایا ہے جو اس کے بڑے علم بردار تھے۔ ایک مضمون "سہل لٹکہ" میں لکھتے ہیں: "آج کل بعض خواہ مخواہ کے روشن خیال گروہ میں اس بات کی سخت کوشش ہو رہی ہے کہ جس طرح ہو عورتوں کا پردہ اٹھا دیا جائے ساری برکتیں اسی میں مخفی ہیں اور مسلمانوں کی یہ ردی حالت اسی بدولت پہنچی ہوئی ہے۔ بی صاحب نے پردہ اٹھایا چہرۂ بے نقاب کا جلوہ دکھایا اور دنیا کی بہبود اور ترقی گدا گد آسمان سے گرنا شروع ہو گئی۔ مردوں کا پڑھنا لکھنا کام کاجی ہونا کچھ ضروری نہیں صرف عورتوں کو پردے سے نکالیں، درشنی ہنڈیاں بھنانا شروع کریں۔۔۔۔ پردہ آپ سے آپ پھٹ کے جگر عاشق یا چھوٹی ہوئی مہتاب یا چاندنی مارا کتاں ہو جائے۔ پھر نہ مردوں کو غیرت نہ عورتوں کو حجاب۔ تہذیب و ترقی کا مرغا آٹھویں پہر ککڑوں کوں بولا کرے۔

یعنی پہلے تو سور کا گوشت بجائے بکری وغیرہ کے بیچا جائے۔ پھر شراب کی بوتلیں بلا قیمت مفت تقسیم ہوا کریں اور جس قدر بکریاں ملیں سب مول لیکر سوروں سے بدل لی جائیں۔ پرانے مسلمان غلہ کھاتے کھاتے اکتا ہی جائیں گے۔ بقر عید کو یہی جانور

ذبح کریں گے۔ بس ان دونوں چیزوں کے استعمال سے غیرت اور حجاب دونوں کافور ہو جائیں گے۔ اور پھر بے پردگی پر نہ کوئی جھگڑا ہوگا نہ مقدمہ قتل و خون دائر ہوگا اور کام بھی بلا خرشہ جاری ہو جائے گا" (۲۳) ایک اور مضمون میں مصلحین کو عورتوں کی بے پردگی کے نتائج سے اس طرح آگاہ کرتے ہیں: "روشن خیال میں ریفارمروں کو چھچھوندر کہاں گھسیٹ لے گئی کس بل میں گھس رہے۔ ذری ادھر وار کو آئیں زبانی جمع خرچ خالی خولی تبولے بازیوں بے کار کی ٹھائیں ٹھائیں مفت خدا کی جھائیں جھائیں سے کام نہیں چلتا۔۔۔۔ خلاصہ حاصل کلام آنکہ پردے کے خلاف عرصے سے بکواس سے دماغ پریشان ہوتے ہوتے اب خدا خدا کر کے یہاں تک نوبت پہنچی کہ لاکھ لاکھ منت سماجت فہمائش اور فہمانید سے چند لوگوں کی گھر بسی پردے سے قدم ناز باہر نکالنے پر راضی ہوئی تھیں۔۔۔۔ اب بڑی مصیبت بثیر ھب فرمائش یہ آپڑی کہ تاج پوشی کے جشن میں اس سال دتی کی ہوا سائی اب جس قدر مصارف اور آمدرفت کی وقت چیقلش دھوم دھڑکے کا عذر کیا جاتا ہے اسی طرح زمانہ اشتیاق کی آگ اور بھی بلند ہوتی ہے واہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ دنیا دلی کو امنڈ چلی جاتی ہے اور ہم گھر میں بیٹھ کر کے مکھیاں مارنے کو چھوڑ دیئے جائیں۔ ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے ہم تو جائیں اور ضرور جائیں گے۔ جب ناچنے نکلے تو گھونگھٹ کا ہے کا۔ پردے سے نکلے ہیں تو پھر گھر میں بند ہونے کو۔۔۔۔ کیا اب بھی ہم محروم رہیں۔ جس طرح سن تین شاہ ایڈورڈ کی تخت نشینی کے واسطے یادرہے گا اسی طرح ہندوستانی عورتوں کے پردے سے باہر نکلنے پر بھی مشہور رہے گا" (۲۴) انھوں نے معاشرے کی عام خرابیوں اور نقائص کو بھی اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ اکبر نزدیک انگریزوں کا ایک بڑا مقصد لوگوں کو اپنے آباواجداد کے کارناموں سے غافل کرنا تھا کیونکہ آباواجداد کے افسانے محکوموں کے جوش اور جذبے کو زندہ رکھتے ہیں۔ بقول اکبر:

نقص تعلیم سے اب اس کی سمجھ ہی نہ رہی
دل تو بڑھ جاتا تھا اجداد کے افسانے سے

غرض اس جدید تعلیم پر اکبر کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اس نے لوگوں کے اذہان تبدیل کر دیے ہیں۔ لوگ سپنسر' مل' ڈارون' ہکسلے وغیرہ کے مطالعے سے جدید فلسفیانہ نظریات سے کچھ نہ کچھ واقف ہو گئے تھے۔ انگریزوں نے چونکہ انہی جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو تقرب سے نوازا تھا اور ان کے لیے نوکریوں کا بندوبست کیا تھا اس لیے ایک غریب اور مفلوک الحال معاشرے میں ان کے رعب داب کا قائم ہو جانا ضروری تھا۔ ان لوگوں نے ایسے فلسفے پڑھے جو نفع پرستی کی طرف لے جاتے تھے۔ قوم یا جماعت کی بجائے انفرادیت پر زور دیتے تھے۔ اس لیے ان کو پڑھ کر لوگ اپنے مقام اور ذات کو بلندی پر جانے کی کوششوں میں مشغول ہو گئے اور مفاد قومی کو پس پشت ڈال دیا۔ چونکہ ان تازہ واردان کو معاشرے میں انگریزوں نے مرتبہ دلوایا تھا اس لیے وہ انگریزی تعلیم و تہذیب اور معاشرے کے زبردست حامی بن گئے انگریزوں کی طرح رہتے تھے اور

انگریزی بولنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ ورڈزورتھ' شیکسپیئر اور پوپ کے شعر پڑھتے تھے اور یورپی فلسفیوں کے اقوال کے حوالے دیتے تھے۔ وہ قدیم تعلیم یافتہ لوگوں کو ان پڑھ سمجھتے تھے۔ اپنے آباواجداد سے باغی تھے۔ اکبر ذیل کے اشعار میں نئی تعلیم کے انہی نتائج کو ظاہر کرتے ہیں:

پنڈت ہو کہ مولوی ہو دونوں بیکار
انسان کو گرایجویٹ ہونا اچھا

اس کے علاوہ اکبر مغربی تعلیم کے عام انداز سے بھی مطمئن نہیں تھے۔ ان کے نزدیک ہندوستان میں انگریزی تعلیم سے لوگوں کو صرف یہ فائدہ ہوا کہ اس سے وہ معمولی درجے کی ملازمتیں حاصل کرنے کے قابل ہوگئے:

میں کیا کہوں احباب کیا کارنمایاں کر گئے
بی اے کیا' نوکر ہوئے ' پنشن ملی اور مر گئے

گویا اس تعلیم کا مقصد خاص حالات میں کام کرنے والے خواندہ افراد پیدا کرنا تھا۔ لائق' باہنر اور ذہین افراد پیدا کرنا نہ تھا۔ ہندوستان میں انگریزی تعلیم زیادہ تر آرٹس کے مضامین تک محدود رہی۔ سائنس اور سائنسی ترقیات کے متعلق جدید خطوط پر تعلیم دینا انگریزوں کا منشاء ہی نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں آرٹس کے عام مضامین تو بے شمار اداروں میں پڑھائے جاتے تھے لیکن سائنس' زراعت' صنعت وحرفت' طب' انجنیری وغیرہ کی تعلیم دینے والے ادارے خال خال تھے۔

جدید تعلیم کے موضوع کے ساتھ ہی ایک اور مضمون کثرت سے اکبر کے کلام میں موجود ہے۔ اس مضمون کی ایک ظاہری علامت سرسید احمد خاں ہیں مگر در حقیقت اس کا ہدف جدید تعلیم یافتہ افراد ہیں۔ اکبر نے کہیں ان لوگوں کا مضحکہ اڑایا ہے اور کہیں سنجیدگی سے دلائل کے ساتھ ان کی باتوں کو رد کیا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ افراد میں سے بیشتر مسلمان علی گڑھ کالج سے تعلیم حاصل کر کے نکلے تھے اس لیے اکبر کی تنقید کا نشانہ علی گڑھ کالج بھی بنا ہے۔ اور چونکہ علی گڑھ کالج سرسید احمد خاں کا کارنامہ تھا اس لیے سرسید احمد خاں بھی اکثر اوقات موضوع شعر بن جاتے ہیں۔ علی گڑھ' سرسید احمد خاں اور جدید تعلیم یافتہ افراد ایک ہی مثلث کے تین ضلعے تھے۔ سرسید اپنی جدوجہد کو تعلیم تک ہی محدود رکھتے تو ان کی زیادہ مخالفت نہ ہوتی۔ بدقسمتی سے انہوں نے ایک مصلح اور مجدد کا کردار بھی ادا کرنا شروع کر دیا۔ ان کی سب سے زیادہ مخالفت ان کے مذہبی مضامین کی وجہ سے ہوئی۔ ان کی تفسیر قرآن میں جو بات انتہا تک جا پہنچی' اس کا آغاز بہت پہلے سے بعض مضامین میں ہو چکا تھا۔ ان کے مذہبی نظریات عام مسلمانوں سے اس قدر مختلف تھے کی بعض لوگ جو تعلیمی میدان میں ان سے تعاون کرنا چاہتے تھے' وہ بھی ان

خیالات کی وجہ سے ان سے الگ رہے۔ ان کے قریبی رفقا مثلاً محسن الملک' نذیر احمد حالی' وقار الملک اور شبلی تک ان کے بیشتر مذہبی نظریات سے اتفاق نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے دوسرے لوگوں کو ان س جس قدر اختلاف ہو سکتا تھا ظاہر ہے۔ ان نظریات کا دائرہ تصور باری تعالیٰ سے لے کر معمولی معمولی معاشرتی مسئلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ سرسید احمد خاں اور ان کے مداح یہ کہتے ہیں کہ ان کے ہاں بیشتر نظریات وہی ہیں جو زمانہ قدیم سے اسلامی تاریخ میں چلے آتے ہیں۔ مگر حالی نے "حیات جاوید" میں لکھا ہے کہ ستاون مسائل میں انہوں نے مروجہ عقائد کا اتباع کیا ہے جبکہ تیرہ مسائل میں انہوں نے ذاتی اجتہاد کیا ہے۔

سرسید احمد خاں کے ان نظریات کی تہ میں جدید علوم بالخصوص سائنس اور فلسفے کی ترقیوں کا خوف چھپا ہوا ہے۔ انیسویں صدی کے انگلستان میں سائنسی اور فلسفہ لوگوں کو تیزی سے لامذہب بنا رہا تھا۔ اس زمانے میں عقلیت اور منطقیت اور نیچریت کے الفاظ پورے یورپ کے ذہن پر چھا گئے تھے۔ انگلستان' فرانس اور جرمنی میں خاص طور پر اس قسم کو بڑا عروج حاصل ہوا تھا۔ سائنسی ترقیوں اور ایجادوں نے لوگوں کو یقین دلا دیا تھا کہ انسان ہر چیز ہر قادر ہے۔ چنانچہ ہر چیز کو سائنسی فارمولوں کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔

سرسید نے لوگوں کو تعلیم جدید کی طرف راغب کیا تھا۔ اس کے نتائج یورپ کی حد تک ان کے سامنے تھے' اس لیے انہیں خوف تھا کہ ہندوستان کے مسلمان بھی لامذہب ہو جائیں گے۔ اس وجہ سے انہوں نے قرآن کو عقل اور فطرت کے معیاروں کے مطابق بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی تا کہ جدید تعلیم کے حصول کے باوجود لوگ مسلمان ہی رہیں۔ اس لیے انہوں نے قرآن کی وہ تمام چیزیں جو خلاف معمول تھیں' معمولی اور عام فہم بنا کر پیش کیں۔ ان کی کوشش اس لحاظ سے قابل تحسین ہے کہ ان کا مقصد نیک تھا مگر اس کی بنیاد غلط تھی۔ سرسید کا خیال تھا کہ قرآن کریم خدا کا قول ہے اور فطرت فعل ہے اور چونکہ خدا کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں ہو سکتا اس لیے قرآن میں جو کچھ کہا گیا ہے' وہ فطرت سے سر مو انحراف نہیں کر سکتا' اور اگر اس میں ہمیں کچھ باتیں خلاف عقل نظر آتی ہیں تو یہ ہمارے اپنے فہم کی کوتاہی ہے۔ مگر قرآن میں بے شمار ایسی باتیں موجود ہیں جو عقل اور فطرت کے مطاق نہیں ہیں۔ اس تضاد کو حل کرنے کے لیے سرسید نے ان تمام باتوں کی عقلی توجیہ کی۔ یہ بات اس لیے غلط ہے کہ خدا قادر مطلق ہونے کی حیثیت سے اس بات پر حاوی ہے کہ کسی وقت بھی فطرت کے قوانین کو معطل کر کے مافوق الفطرت کو وجود میں لائے۔ معجزات وغیرہ کی اصلیت یہی ہے۔ مگر سرسید اس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا نے جو قانون قدرت بنا دیا ہے' اس کو وہ کبھی نہیں توڑتا۔ یہی سرسید احمد خاں اور عام مسلمانوں میں اختلاف کی بنیاد ہے۔

اب اگر خدا نے قانون قدرت بنا دیا ہے اور یہ قانون قدرت دائمی ہے تو خدا کی اپنی حیثیت کیا ہے؟ سر سید احمد خاں کے نزدیک خدا کی حیثیت "سبب اول" کی ہے یعنی کائنات میں ایک بات دوسری بات کا نتیجہ ہوتی ہے اور دوسری بات تیسری کا' حتیٰ کہ یہ سلسلہ اسباب پیچھے ہٹتے ہٹتے خدا تک پہنچتا ہے جو ہر شے کے آغاز کا سبب اول ہے' جہاں سے دیگر اسباب یکے بعد دیگرے وجود میں آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح خدا کے قادر مطلق ہونے کی نفی ہو جاتی ہے۔ ضب خدا کے بارے میں سر سید اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وہ سبب اول ہے اور کائنات اسباب و علل کا ایک سلسلہ ہے تو لا محالہ تمام مافوق الفطرت واقعات کوئی وجود نہیں رکھتے۔ یہاں پہنچ کر سر سید الجھن کا شکار ہو جاتے کیونکہ قرآن مجید میں جنت' دوزخ' فرشتہ' جن' شیطان' خضر' وحی اور معجزات وغیرہ کا ذکر آتا ہے۔

اس بحث سے یہ نتائج نکلتے ہیں کہ علی گڑھ کالج کے قیام سے سر سید کا مقصد مسلمانوں کو ملازمتیں دلانا تھا۔ اور انگریزوں کا مقصد مسلمانوں کو برطانوی سرکار کی وفادار رعایا بنانا تھا۔ کالج میں زیادہ زور تعلیم و تدریس کی بجائے کھیل تماشوں اور غیر نصابی سرگرمیوں پر دیا جاتا تھا' اس لیے طلبہ امتحانات پاس تو کر لیتے تھے مگر ان میں قابلیت پیدا نہیں ہوتی تھی۔ وہ لباس' گفتگو اور عادات میں انگریزوں کی تقلید کو باعث فخر سمجھتے تھے اور اپنی قوم کے پرانی وضع کے بزرگوں کا مذاق اڑاتے تھے۔ ان اقتباسات کو پڑھ کر علی گڑھ کے متعلق اکبر کی تنقید پڑھی جائے تو وہ انصاف پر مبنی نظر آنے لگتی ہے۔ اکبر کو بھی علی گڑھ کے ادارے پر زیادہ تر اسی قسم کے اعتراضات ہیں وہ علی گڑھ کے قیام کو محض حصول ملازمت کا ذریعہ گرار دیتے ہیں:

ہاں علی گڑھ کی بھی تم تشبیہ لو
اک معزز پیٹ بس اس کو کہو

موضوعاتی اعتبار سے اکبر نے اپنی شاعری میں جس چیز کو سب سے زیادہ ہدف تنقید بنایا ہے وہ مغربیت ہے۔ اکبر مشرق کے دلدادہ تھے اور مغربیت سے متنفر اس میں وہ اس حد تک بڑھے ہوئے تھے کہ بعض اوقات حد اعتدال سے بھی گزر جاتے۔ "اودھ پنچ" نے سر سید اور علی گڑھ تحریک کے خلاف جو معرکے برپا کیے اکبر ان میں پیش پیش تھے۔

اودھ پنچ سے اکبر الہ آبادی کی ایک اور حیثیت بھی سامنے آتی ہے اور وہ ہے نثر نگار کی حیثیت۔ نثر میں بھی اکبر نے طنز و مزاح کا اسلوب اپنایا ہے۔ الف۔ ح الہ آبادی کے نام سے نثری مضامین لکھتے تھے۔ "کوئی کہتا ہے دیوانہ کوئی کہتا ہے سودائی"۔۔۔ "سسرال کی گالی کا برا مانے سو بھڑوا"۔۔۔ "ایک نادان خوش اعتقاد کی دعا" اور "لطیفہ عبرت انگیز و حکمت آمیز" وغیرہ ان کے دلچسپ مضامین میں شمار ہوتے ہیں اگرچہ شاعری کی طرح اکبر نثر میں تو کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام نہ دے

سکے۔ لیکن دلچسپ زبان اور ظرافت کا چٹخارا ان کی نثر میں بھی موجود ہے۔ سرسید کے ساتھ اکبر کی مخالفت جدید تعلیم کی وجہ سے تھی، وہ سمجھتے تھے کہ یہ تعلیم مسلمانوں کو اپنے اسلاف، تاریخ، تہذیب اور دین سے منحرف کر دے گی۔ اس لیے انھوں نے پوری پوری کوشش کی کہ مسلم قوم کو اس جدید تعلیم سے روکا جائے۔ لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ:

واہ کیا راہ دکھائی ہمیں سرسید نے
گر دیا کعبہ کو گم اور کلیسا نہ ملا

انھیں سرسید سے شکایت تھی کہ ان کا ادارہ مسلم قوم کو تعلیم یافتہ کم انگریزوں کا خدمت گار زیادہ بنا رہا ہے اور انھیں اخلاقی طور بھی کمزور کر رہا ہے۔ اس میں اکبر نے سید احمد خاں کی انگریز دوستی اور مذہبی عقائد پر طنز کیا ہے۔ ”سید احمد خاں دوسرے خیال کا کہن سال انسان ہے۔ وہ نیچر مرحبا تجھ پر اور تیری ہفتاد پشت پر کہ تو نے ایسی قوم کو پیدا کیا جیسے انگریز ہیں۔ ہم کو ایسے گورے چٹے خوب صورت بالا بلند عالی حوصلہ جفاکش دلیر غیور دانش مند حکیم مزاج حکام کہاں ملیں گے۔ ہم کو مذہب کی قید سے آزاد کون رکھے گا۔ ہم کو دوزخ کے جھوٹے دھڑکوں سے کون نجات دے گا۔ ہم کو اچھی اچھی نوکریاں کون دے گا۔ ہم میں ایسی باریکی سے کون انصاف کرے گا۔ اے نیچر! ان انگریزوں میں جو رہی سہی ایک دو تین چار پانچ چھ سات آٹھ نو دس گیارہ (للہ انتصار مد نظر رکھیے) بُرائیاں ہیں ان کو بھی دور کر دے اور تا قیام دہر ان کو ہمارے سر پر سایہ فگن رکھ اور ہم لوگ یکدل ہو کر ہل مل پنیاں کو جائے ری نندیا گایا کریں۔“(۲۵) تعلیم نسواں پر آزاد نے اپنی ”نئی ڈکشنری“ میں جو اظہار خیال کیا ہے وہ بحث طلب اور اختلافی ہے لیکن بہر حال ان کی اور اس دور کے کئی لوگوں کی ذہنیت اور تعلیم نسواں پر ان کے خیالات کا مظہر ضرور ہے۔ لکھتے ہیں:

> ”فیمیل ایڈوکیشن (تعلیم نسواں): عام جلسوں میں اپنی بہو بیٹیوں کو لے جانا، اپنی میم کا ناچنے کے جلسے میں ایک وقت کے لیے دوسرے کی میم سے مبادلہ کرنا، کمزور لڑکیوں کو تھوڑا تھوڑا پوٹ پلانا، مس بابالوگوں کو ہوا کھلانا، کالی میموں کو انگریزوں کی ملاقات کے لیے جبراً و قہراً لے جانا اور اگر وہ وہاں جا کر شرمائیں تو جوش تہذیب سے گھونگھٹ کھول دینا۔“(۲۶)

جدید تعلیم پر اودھ پنچ کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اس نے یہاں کے لوگوں کے اذہان تبدیل کر دیے ہیں۔ اور مغربی تہذیب کو باعث فخر بنا دیا ہے۔ اودھ پنچ کے ایک مضمون ”مراسلات دکن“ میں اس کی بانی خاتون غوثیہ بیگم کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

"ولایت میں تو اسکی نظیریں بہت ہیں کہ بیویوں نے ملکی معاملات اور تمدنی امور میں اپنے شوہروں کا ہاتھ بٹا کر کیسے کیسے نام نیک پیدا کیے ہیں۔ لیکن ہندوستان بھی ماشاللہ ایسی مثالوں سے خالی نہیں۔ سب سے روشن نظیر نور جہاں کی ہے جس نے اپنے متوالے تاجدار عاشق کو بار انتظام سلطنت سے کس خوبی کے ساتھ سبکدوش کیا تھا۔ سنتے ہیں غوثیہ بیگم اسی قسم کی روشن نظیروں کی پیروی کرنی چاہتی ہیں۔"(۲۷)

اس تعلیم کے نتیجے میں کچھ لوگ انگریزی تعلیم و تہذیب اور معاشرت کے زبردست حامی بن گئے۔ انگریزوں کی طرح رہنے اور انگریزی بولنے پر فخر محسوس کرتے تھے۔ ورڈزور، شکسپئر اور یورپ کے شعر پڑھتے تھے اور یورپی فلسفیوں کے اقوال کے حوالے دیتے تھے۔ وہ قدیم تعلیم یافتہ لوگوں کو ان پڑھ سمجھنے لگے تھے۔ اودھ پنچ میں راقم نے سرسید کے اس بیان پر مزاحمت کی: "انگریز ہندوستانیوں کو بالکل جانور سمجھتے ہیں اور نہایت حقیر جانتے ہیں، ہماری غلطی تھی۔ وہ ہم کو سمجھتے ہی نہیں تھے بلکہ در حقیقت ہم ایسے ہی ہیں۔"(۲۸) دیکھیے:

"ادنی سی بات یہ ہے کہ جب دیکھئے اسی کا رونا ہے اس ملک کے لوگ کمزور، کم محنت، ضعیف الجثہ، وحشی، بے تمیز، پھوہڑ، بدسلیقہ، بے علم گھامڑ ہیں۔ اور ونسے تہذیب تعلیم صفائی جسمانی اور دماغی محنت میں کم سن لاکھر کہا جائے۔ اس کاروائی سے انکی تخفیف ہو جائیگی خس کم جہان پاک جو مہذب ہونگے وہی بچیں گے گویا ملک میں نئے سرے سے صفائی کیا صفایا ہو جائے گا۔ ملک نئے سرے سے آباد ہو گا۔ تہذیب اور سلیقہ کا دورہ ہو گا۔"(۲۹)

سرسید کے بعض عقائد در حقیقت مغربی تہذیب و فلسفہ کی مدافعت میں ایک اجتہاد کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں ان سے لغزش ہوتی ہے۔ اودھ پنچ کے مضمون "دلبر سے جدا ہونا یا دل کو جدا کرنا، اس فکر میں بیٹھا ہوں آخر مجھے کیا کرنا" میں بھی نذیر احمد پر سرسید کی نیچر کے اثر کا الزام لگایا گیا ہے کہ: "مولوی نذیر احمد صاحب کے ترجے کو شاید لوگ اس خیال سے نہ پسند کریں کہ وہ ایک نیچریوں کی تتبع کا ہے۔"(۳۰) اب قوم تھی اور اس کے سر پر جادوئے فرنگ۔ ہر طرف سحر سامری کا دور دورہ، ہر سمت سے دجالی تہذیب کا حملہ۔ معیار کمال یہ ٹھہرا کہ انگریزی بولنا آجائے، لب و لہجہ صاحب کا سا ہو جائے۔ ڈگریاں اور امتحانات سرکاری نصیب میں آجائیں، اپنی زبان بگاڑ کر بولی جائے۔ ایک اور جگہ اودھ پنچ میں جدید تعلیم پر رقم طراز کیا ہے: "تازہ ولایت صاحبزادے۔ ہائی ایجوکیشن پایا۔ کیسا بات البست ہائی سوسائٹی میں سوار کیا۔ جنٹلمین ہمکو گریٹ پوٹنٹیٹ کا سن سمجھتا تھا۔ ہائی سویلنبریشن ہے وہاں۔(۳۱) مزید ارقام کرتے ہیں: "مکتبوں اسکولوں کے لونڈوں کو تو دین و دنیا میں کہیں کا نہ رکھیں گی۔"(۳۲)

گویا اس تعلیم کا مقصد خاص حالات میں کام کرنے والے خواندہ افراد پیدا کرنا تھا۔ لائق، باہنر اور ذہین افراد پیدا کرنا نہ تھا۔ ہندوستان میں انگریزی تعلیم زیادہ تر آرٹس کے مضامین تک محدود رہی۔ سائنسی اور سائنسی ترقیات کے متعلق جدید خطوط پر تعلیم دینا انگریزوں کا منشا ہی نہیں تھا۔ مجلہ میں رقم طراز ہے کہ

"یہ بات ہماری آپکی سمجھ میں نہ آئے نہ سہی مگر اس گر کو امریکہ کی عورتوں نے پالیا۔ بس اسی وجہ سے توانھوں جتھا کر کے حال مین سوسائٹی قایم کی ہے کہ نوجوان عورتیں بیاہ سے روکی جائیں۔ چلئے صاحب جب عورتوں کی طرف سے اس طرح کھینچ تان ہوگی تو آخر مرد صاحب کیا کریں گے۔ بہت دن کی لیں گے جنگل میدان کا رستہ لیں گے۔ بقول شخصے۔ رانی روٹھیں گی اپنا راج لیں گی یا کسی کا سہاگ۔" (۳۳)

اودھ پنچ نے اس وقت کے تہذیبی افکار کی خوب مزاحمت کی۔ کہ اگر عورتیں پردہ نہ چھوڑیں گی تو ہم ترقی ہی نہیں کر سکیں گے۔ مصنف لکھتا ہے کہ: "عورتیں جب تک پردے سے نہ نکلیں گی ہم کسی طرح مہذب نہیں ہوسکتے گویا انکے پاس مہذب بن جانے کا ڈپلومہ آگیا ہے اور تہذیب کا سرٹیفکیٹ بغل میں" (۳۴) مغربی تعلیم وتربیت کا سکہ پوری طرح رائج ہو چکا تھا۔ اس کے اثرات زبان اور ادب پر بھی بخوبی ہو رہے تھے اور مشرقی تصورات کی مرمت اور اہمیت کم ہو رہی تھی۔ اودھ پنچ کے مغرب کو اپنے مطاعن کا ہدف بنا کر تمام مشرق کی طرف سے کفارہ ادا کر دیا ہے۔ راقم لکھتے ہیں کہ: "آپ نے تو بیڑا اٹھا لیا ہے کہ اردو شاعری کا ستیاناس پورے طور سے کیا جائے اور کوئی وجہ نہیں صرف آپ کے مقتضائے طبعیت ہے۔ مگر واللہ اردو اشعار کو انگریزی جامہ پہنانا ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے عزارہ دار پانجامہ پر پتلون پہن لیا مگر یہ نہ سمجھے کہ آپ ہی اس رنگ میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ اسی طرح کل نظم میں خرفات کا انبار لگا ہوا ہے۔ اردو شاعری کی گردن کند چھری سے رہتی ہے۔ واقعی افسوس کا مقام ہے۔ اردو شاعری نے کیا کیا رنگ دیکھے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ اسنے عالم طفولیت میں سودا ومیر ایسے باکمالوں کے دامن میں پرورش پائی۔ آتش۔ ناسخ۔ غالب۔ ذوق نے اسکا شباب دیکھا اب بیچاری حضرت داغ سے بوڑھے غمزے کر رہی تھی کہ مولانا حالی نے کلمہ پڑھ کر گلے پر چھری پھیر دی۔ اب کبھی کبھی فاتحہ پڑھ لیتے ہیں۔" (۳۵) اودھ پنچ کو مولانا حالی سے دو شکائتیں تھیں۔ پہلا اعتراض تو یہ تھا کہ مولانا حالی کا شاعری کا مفہوم غلط ہے جس کو وہ شاعری سمجھتے ہیں وہ محض قافیہ پیمائی ہے اور فطری شاعری کی لطافت ورنگینی سے خالی ہے اور اختلاف کی دوسری وجہ ان کا اردو شاعری میں انگریزی الفاظ کا بے تکا استعمال تھا۔ اگر نفس مضمون کو دیکھیں تو ماننا پڑے گا کہ اودھ پنچ کی شکایت بے بنیاد نہیں تھی۔ ہندوستان کے بہت سے لوگ سمجھتے تھے اور اب بھی سمجھتے ہیں کہ اگر ہندوستان برطانیہ کے ماتحت نہ آتا تو ہم تعلیمی، صنعتی، انتظامی اور تہذیبی اعتبار سے پس ماندہ ہوتے۔ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہنوں میں خدا جانے یہ تصور کیوں جاگزیں ہو گیا ہے کہ برطانوی حکومت نے

ہندوستان میں نہ صرف امن واماں پیدا کیا بلکہ یہاں کے لوگوں کی خوش حالی کے لیے جدید ذرائع آمد و رفت اور رسل و رسائل پیدا کئے۔ عدالت اور پولیس کا نظام رائج کر کے سابقہ لاقانونیت کو ختم کیا۔ جدید سائنسی علوم کی تعلیم لوگوں کو دی۔ نہروں اور ریلوں کا جال بچھا دیا۔ جس سے پیداوار میں اضافہ اور نقل و حمل میں سہولتیں پیدا ہوئیں وغیر ہم۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ برطانوی حکومت نے نسل بعد نسل یہ باتیں نصابی کتابوں کے ذریعے لوگوں کے ذہنوں میں راسخ کر دی تھیں۔ یہ پروپیگنڈا ہمیں اس بری طرح سے متاثر کر گیا کہ ہم انگریزوں سے قبل کی حکومتوں کو بدانتظام، وحشی اور ظالم سمجھنے لگے۔ اودھ پنچ میں جب برطانوی کے ظلم وجور، لوٹ کھسوٹ اور سازشوں سے متعلق حقائق کی نقاب کشائی کرتے ہیں تو لوگ انہیں نفسیاتی کوتاہیوں کا شاخسانہ قرار دینے لگتے ہیں۔ "سب صورت تہذیب فقط دم کی کسر ہے" مضمون میں راقم کہتا ہے "آجکل تہذیب و شائستگی سے ہندوستان کے سر پر شائستگی کا ایسا دھوندو کار اچھایا ہوا ہے کہ ہمالیہ کی چوٹیوں پر بھی شدید کوئی ابر آتا جاتا ہوگا۔'(۳۶) "رنگ میں بھنگ یا بلم پتر کی تان میں گنکری" میں ارقام ہے کہ:

> "انقلاب زمانہ سے واجد علی شاہ کی رہس منزل کی سارا۔ گا۔ ما۔ پا۔ دھا۔ نی کی جگہ کیننگ کالج علوم مغربی کی تعلیم کو قائم ہو تو اسکے لوازم ناچ گانے رنڈی بھڑ دونکے جلسہ کو۔۔۔ تو اس کو تہذیب کیوں نہ خفگی سے دیکھے۔"(۳۷)

اودھ پنچ کے نزدیک تعلیم ایسی ہونی چاہیے جو انسانوں کو تہذیب، دیانت اور شرافت سکھائے انہیں روحانی ترقیاں اور اطمینان قلب بخشے مگر تعلیم قوموں اور انسانوں کو گروہوں میں بانٹ دے، مختلف طبقات میں منافرت پیدا کرے اور محض مادی مفادات کے حصول کی طرف مائل کرے وہ قابل ترویج نہیں ہے اور اس سے عالم انسانیت کی تذلیل نہیں کی جانی چاہیے۔ مغربی تعلیم ہمارے نوجوانوں کو اپنی تہذیب، تاریخ، مذہب، قوم اور ذہنی سرمائے سے غافل کر رہی ہے۔ ہم یورپ کی ہر بات کو صحیح اور ایشیاء کی ہر بات کو غلط سمجھتے ہیں۔ مگر جدید تعلیم کے اثرات کچھ اس شکل میں نظر آنا شروع ہو گئے تھے۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس پر اکثر طنز و مزاح کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں ایک مضمون میں مصنف بیان کرتے ہیں کہ کانفرنس میں ایک خاتون تقریر کرتے ہوئے یوں فرماتی ہیں:

> "تمہارے ابرو کے ایک اشارے سے ہزاروں تلواریں میدانوں میں نکل پڑیں گی۔ تم غنچہ وہنو نکی مسکراہٹ ایک طرف اور محسن الملک کی ہزار اعجاز بیانی دوسری طرف۔ تم اگر زبان ہلا دو تو ایک کروڑ روپیہ کا جمع کرنا کیا ہے۔ کروڑ یونیورسٹیاں بنوا سکتی ہو (یہ الفاظ مس بلقیس کے منہ سے ابھی پورے نہیں نکلے تھے کہ آغا خان نے ایک کروڑ روپیہ کے نوٹ بلقیس کے سامنے رکھوا دیے)۔"(۳۸)

علمی ترقی کے نام پر انگریزوں کے اس منصوبے میں بہت سے محب وطن اور ملک و قوم کے خیر خواہ بھی مجبوراً شریک ہو گئے مگر بد قسمتی سے انہوں نے اپنی قوم اور ملک کی ہر چیز کو انگریزوں اور انگلستان کی ہر چیز سے کمتر ثابت کر کے لوگوں میں شدید احساس کمتری پیدا کیا۔ انہوں نے ملکی زبانوں میں تعلیم دینے کی مخالفت کی اور اس طرح ایسے طلبہ کی کھیپ تیار کرنے میں مدد دی جو بقول میکالے: ''خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے، اخلاق اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔'' (۳۹) ''نیچرل ترقیوں کی تشریح'' میں مصنف علمی ترقی کے بارے میں رقم طراز ہے کہ:

''علمی ترقی یہ ہے کہ کچھ انگریزی و نگریزی پڑھ کر فکر کریں۔ موچھوں پر تاؤ کریں۔ اپنے وجود کے سامنے سارے مخلوق خدا کو نرا وحشی اور جنگلی بتلائیں۔ متقدین و متاخرین پر منھ آیا کریں اور ہمدردی کا دعویٰ کریں۔ زبانی اصلاح قوم میں رہیں۔'' (۴۰)

غرض اب جو دور شروع ہوا اسے دور اصلاحات کہنا چاہئے۔ بظاہر یہ اصلاحات ہندوستانیوں کی بھلائی کے لیے تھیں مگر درحقیقت ان کا مقصد انگریزی حکومت کے قدم ملک میں مضبوطی سے جمانا تھا۔ انگریزی تعلیم پر منشی سجاد حسین ''حاجی بغلول'' میں طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''آپ اپنا نام انگریزی میں مسٹر ایچر باگلل اسکوائر دستخط فرمایا کرتے تھے مگر قدغن رہتا تھا کہ اردو میں شائع نہونے پائے۔ کیا سبب۔ اُردو والوں کے تلفظ کی غلطی و تجنیس خطی سے خوف رہتا تھا کہیں خدانخواستہ پاگل نہ مشہور ہو جائیں۔'' (۴۱) جدید تعلیم یافتہ افراد میں سے بیشتر مسلمان علی گڑھ کالج سے تعلیم حاصل کر کے نکلے تھے۔ اس لیے اودھ پنچ کی تنقید کا نشانہ علی گڑھ کالج بنا اور چوں کہ علی گڑھ کالج سرسید احمد خاں کا کارنامہ تھا اس لیے سرسید احمد خاں بھی اکثر ہی اودھ پنچ کے طنز کا نشانہ ہوتے تھے۔ اودھ پنچ میں ایک مضمون ''ہمارے سالانہ مجمعے'' میں سرسید کی تعلیمی سرگرمی کا مذاق اُڑاتے ہوئے مصنف کہتے ہیں کہ: ''تعلیمی کانفرنس: (عرف عرس زندہ سید) ٹین ٹین ٹین ٹین ٹین ٹین ٹین'' (۴۲) جدید تعلیم پر مزید تنقید کرتے ہوئے ارقام کرتے ہیں کہ:

''ایک کتاب ہو تو نام بتاوں۔ یہ دیکھیں ڈیڑھ درجن کتابیں تو یہ موجود ہیں۔۔۔۔ یہ وہ مشرقی تعلیم نہیں ہے کہ چار برس میں کریما پڑی اور وہ بھی مثل طوطے کی معنی طلب ندارد شدان لغت گرفتار کر دا اا ارٹ لیا اور جونپور کے قاضی ہو گئے اجتو اگر میڈل پاس نہو تو کوئی حجامت بھی نہ بنوائے۔'' (۴۳)

سرسید احمد خان پر ''مزہ دار میم'' میں بھی یوں طنز کیا گیا ہے: ''متولی کا باغ پیر نیچر کے لیے'' (۴۴) مزید اسی مضمون میں: ''محڈن میگزین فضولیات کے لیے'' (۴۵) ''اجودھیاجی کی بندر'' میں انگریزی تعلیم کے بارے میں رقم طراز ہے کہ: ''ارے صاحب یہ انگریزی وہ بلا کا علم ہے کہ جسکی تعلیم سے بہت سے لوہار۔ کمہار۔ نائی۔ باری فضل باری سے ایم اے بی اے۔ اے

اس اس.جی ال اور خدا جانے کون کون سی ڈگریاں پاس کر کے اس زمانہ میں اجلاسوں پر بیٹھے ہیں۔" (۴۶)طنز نگاروں کی طرف سے انگریزی تہذیب و معاشرت پر اس انداز سے طنز کیا جاتا تھا کہ ان کا مضحک پہلو نمایاں ہو کر سامنے آ جاتا تھا۔ یہ طنز و مزاح کے اعلیٰ نمونے کیے جاسکتے ہیں:

"سر رشتہ تعلیم والوں کو ہوشیار ہونا چاہیے کہ ان قواعد بدل گئے زنانہ اسکول کی جگہ انھیں شی اسکول کیسا ہو گا۔ مگر ساتھ ہی میل اسکول فیمیل اسکول کہنے کا مضائقہ نہ ہو گا۔ کیونکہ فیمیل کافی دور کرنے سے میل بنتا ہے۔ اسلیے میل ہی فیمیل کا ماتحت رہا" (۴۷)

سر سید جب انگلستان (کیمبرج یونی ورسٹی) گئے تو انہوں نے وہاں کے تعلیمی ماحول سے متاثر ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ ہندوستان میں ابھی اسی طرز کا تعلیمی ادارہ قائم کریں گے وہ ان کی تضحیک کا باعث بنا۔ مصنف ارقام کرتا ہے کہ:"سید مغربی فرماتے ہیں کہ ہم اپنے کالج کو آکسفورڈ اور کیمبرج کر کے رہیں گے۔ آکسفورڈ اور کیمبرج تو جبھی ہو کہ قوم میں سلطنت ہو۔ دولت ہو" (۴۸)مزید

"مگر سید صاحب کا ارشاد ہی ایک طرح سے حق بجانب ہے کیا وجہ کہ قوم کے حال پر روتے روتے اب تو آپ کی وہی کیفیت ہو گئی ہے جو اس بھوکے ملازم کی تھی جو ایک جگہ نوکری کرنے گیا۔ مالک نے ایک انگلی اُٹھائی (کہ خدا ایک یاد) نوکر سمجھا کہتے ہیں ایک روٹی ملا کرے گی۔ اس نے دو انگلیاں اُٹھائیں کہ ایک نہیں دو۔ آپ کو تو ہر فرد کی تصویر میں قوم نظر آتی ہے اور ہر پیچ میں اپنی سعی جلوہ دکھاتی" (۴۹)

اودھ پنچ اور اس کے طنز نگاروں نے مغربی تہذیب اور اس کی چمک دمک کے کھوکھلے پن کو عیاں کرنے کے لیے طنز کے تمام ہتھکنڈے آزمائے۔ "ہمارا مقصد تہذیب نسواں ہے اور اس کے لیے سب سے مناسب طریقہ ہماری سمجھ میں ہی آیا تھا کہ ہندوستان کی پری جمال خاتونوں کو پردے سے باہر نکالا جائے اور خدا کی عطا کردہ لذائذ سے متمتع ہونے کا اولین موقع دیا جائے" (۵۰)اس قسم کی تلخ، ترش، اور طنزیہ تحریروں میں بھی درپردہ اشارہ سر سید کی مصلحانہ کوششوں کی جانب ہوتا اور مقصد ان کی مذمت ہی ہوتی تھی۔ "اودھ پنچ" انگریزی تعلیم کے خلاف ہونے کی وجہ سے سر سید کے نظریات کی شدید مخالفت کر رہا تھا۔ اسی وجہ سے سر سید پر ذاتی حملے بھی کیے جاتے رہے۔ مصنف کہتا ہے کہ:"معلوم ہوتا ہے نیچر نے ہمارے شہر کو مردہ تصور کر لیا ہے" (۵۱)انگریزی تہذیب اور ہندوستانی تہذیب میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی تہذیب اور روایات کبھی نہ ملنے والی دو لکیروں کی مانند ہیں۔ اس لیے مسلمان انگریزی تہذیب کی وجہ سے انگریزی میں تعلیم حاصل کرنے پر بھی آمادہ نہ تھے۔ راقم لکھتا ہے کہ:

"مگر ہائے دنیا کسی طرح نہیں سیکھتی۔ کسی طرح دنیا کا حال نہیں کٹتا۔ علاوہ اسکے انگریزی

عملداری ہو جانے سے اس بات کو لوگ بالکل بھول ہی گئے۔ انگریزی حکومت ۔
انگریزی تہذیب ۔ انگریزی تعلیم نے اسکو اور بھی مٹا دیا۔ انگریز لوگ ظاہری ترقی کے
دلدادہ ہیں۔"(۵۲)

انگریزی تعلیم میں سب سے زیادہ مخالفت عورتوں کی جدید تعلیم پر کی گئی۔ اُن کی آزادی پر شور برپا کیا گیا۔ مصنف مضمون" زنانہ ترقی "میں رقم طراز ہے۔"یہ اب ہندوستان کی ترقی میں بال برابر کسر نہ رہے گی۔ ترقی اور تہذیب کا سلامتی سے وہ طوفان امڈا ہے کہ سارا ملک عنقریب شرابور تھپیت بلکہ مستغرق ہوتا نظر آتا ہے"(۵۳) سرسید نے انگریزی تہذیب کی وجہ سے وہاں کے اخبارات سے متاثر ہو کر مسلمانوں کی کی تہذیبی زندگی میں انقلاب لانے کے لیے اسی قسم کے اخبار ہندوستان میں نکالنے کا فیصلہ کیا۔"رسالہ تہذیب الاخلاق"کا اجراء اسی ارادے کی تکمیل تھا۔ اودھ پنچ کے مضمون "ناقص تعلیم کی مکمل رپورٹ" میں مصنف طنزاً تعلیم کی دو اقسام بیان کرتا ہے اور ساتھ ہی "تہذیب الاخلاق" رسالہ پر بھی طنز کرتا ہے۔

"تعلیم کا لفظ دو معنوں میں بولا جاتا ہے ایک وہ تعلیم ہے حسن خیر حلقوں میں نشاط انگیز طریقے سے بعض خاص آلات موسیقی کے ساتھ کسی بلند مقام پر دی جاتی ہے اس کی رپورٹ اکثر صحبت عیش و نشاط میں 'خدا سلامت رکھے' کے ساتھ شروع کی جاتی ہے اور' کہروا' کے ولولہ انگیز فقروں تمام ہو جاتی ہے ۔ اس تعلیم کو تو نہیں مگر جن کو تہذیب اخلاق کا دعویٰ ہے مخرب اخلاق بتاتے ہیں۔ لہٰذا مختصر طور پر اس روح افزا تعلیم ریاضی کی رپورٹ دو لفظوں میں بند کی جا سکتی ہے' تخریب اخلاق" (۵۴)

مزید: "جدید تعلیم کی نسبت کو کثرت اشاعت پر کتنا ہی مسرت زاغل اور حوصلہ افزا شور کیوں نہ مچایا جاتا ہو مگر یہ کوئی بھی نہیں کہتا کہ وہ کامل ہے"(۵۵) اودھ پنچ کا حلقہ احباب انگیز کو اپنا مکمل دشمن سمجھتے تھے۔ اور انگریزی تعلیم سیکھنا اپنے مذہب کے خلاف تصور کرتے تھے۔ غرض اس جدید تعلیم پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اس نے لوگوں کے اذہان تبدیل کر دیے ہیں۔ لوگ سپنسر' مل' ڈارون' ہکسلے وغیرہ کے مطالعے سے جدید فلسفیانہ نظریات سے کچھ نہ کچھ واقف ہو گئے تھے۔ انگریزوں نے چونکہ انہی جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو تقرب سے نوازا تھا اور ان کے لیے نوکریوں کا بندوبست کیا تھا اس لیے ایک غریب اور مفلوک الحال معاشرے میں ان کے رعب داب کا قائم ہو جانا ضروری تھا۔ ان لوگوں نے ایسے فلسفے پڑھے جو نفع پرستی کی طرف لے جاتے تھے۔ قوم یا جماعت کی بجائے انفرادیت پر زور دیتے تھے۔ اس لیے ان کو پڑھ کر لوگ اپنے مقام اور ذات کو بلندی پر جانے کی کوششوں میں مشغول ہو گئے اور مفاد قومی کو پس پشت ڈال دیا۔ چونکہ ان تازہ واردان کو معاشرے میں انگریزوں نے مرتبہ دلوایا تھا اس لیے وہ انگریزی تعلیم و تہذیب اور معاشرے کے زبردست حامی بن گئے انگریزوں کی طرح

رہتے تھے اور انگریزی بولنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ ورڈز ورتھ، شیکسپئر اور پوپ کے شعر پڑھتے تھے اور یورپی فلسفیوں کے اقوال کے حوالے دیتے تھے۔ وہ قدیم تعلیم یافتہ لوگوں کو ان پڑھ سمجھتے تھے۔ اپنے آباواجداد سے باغی تھے۔

محولہ بالا تمام نثر نگاروں نے اپنے جذبہ و احساس سود وزیاں سے بے پرواہو کر عوام کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ ان مضامین میں بے چینی اور معاشرتی بے اطمینانی کے خلاف احتجاج طنز و مزاح سے ظاہر ہوتا ہے۔ اپنی تمام تر شعوری صلاحیتں معاشرے کے سدھار اور ناروا رویوں کے خلاف شدید ردعمل میں صرف کیں۔ انھوں معاشرے کی بے راہ روی دیکھ کر دوسرے مصلحت پسند لوگوں کی طرح خاموشی اختیار نہیں کی۔ بلکہ اودھ پنچ نے اپنی دور کی منظوم تاریخ اس انداز میں رقم کی جو آج بھی اہمیت رکھتی ہے اور تاحیات مزاحمتی ادب تخلیق کرکے انصاف کی مشعل جلاکر سامراجی و آمرانہ قوتوں کا جواب دیا۔

حوالہ جات:

۱۔ احمد خان، سرسید، مقالات سرسید، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۳، ص ۱۸۴

۲۔ قدسیہ خاتون، سرسید کی ادبی خدمات اور ہندوستانی نشاۃ ثانیہ، س ن، ص ۷۷

۳۔ خلیق احمد، نظامی، سرسید کے سیاسی افکار، س ن، ص ۲۴

۴۔ ایضاً ص ۶۷

۵۔ قدسیہ خاتون، سرسید کی ادبی خدمات اور ہندوستانی نشاۃ ثانیہ، س ن ، ص ۱۷

۶۔ خلیق احمد، نظامی، سرسید اور علی گڑھ تحری ک، س ن، ص ۱۷۶

۷۔ ایضاً ص ۱۴۹

۸۔ ایضاً ص ۱۸۹

۹۔ الحسن نقوی، نور، سرسید اور ہندوستانی مسلمان، س ن، ص ۱۰۹

۱۰۔ رسالہ تہذیب اخلاق

۱۱۔ ایضاً

۱۲۔ مقدمہ تفسیر سرسید، بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ص ۳

۱۳۔ Trevelyas' on the Education of people of India, p.169

۱۴۔ اودھ پنچ، ستمبر، ۱۸۸۲ء

۱۵۔ ایضاً جولائی، ۱۸۸۲ء

۱۶۔ اودھ پنچ، اگست ۱۸۸۰ ء

۱۷۔ ایضاً جنوری، ۱۸۸۳ء

۱۸۔ ایضاًنومبر، ۱۸۸۳ء

۱۹۔ طاہر مسعود، ڈاکٹر، اردو صحافت انیسویں صدی میں، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص ۱۷۱

۲۰۔ اودھ پنچ، مارچ ۱۸۸۵ء

۲۱۔ اودھ پنچ، جولائی ۱۸۸۴ء

۲۲۔ اودھ پنچ، اکتوبر ۱۸۸۱ء

۲۳۔ اودھ پنچ، دسمبر ۱۸۸۱ء

۲۴۔ اودھ پنچ، اپریل، ۱۸۸۷

۲۵۔ مصباح الحسن قیصر، ڈاکٹر، بحوالہ اردو طنز و ظرافت اور منشی سجاد حسین، ص ۱۲۸

۲۶۔ اودھ پنچ، اگست ۱۸۹۰ء

۲۷۔ اودھ پنچ، جولائی ۱۸۹۰ء

۲۸۔ اودھ پنچ، مئی ۱۸۹۰ء

۲۹۔ اودھ پنچ، جنوری ۱۸۹۱ء

۳۰۔ احمد خان، سرسید، مسافر ان لندن، ۱۹۶۰ء، ص ۱۸۳

۳۱۔ اودھ پنچ، فروری ۱۸۹۱ء

۳۲۔ اودھ پنچ، جون ۱۹۰۳ء

۳۳۔ اودھ پنچ، جنوری ۱۹۰۳ء

۳۴۔ اودھ پنچ، جولائی ۱۹۰۳ء

۳۵۔ اودھ پنچ، مارچ ۱۹۰۳ء

۳۶۔اودھ پنچ، ستمبر ۱۹۰۳ء

۳۷۔اودھ پنچ، اکتوبر ۱۹۰۳ء

۳۸۔اودھ پنچ، ستمبر ۱۹۰۳ء

۳۹۔اودھ پنچ، ستمبر ۱۹۰۳ء

۴۰۔اودھ پنچ، دسمبر ۱۹۰۳

۴۱۔زکریا، ڈاکٹر خواجہ محمد، اکبر الہ آبادی (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳، ص ۱۹۳

۴۲۔اودھ پنچ، جنوری ۱۹۰۲ء

۴۳۔اودھ پنچ، فروری ۱۹۰۲ء

۴۴۔اودھ پنچ، جنوری ۱۸۹۶ء

۴۵۔اودھ پنچ، فروری ۱۸۹۶ء

۴۶۔اودھ پنچ، مارچ ۱۸۹۶ء

۴۷۔اودھ پنچ، اپریل ۱۸۹۶ء

۴۸۔اودھ پنچ، اگست ۱۸۹۶

۴۹۔اودھ پنچ، مارچ ۱۸۹۸ء

۵۰۔اودھ پنچ، اکتوبر، ۱۸۹۸ء

۵۱۔اودھ پنچ، جولائی، ۱۸۹۶ء

۵۲۔اودھ پنچ، ستمبر، ۱۸۹۶ء

۵۳۔اودھ پنچ، اکتوبر، ۱۸۹۸ء

۵۴۔ اودھ پنچ، مارچ ۱۸۹۸ء

۵۵۔ اودھ پنچ ، مارچ ۱۸۹۸

باب نمبر ۳

مغربی کلچر اور ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے ادغام پر اودھ پنچ کی نثر کے مزاحمتی رویے

دو مختلف تہذیبیں رکھنے والے گروہ کے باہمی میل جول اور ایک دوسرے سے متاثر ہونے کا قابل اعتماد ثبوت اُن کی زبان سے ملتا ہے۔ اگر جداگانہ زبان بولنے والے گروہوں کی زبانوں میں باہمی اختلاط پایا جائے اور یہ معلوم ہو کہ ہر ایک کی زبان نے دوسرے کی زبان پر گہرا اثر ڈالا ہے تو بہ آسانی یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ان دونوں گروہوں کے درمیان گہرے ثقافتی تعلقات رہے ہوں گے۔ جہاں باہمی اثر اس درجہ قوی ہو کہ اس کی بدولت ایک مخلوط نئی زبان معرض وجود میں آجائے تو یہ لسانی اتحاد یہی طور پر ثقافتی انضمام کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

لفظ ثقافت یا تہذیب، بہت وسیع معنی رکھتا ہے، وہ انسانی زندگی کے اعمال و افعال خواہ وہ ذہنی ہوں یا حسن کا راز، روحانی ہوں یا اخلاقی، سماجی ہوں یا معاشی یا سیاسی سب کو احاطہ کئے ہوئے ہے، اس کا مقام ذہن انسانی ہے وہ ذہن انسانی میں اس طرح جاگزیں ہے کہ سیاسی زندگی کے بدلتے ہوئے حالات جو خاص وعام سب پر اثر انداز ہو کر قوم کے اخلاقی شعور کو درہم برہم کر دیتے ہیں، ان کا اثر قبول نہیں کرتا۔ بس یہی ثقافت اور تہذیب کی روح اور جان ہے۔ بعض دفعہ لوگ مذہب اور ثقافت کو مترادف الفاظ سمجھتے ہیں۔ زندگی کے ان دو پہلوؤں یعنی مذہب اور ثقافت میں فرق نہ کرنا بہت بڑی غلطی ہے، یہ سچ ہے کہ ایک طاقتور مذہب قوم کی ثقافت و تہذیب پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ لیکن کسی آدمی کے مذہب کو اس کی تہذیب قرار دینا فطرت انسانی کی گوناگونی اور رنگارنگی کے مظاہر ایک ہی سادہ ضابطہ قرار دینے کے مترادف ہو گا۔ ثقافت یا تہذیب ایک جامع لفظ ہے، مناظر قدرت کا حسن وسحر کاری، زندگی کا لطف، فنون لطیفہ کے تخلیقی کمالات، علم کا شوق، اقتدار کی ہوس، غرض وہ تمام چیزیں جنکو دنیاوی زندگی میں ایک مہذب قوم قدر و منزلت سے دیکھتی ہے وہ سب اس کے دائرہ عمل میں داخل ہیں، سچ پوچھو تو انسانی ذہن میں دنیا اور عقبیٰ دونوں کے بارے میں ایک طرح کا غیر مستقل توازن قوت پایا جاتا ہے۔ مذہب سے ثقافت کو جدا کر دیا جائے تو مذہب چند مجرد تصورات کا مجموعہ رہ جائے گا اور مذہب کے بغیر ثقافت کبھی اپنے عروج و کمال کو نہیں پہنچ سکے گی۔ مگر ان دونوں کو غلط ملط کر دینا تاریخ انسانی کے ایک اساسی اور بنیادی امر واقع کو نظر انداز کر دینا ہو گا۔

۱۴۹۸ء میں واسکوڈے گامانے ہندوستان کے لیے ایک نئے بحری راستہ کی دریافت میں کامیابی حاصل کر لی جو ہندوستان کو ایک نئی تہذیب سے روشناس کرانے میں بہت زیادہ ممد و معاون ثابت ہوئی۔ جب یورپی اقوام نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا اس وقت یہاں کے عہد وسطیٰ کی تمام قوتوں میں ہم آہنگی قائم تھی۔ لیکن اس نئی تہذیب اور اس کے وسیع تر اثرات نے دور وسطیٰ کے ہندوستان کے متوازن نظام زندگی کو درہم برہم کر دیا اور وقت کے ساتھ ساتھ ہندوستانی نظام زندگی کے ہر پہلو

میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ ہندوستان کی اس دریافت سے استفادہ کرنے والی قوموں میں سب سے پہلی پرتگالی قوم ہی تھی جس نے اپنی نسل کے صحت مند و توانا ملاحوں کو جنھیں بحر اوقیانوس میں خطرات سے دوچار ہونے کی تربیت حاصل تھی بحری زندگی کا خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے ہندوستان بھیج دیا۔ اس طرح ہندوستان سے پرتگیزیوں کے تعلقات تقریباً ڈیڑھ صدی تک برقرار رہے۔ اس عرصہ میں انھوں نے اپنی نوآبادیات کے ذریعہ مادی طور پر ہندوستان کی سماجی و معاشی حالات میں نمایاں تبدیلیاں کیں۔ گو اس قوم کا واحد مقصد محض تجارت تھا۔ لیکن ملابار کی سیاسی صورتحال نے جہاں انھوں نے اپنی بستیاں اور نوآبادیات قائم کی تھیں۔ ان کی سامراجی خواہشات کو مہمیز لگائی نتیجتاً اُن کے ایک وائسرائے "البوقرق" نے پرتگیزی اثرات کو تادیر قائم رکھنے کے لئے ہندوستانیوں اور پرتگیزیوں کی چند ملی جلی بستیاں قائم کیں۔ "البوقرق" ہی نے ان دونسلوں کے عوام کے درمیان شادی بیاہ کی کوششوں کی ہمت افزائی کی۔

انگریزوں نے سترھویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی ہندوستان میں اپنے قدم جمانے شروع کئے۔ ۱۵۸۸ء میں اسپین کے جنگی جہازوں کے بیڑے کی شکست نے انگریزوں کو بحری تجارت اور دیگر کاروبار میں حصہ لینے کا زرین موقع فراہم کیا۔ ملکہ الزبتھ نے اس خصوص میں سولہویں صدی کے آخری دن ایک منشور پر دستخط کر کے انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کو بحر ہند اور بحر الکاہل پرتگیزیوں اور اسپینی علاقوں کو چھوڑ کر مابقی حصے میں تجارت کا ٹھیکہ دے دیا۔ ابتداً اس چھوٹے سے ٹھیکے سے کمپنی نے کبھی خوش حالی اور کبھی تنگ دستی میں کئی سال گزار دیئے لیکن انیسویں صدی کے وسط میں کمپنی نے سارے ہندوستان پر اپنی سیاسی برتری قائم کر لی۔

انگریزوں کی کامیابی نے فرانسیسیوں کو بھی ان کی تقلید پر آمادہ کیا وہ بھی ایک عرصہ سے ہندوستان سے تجارتی تعلقات قائم کرنا چاہتے تھے۔ آخر کوئی چہارم کے مشہور زمانہ وزیر "کولبرٹ" کی موثر اور طاقت ور قیادت میں فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی کا ۱۶۶۴ء میں قیام عمل میں آیا اور ۱۶۶۸ء میں "سورت" میں اور ۱۶۶۹ء کے دوران مسولی پٹنم میں چند فرانسیسی کوٹھیاں بھی قائم کی گئیں۔ ان تمام فرانسیسی نوآبادیات کا صدر مقام ۱۶۷۴ء میں پانڈیچری کو قرار دیا گیا اس کے علاوہ فرانسیسیوں نے ماہی، کاریکل، چندر نگر اور دیگر مقامات پر بھی اپنی نوآبادیات قائم کرلیں۔ فرانسیسی گورنروں میں "ڈوپلے" کو نمایاں اہمیت حاصل ہے جس نے ہندوستان کی سیاسی صورتحال کا بہتر اور صحیح اندازہ کرتے ہوئے ہندوستان میں فرانسیسی حکومت کے قیام کے لئے مناسب مواقع تلاش کئے اور اپنی نوآبادیات سے متصل دیسی حکمرانوں کے تنازعات میں مداخلت شروع کر دی۔ کچھ عرصہ تک "نظام آف حیدرآباد" اور "نواب آف کرناٹک" پر اس کا بہت زیادہ اثر رسوخ رہا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک بڑی شاہانہ فتح حاصل کرلے گا۔ لیکن قسمت نے اس تمام منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ انگریزوں کی مسلسل فتح مندیوں نے بدقسمتی سے

فرانسیسیوں کو شکست دے دی اور آخر کار پانڈیچری، ماہی اور کاریکل کے علاقوں پر قانع رہنے پر مجبور کر دیا۔ ابھی چند دن پہلے کی بات ہے کہ فرانسیسیوں نے ان علاقوں سے دستبرداری اختیار کی اور انڈین یونین میں شامل ہو جانے کی اجازت دے دی، (اس وقت) تک یہ علاقے فرانسیسی تہذیب و تمدن کے اہم ترین مرکز کی حیثیت رکھتے تھے۔

واسکوڈاگاما کی دریافت کے سو سال تک ہندوستان کا یورپ کی اقوام سے ربط ضبط قائم رہا۔ لیکن یہ تمام تعلقات لازمی طور سے تجارت تک محدود تھے۔ جسکی وجہ سے ان تعلقات کو ہندوستام دورس تبدیلیوں کا کوئی موقع نہیں مل سکا۔ البتہ صرف انگریزوں ہی کی وجہ سے جنھیں سارے ہندوستان سے اپنے اقتدار اعلیٰ کے قیام کا موقع مل گیا تھا، ملک میں مغربی تصورات و خیالات بڑھنے اور پرورش پانے لگے۔

کمپنی کے ابتدائی ایام میں نسلی میل جول اور تعلقات بہت ہی کم تھے۔ کیونکہ انگریز تاجر اپنے آپ کو ہندوستانی عوام سے معزز اور برتر سمجھتے ہوئے الگ تھلگ ہی رکھتے تھے اور ہندوستانیوں سے کچھ زیادہ سماجی ربط ضبط قائم نہیں کئے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے اور ہندوستانیوں کے درمیان تعلقات لباس، غذا اور دیگر اشیاء کی حد تک ہی محدود رہے۔ البتہ کمپنی کے اقتدار اور وقار میں اضافہ کے ساتھ ساتھ تعلقات کو وسعت دینے کی کوشش کی گئی تاہم جماعت داری سطح پر ہمدردانہ تعلقات کو بتدریج نہیں بڑھایا جاسکا۔ درحقیقت ملک میں قومیت کے جذبہ کی بیداری سے حاکم و محکوم کے تعلقات کو مسلسل کشیدہ ہوتے جارہے تھے۔ آخر کار سیاسی تعلقات ۱۹۴۷ء میں منقطع ہو گئے۔

لیکن اُس وقت علمی زبان کی حیثیت سے جو کھڑی بولی یا اُردو رائج تھی۔ وہ ضرورت سے زیادہ فارسی آمیز تھی۔ اور صرف نستعلیق میں لکھی جاتی تھی۔ فورٹ ولیم کالج سے جو تحریک اُٹھی تھی اُس کے ضمن میں بطور خاص اس بات کی کوشش کی گئی کہ علمی کھڑی بولی سے فارسی کے جزو کو کم کر کے اُسے بول چال کی زبان سے قریب تر کر دیا جائے اور نستعلیق اود دیوناگری دونوں رسم الخط استعمال کئے جائیں۔ زبان کی اس نئی نہج اور ساخت کو اہمیت دینے کی خاطر اس کو ایک نیا نام دیا گیا یعنی "ہندوستانی"۔ زبان کے تعلق سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی پالیسی بہت جلد دی اور ہندوستانی کی بجائے انگریزی کو سرکاری زبان قرار دیدیا۔ لیکن چونکہ ہندوستانی زبان ضروریات کو پورا کرتی تھی اس لئے وہ ترقی کرتی گئی اور نستعلیق و دیوناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جاتی رہی۔ روز افزوں برطانوی تسلط نے ہندوستانی ثقافت میں ایک بحرانی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ شمالی ہند کے ہندوستانی مشترکہ کلچر کو جس کی پرورش وپرداخت مغلوں نے کی تھی۔ یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ وہ ختم ہو جائے گا اور انگریزوں کی لائی ہوئی مغربی تہذیب اس کی جگہ لے لیگی۔ خطرہ کے اس احساس کا ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں پر گہرا ردعمل ہوا۔ "ان میں سے بعض لوگ اور خاص طور پر مسلمان بزرگوں نے یہ بالکل صحیح سوچا کہ انگریزی تہذیب کے تسلط کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنی روحانی اور

اخلاقی مدافعانہ قوت کو قوی سے قوی تر کرنا ضروری ہے اور اس غرض کے لئے انہیں چاہیے کہ اپنے مذہبی اور ثقافتی احساس کے ماخذوں کی طرف رجع ہو کر ان سے تازہ قوت اور فیض حاصل کریں۔ اس میں انہیں کامیابی ہوئی۔ لیکن اپنے دماغ کو ماضی بعید کی طرف رجوع کرنے کا ایک ناخوشگوار نتیجہ یہ بر آمد ہوا کہ ماضی قریب اور اس کے قابل ورثہ، یعنی ہندوستانی تہذیب اُن کی نظروں سے اوجھل ہو گئی اور تھوڑے عرصہ اُس مشترکہ کلچر کو جو سلطنت مغلیہ کے عروج کے زمانہ میں ہندو مسلم تہذیب کے ملاپ سے بنا تھا بجز چند مسلمانوں اور ہندوؤں کے سب نے ترک کر دیا اور وہ اس حالت کو پہنچ گیا کہ اپنے اجزائے ترکیبی میں تحلیل ہو کر رہ جائے"

ثقافتی افتراق کا یہ رجحان سب چیزوں سے زیادہ زبان میں ظاہر ہوا۔ بول چال کی زبان آسانی سے نہیں بدلتی لیکن علمی زبان ثقافتی گروہ بندیوں اور تبدیلیوں کے رجحانات کا اثر قبول کرنے میں بڑی حساس واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ ہندوستانی تحریری زبان نے دو متخالف رجحانات ظاہر کرنا شروع کر دیا۔ بہت سے ہندو کھاری بولی ہندوستانی کو بجائے نستعلیق کے دیوناگری رسم الخط میں لکھنے لگے اور جہاں تک ممکن ہو سکا اس میں سے عربی اور فارسی کے الفاظ حذف کر کے ان کی جگہ سنسکرت الفاظ ٹھوس دیئے۔ البتہ بعض ہندو اور بہت سے مسلمان نہ صرف نستعلیق رسم الخط پر جمے رہے بلکہ عربی اور فارسی الفاظ کثرت سے استعمال کرنے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی زبان پھر سے اُردوئے معلیٰ اور بلند پایہ اُردو ہو گئی۔ اس طرح زبان کے تقابلی مطالعہ کی تاریخ میں ایک عجیب صورت حال یہ پیدا ہو گئی کہ رسم الخط کے اختلاف اور مغلق الفاظ نے ایک ہی زبان کو عملاً دو زبانوں یعنی ہندی اور اردو میں تقسیم کر دیا حالانکہ لسانیات کے معمولی قواعد کی رو سے ایک ہی زبان کے دو اسلوب بیان تصور کرتے ہوئے یہ بتائیں گے کہ ہندوستانی علم و ادب کے میدان میں گزشتہ ڈیڑھ سو سال میں ان دونوں زبانوں کا کیا حصہ رہا ہے۔

اودھ پنچ غالباً اردو کا پہلا مجلہ ہے جس میں مزاحیہ کالم کو شامل کیا گیا تھا۔ اس مجلہ نے اس کالم کے ذریعہ انگریزی تہذیب و تمدن اور غیر ملکی حکومت کے ظلم و زیادتی کی طرف تلخ و شیریں انداز میں انگشت نمائی کی اور عوام کو اجنبی حکومت اور اجنبی تہذیب سے ہوشیار کرنے کی کوشش کی۔ اودھ پنچ نے انگریزی زبان کے اخبارات کے تتبع میں یہ کالم شروع کیا اور کمال یہ کیا کہ صحافتی طنز کے لئے مغربی طنز و مزاح کے حربوں جیسے مبالغہ، موازنہ، لفظی بازیگری وغیرہ کو استعمال کیا۔ اودھ پنچ کے روح رواں سجاد حسین نے اردو صحافت میں پہلی بار فکاہیہ کالم شروع کیا۔ اور اپنے بیباک قلم کی شوخ تحریروں کے ذریعہ اس وقت کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی اقدار کی خرابیوں پر طنز کیا۔ اس وقت طنز و مزاح کا معیار بہت بلند نہیں تھا نیز ادبی چاشنی کی بھی ایک حد تک کمی تھی لیکن اودھ پنچ کی اہمیت کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔

اودھ پنچ کا دور تہذیبی تصادم کا دور تھا۔ مغربی اور مشرقی تہذیبیں باہم ٹکرا رہی تھیں۔ انگریز ملکی سیاست پر چھا رہے تھے اور انگریزی تہذیب رفتہ رفتہ ہر چیز پر چھاتی جا رہی تھی۔ مشرق کے زوال کی وجہ سے ہر مشرقی چیز مفتوح اور زوال پذیر نظر آتی تھی۔ ہر مغربی چیز کے لیے رغبت اور مشرقی چیز کے لئے بیگانگی پائی جاتی تھی۔ اودھ پنچ اس صورت حال میں سامنے آیا۔ اس نے ایک طرف تو مشرق کی برائیوں اور ان کے اسباب کے خلاف بات کی اور دوسری جانب مغرب کی سطحی تقلید اور پرستش کے خلاف آواز بلند کی۔ اودھ پنچ نے یہ کام طنز اور ظرافت کے پیرائے میں کیا۔ البتہ یہ کہا گیا کہ اودھ پنچ کے حربے اوچھے تھے۔ اس کا مزاح پھبتی اور ہجو پر مبنی اور اخلاقیات کی حدود سے باہر تھا۔ یہ بھی کہا گیا کہ اودھ پنچ کے مزاح کا معیار اعلیٰ نہ تھا۔

ویسے بھی اودھ پنچ کا پہلا اور دوسرا دور برصغیر کی غلامی کا دور تھا۔ لہٰذا اودھ پنچ کا روئے سخن انگریزوں اور ان کی سیاسی چالوں کی طرف رہا۔ اس طرح اودھ پنچ کے موضوعات کا غالب حصہ سیاست قرار پایا۔ اگر پہلے ادوار کے موضوعات میں سے سیاست نکال دی جائے تو باقی کوئی خاص قابل ذکر موضوع نہیں رہتا۔ جبکہ تیسرے دور میں سیاست کو اتنی اہمیت حاصل نہیں ہے کیونکہ تب تک سیاسی حالات قطعاً بدل چکے تھے اور برصغیر آزادی کی نعمت سے فیض یاب ہو چکا تھا۔ لہٰذا تیسرے دور میں " اودھ پنچ " کا غالب رنگ مزاحیہ اور ادبی تھا۔ قیصر صاحب کے بھی خاصے مضامین ۱۸۸۳ء کے فائل میں ہیں۔ ایک مضمون میں اس دور کے نہایت اہم تہذیبی اور علمی مسئلے کو موضوع بنایا۔ یہ مسئلہ اردو کو رومن رسم الخط میں لکھنے کا تھا۔ یہاں وہ انگریزوں سے خبردار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "لیجئے حضرات وہ ہندی اردو کا جھگڑا تو تھا ہی یہ ایک رومن اردو اور پیدا ہوئیں۔ اس کے ممبروں کی اور بھی نئی ہانک ہے۔ حروف انگریزی عبارت اردو۔۔۔ ہاں اے اردو ہندی کے تائید کرنے والو، ذری ہوشیار ہو جاؤ اور کان پھٹپھٹا ڈالو۔۔۔ تمہاری ننھی منی تلی اور یہاں وہ یورپین ڈگ۔۔۔" (۱)

دراصل اردو رومن کمیٹی کا سیکرٹری ڈک نامی کوئی انگریز تھا۔ اس کو ڈک سے ڈاگ (Dog) بنا دیا۔ غالباً تلی کی رعایت سے۔ رومن اردو کی جو بحث بعد میں اٹھتی رہی وہ نئی نہیں تھی اور اردو والوں کا نقطہ نظر بھی کم و بیش وہی رہا۔ ابراہیم کے ایک مضمون "رنگ لا دیں گے ہمارے کوٹ پتلون ایک دن" سے اقتباس، جس میں ان کا انداز براہ راست تلقین کا سا ہے:

> "کیا وجہ ہے کہ آپ کی جہالت ہم کو اس لباس میں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتی۔۔۔ کوٹ پتلون نہ بنواتے تو دور اندیش کیوں کہلاتے۔ مقدم آسائش ہے۔ پرائے شگون کے لیے اپنی ناک کاٹ ڈالنا دقیانوسی لوگوں کا کام ہے۔" (۲)

اودھ پنچ کی تحریک "لندن پنچ" سے ہوئی اور اسی نام کی مناسبت سے اس کا نام اودھ پنچ رکھا گیا۔ دونوں پرچوں نے مزاح نگاری کی ترویج و تبلیغ کی اور اپنے دور کے سماجی و سیاسی حالات کی گراوٹ کو بے نقاب کیا۔ اودھ پنچ نے تہذیبی بحران کے دور میں جب ہندوستانی قوم مختلف سماجی اور تہذیبی مصائب سے دوچار تھی۔ لکھنے والوں کی ایک پوری جماعت قائم کی جنہوں طنزو مزاح کے حربوں سے ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کو نشانہ تمسخر بنایا۔ پروفیسر آل احمد سرور کا خیال ہے کہ:

"اودھ پنچ نے بہادری اور جرات کے ساتھ غیر ملکی حکومت کے خلاف ایک منظم تحریک شروع کی۔ سماجی اور تہذیبی مسائل پر بھی اس اخبار نے کڑی تنقیدیں کیں اور اس طرح اودھ پنچ نے ملک اور ادب کی بڑی خدمت کی۔" (۳)

اودھ پنچ کے سب سے اہم لکھنے والے سرشار تھے جن کا ناول فسانہ آزاد بہت کامیاب ثابت ہوا۔ سرشار نے اس ناول میں اپنے شہر کی مٹتی ہوئی معاشرت کی منظر کشی کی ہے۔ جب نواب امرا ورؤسا ء جہالت میں مبتلا ہو کر بے مقصد کاموں میں پڑ کر وقت اور دولت کا زیاں کررہے تھے۔ سرشار نے اس ناول میں دو زبردست کردار پیش کیے ہیں۔ ایک 'ازاد' جو اس ناول کا ہیرو ہے۔ وہ تعلیم یافتہ اور جدید علوم وفنون کا حامی ہے۔ اس کے اندر سماجی شعور اور روشن خیالی ملتی ہے۔ دوسرا کردار 'فوجی' کا ہے جو پرانی تہذیب کا علمبردار اور بے شعور ہے۔ بدلتے ہوئے حالات کا اس کے اندر ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں۔ وہ سست، بزدل اور لاپرواہ آدمی ہے اوراپنی گفتار سے اپنی خامیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ فوجی ایک بے مثال کردار ہے جو اپنے اندر افاقیت رکھتا ہے۔ اس کا وجود دنیا کے ہر ادب میں اور ہر خطے میں ملے گا۔

منشی سجاد حسین کا شمار اردو کے اچھے مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اودھ پنچ رسالے کا اجرا ۱۸۷۷ء میں کیا تھا۔ ان کے ظریفانہ مضامین بھی اس میں چھپتے تھے۔ انہوں نے حاجی بغلول، طرحدار لونڈی اور احمق الدین نامی مزاحیہ کردار کی تخلیق کی ہے، حاجی بغلول کے ذریعہ سجاد حسین نے اپنے زمانے کی ناہمواریوں کو طشت ازبام کیا ہے۔ حاجی بغلول ایک مکمل ظریفانہ کردار ہے جسے بقول کلیم الدین احمد اردو ادب اس سے بہتر کریکٹر پیش نہ کرسکا۔ رشید احمد صدیقی بھی اس سلسلے میں کلیم الدین احمد کے ہم خیال ہیں:

"حاجی بغلول ایک طور پر ڈکنس کے "پک وک ابراڈ" کا نامکمل اور ایک حیثیت سے ناقص چربہ ہے لیکن اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ حاجی بغلول اردو طنزیات اور ظرافت میں منفرد حیثیت رکھتا ہے اور اب تک اس کا جواب اردو میں کہیں نظر نہیں آیا۔" (۴)

منشی سجاد حسین نے دی پک وک پیپرز (The pickwic papers) سے نہ صرف اثرات قبول کیے ہیں بلکہ کئی جگہوں پر کردار اور واقعات بھی ہوبہو نقل کر لیے ہیں۔ منشی سجاد حسین اور The pickwick papers کے چند اقتباس ملاحظہ ہو۔

"As Mr. Pickwick uttered this adieu, the crowed raised a loud shout. Many among them were were pressing forward to shake him by the hand again, when he drew his arm through perker's and hurried from the prison, far more sad and melancholy, for the moment, than when he had first entered it. Alas! How many sad and unhappy being had he left behind." (5)

اودھ پنچ کے ایک معتبر اور مشہور ادیب کی حیثیت سے مرزا مچھو بیگ ستم ظریف کا شمار ہوتا ہے۔ مچھو بیگ بہت دنوں تک قلمی نام "ستم ظریف" سے اودھ پنچ میں مضامین لکھے اور اسی نام سے شہرت پائی۔ زبان میں سادگی اور صفائی تھی۔ محاوروں کا بے دریغ استعمال کرتے تھے۔ اپنے دور کے دولتمندوں اور رئیسوں کی اخلاقی گراوٹ اور نشہ بازی اور دیگر انحطاطی رجحانات پر قلم اٹھایا ہے۔ ان کی تحریر کا ایک ہلکا اندازہ ذیل کے اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

"عورت اگر ضد پر آجائے تو مرد کو ناک چنے چبوا دے اور میرے ہاتھ میں وہ چٹیا دبی ہے کہ ابھی کہو تو کل سے ہی تگنی کا ناچ نچوا دوں کچھ بنائے نہ بنے۔ آنکھوں سے دیکھیں اور کرم کرم جلد کریں۔ ایک ادنیٰ سی بات کل سوار ہوئے باجی اماں کے بہانے سے چھوٹی پھوپھی کے یہاں جاؤں اور پندرہ دن کا غوطہ ماروں۔ تو ج آگ لگے ایسے خاوند کو جورو کے کلیجے میں پیپ پڑ گئی۔ آئے دن کی سوئی سوختی اس گھر داری کو لوکا سات چھپر دن کا پھونس نگوڑی جان جلنے ہی کو ہو گئی۔" (۶)

اودھ پنچ کے ایک اہم قلمی معاون کے طور پر منشی جوالا پرشاد برق کا شمار ہوتا ہے جن کی خوبی یہ تھی کہ وہ نثر اور نظم دونوں لکھتے تھے۔ ترجمہ نگاری سے بھی دلچسپی تھی۔ بنکم چٹرجی اور شیکسپیئر کی تخلیقات کو اردو کا جامہ پہنایا۔ بامحاورہ نثر لکھتے تھے جس میں مزاح کا رنگ جھلکتا تھا۔ مصنف رقم طراز ہے کہ:

"البرٹ بل۔۔۔۔

پیارا بل ہاتھ سے بے ہاتھ ہو گیا۔ اس کی پیدائش پر کیا کیا ناز تھے۔ اس کے والدین نے اسے کیسے کیسے لاڈ سے پالا۔۔۔ سوتیلی ماں کے پالے پڑا۔ ماں باپ ہاتھ ملتے رہ گئے۔ جن پر ہمیں

بھر وسہ تھا جو ہماری خیر خواہی کا دم بھرتے تھے۔ وہی دغا دے گئے۔ وقت پر نکل کھڑے ہوئے۔ کاندھا ڈال دیا۔ گویا ہم بیچوں بیچ سمندر میں ٹاپو پر اترے تھے۔ کھانا پکایا۔ دستر خوان بچھایا جیسے ہی کھانے کو ہاتھ بڑھایا کی دفعتاً جزیرہ ہلنے لگا اور دم کے دم میں سب غڑاپ سے سمندر میں۔ افوہ دھوکا ہوا تھا۔ وہ جزیرہ نہ تھا وہیل مچھلی کی پست تھی۔" (۷)

نواب سید محمد آزاد اودھ پنچ کے مستقل مضمون نگار تھے ان کے اسلوب میں تازگی اور شگفتگی تھی۔ طنز بھی دوسرے ہم عصروں کے مقابلے میں زیادہ گہرا تھا۔ مغربی تہذیب اور اقدار کے خلاف آپ نے قلمی جہاد کیا۔ ان کی تحریر میں پختگی اور شگفتگی ہے۔ ان کی تحریر دیکھئے:

"لندن کی عورتیں اپنے شوہروں کو وطن میں چھوڑ کر عجائبات روزگار دیکھنے دور دراز ملکوں میں چلی جاتی ہیں اور اپنے تجربے کو پختہ کرتی ہیں۔ بُرے بُرے لال کلے اور سفید کلے والے سفیروں سے ڈٹ کر ہاتھ ملاتی ہیں۔ کسی کے مر جانے سے برسوں لباس سیاہ پہن کر پیتی، کھاتے، ناچتی، گاتی اور اس کی روح کی دعوت میں مصروف رہتی ہیں۔ عمر بھر پارسا بن کر گرجوں میں پادری صاحبوں کے ہاتھ پر صبح و شام توبہ کرتی ہیں۔ اگر میں تم کو ساتھ لاتا تو سارا لندن تمہارا تماشہ دیکھتا۔" (۸)

تعلیمی اثر کسی قوم کے تہذیب و تمدن کے اظہار اور اشاعت کے لئے اس کا ادب ہی ایک موثر ذریعہ ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں مغربی خیالات کو عام کرنے میں مغربی طریقہ تعلیم کا رواج بہت معاون و مفید ثابت ہوا۔ جب کہ بنگال میں انگریزوں کا اقتدار قائم ہوا تو ہندوستان کی قدیم تہذیب تقریباً معطل ہوکر رہ گئی تھی۔ اعلیٰ تعلیم سنسکرت ، عربی اور فارسی زبانوں میں دی جاتی تھی چونکہ ان زبانوں کا عام زندگی سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اس لئے ادب میں ترقی کی بجائے باریک بینی اور نازک خیالی کو زیادہ فروغ ہوا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا طریقہ تعلیم بالکلیہ غیر استدلالی اور روایتی علم دینیات پر صلاحیتیں پر مبنی تھا اور اسے مسلمہ حیثیت حاصل تھی۔ اس کی وجہ سے ہندوستانی طلباء کی تخلیقی صلاحیتیں مفلوج ہو کے رہ گئی تھیں اور آزادانہ تخلیق و تحقیق اور ترقی پذیر تبدیلیوں کی روح مفقود ہوگئی تھی۔ مختصر یہ کہ اس وقت کا نظام تعلیم یورپ کے دور وسطیٰ کے نظام تعلیم کے بالکل مشابہ تھا۔ اکثر انگریزوں کا خیال تھا کہ ہندوستانی سماج میں جو برائیاں پھیلی ہوئی ہیں وہ محض جہالت کی وجہ سے ہیں اور یہ صورت انگریزی تعلیم سے دور ہوسکتی ہیں۔ اسی بناء پر انگریزوں نے انگریزی نظام تعلیم رائج کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ عوام کو نئے تصورات سے روشناس کیاجاسکے ۔ان پر جوش یو روپینوں کو بنگال کے مصلح اعظم راجہ رام موہن رائے اور ان کے بعض ساتھیوں کی تائید حاصل تھی۔ ان کے بر خلاف مستشرقین کی اکثریت ہندوستان کی

قدیم (کلاسیکل) زبانوں ہی کو نظام تعلیم کے لئے ضروری خیال کرتی تھی۔ بالآخر اس تمام تنازعہ کو لارڈ میکالے نے اپنی مبصرانہ مگر یکطرفہ رپورٹ کے ذریعہ حل کر دیا۔ اس رپورٹ میں اعلیٰ تعلیم کے لئے انگریزی کو ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا۔ چنانچہ ۱۸۳۵ء میں یہ طے پایا کہ ہندوستانی عوام میں یورپی علم و ادب اور سائنس کی اشاعت و ترویج کے لئے وہ ساری رقم صرف انگریزی نظام تعلیم پر صرف کرنے کا فیصلہ کیا جائے جو ہندوستان میں تعلیم کے لئے مختص کی گئی تھی اس کے ساتھ ہی ۱۸۴۴ء میں سرکاری ملازمتوں کے لئے صرف ایسے ہی اشخاص کو منتخب کرنے کا فیصلہ کیا گیا جو مغربی تعلیم سے پوری طرح آشنا اور انگریزی زبان سے کماحقہ واقف ہوں۔

سید اکبر حسین کو اکبر تخلص کیا کرتے تھے۔ مغربی تہذیب کے دوسرے بڑے نقاد تھے مغربی تہذیب کی مذمت کرتے ہوئے اسے بالکلیہ "مادی" قرار دیتے ہیں۔ بقول ان کے وہ زمانہ گزر گیا جب کہ لوگ اپنے دلوں ہی میں خدا کے نور کو ڈھونڈا کرتے تھے۔ اب تو وہ یہ دیکھتے ہیں کہ اُن کی ہڈیوں میں کتنا فارسفورس ہے۔ مغرب کے ترقی یافتہ تصورات کی مذمت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں " شیطان نے انسان کو شکست دینے کے لئے ایک نیا طریقہ ایجاد کیا ہے۔ وہ کہتا ہے انسان کو"ترقی" کی چاٹ لگا دینی چاہیے۔

لیکن چند دوراندیش مسلم قائدین مثلاً سرسید احمد خان نے مغربی طرز تعلیم کی افادیت سے چشم پوشی نہیں کی۔ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت قائم اور برقرار رہنے والی ہے۔ لہٰذا انھیں مسلمانوں کا مفاد اسی میں نظر آیا کہ وہ وقت کا ساتھ دیں سرسید نے قرآن کریم کی حقیقی و عقلی بنیادوں پر توضیح

حث نے اصل منشاء کو مسخ کر دیا تھا۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ اُن کے ہم مذہب عوام پیغمبر اسلام صلعم کی تعلیمات کی اصلی روح پر عمل کریں نہ کہ الفاظ پر حضور سرور عالم صلعم کا تو ارشاد یہ ہے کہ علم حاصل کرو خواہ چین جیسے دور دراز ملک ہی کیوں نہ ہو۔ انھوں نے مسلمانوں ہی کی جانب سے قائم کردہ اداروں میں نئے طریقہ تعلیم کو فروغ دینے کی ایک مصالحتی تجویز پیش کی۔ اور ۱۸۷۵ء اینگلو اورینٹل کالج کے نام سے خود ایک ادارہ قائم کیا۔ جس کا اصل مقصد مسلمانوں میں مغربی علوم و فنون سے کماحقہ ، استفادہ کا جذبہ پیدا کرنا اور جدید تعلیم کو ہر شعبہ حیات اور ہر شعبہ فکر و نظر میں ایک زندہ قوت کی حیثیت سے جگہ دلانا تھا ملک کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کے لئے متعدد مدارس اور کالج کھولے گئے ۔ رفتہ رفتہ ان مدارس اور کالجوں کھولے گئے۔ رفتہ رفتہ ان مدارس اور کالجوں میں اس معیار کی تعلیم دی جانے لگی، جو حکومت اور یونیورسٹیوں نے ملک کے دوسرے فرقوں کے لئے مقرر کیا

تھا۔ اس طرح مسلمانوں کیا ایک مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد نے بھی لباس ، سماجی عادات ، طرز زندگی اور ذہنی تربیت دونوں اعتبار سے بڑی حد تک مغربی اثرات قبول کر لیے۔

مغربی تہذیب اور سر سید کی مخالفت

اودھ پنچ منظر عام پر آیا تو پورا ہندوستان اس وقت تک غلامی کی زنجیروں میں جکڑ چکا تھا۔ یہ غلامی سیاست و اقتدار کے دائرے سے نکل کر تعلیم ، تہذیب ، اور زندگی کے عام طور طریقوں میں مغرب کی اندھی تقلید کی صورت میں ظاہر ہو رہی تھی۔ یہ احساس عام ہو رہا تھا کہ تہذیب جس چیز کا نام ہے اس کے وارث انگریز ہیں اور ان کے مقابلے پر ہندوستانی اجڈ اور وحشی ہیں۔ لہٰذا انھیں متمدن اور مہذب ہونے کے لئے مغربی تہذیب کو آنکھ بند کر کے اختیار کر لینا چاہئے۔ اودھ پنچ اس غلامانہ ذہنیت کا دشمن تھا۔ چوں کہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم و تہذیب کے سب سے بڑے وکیل سر سید احمد خان تھے۔ اس لئے اودھ پنچ سر سید اور ان کی تعلیمی تحریک کا بھی بدترین مخالف تھا۔ اور یقیناً اس مخالفت میں وہ اکثر حد اعتدال سے بھی تجاوز کر جاتا تھا۔ مغربی تہذیب اور اس کے چرچے سے اودھ پنچ کو کتنی الجھن ہوتی تھی اس کا اندازہ ذیل کت اقتباس سے کیا جا سکتا ہے:

> ”تہذیب! تہذیب ! ! تہذیب ! ! ! سنتے سنتے کان بہرے ہوگئے ہیں۔ جدھر دیکھو تہذیب ہی تہذیب۔ اٹھنے بیٹھنے میں تہذیب، چلنے پھرنے میں تہذیب، ہگنے موتنے میں تہذیب ، یاالٰہی ! تہذیب کم بخت تو جان کی عذاب ہوگئی ــــ ادھر انگریزی ہوئی ادھر دنیا میں تہذیب پھیلی ۔ شرابی مہذب ، بھنگیری مہذب ۔ اس سرے سے اس سرے تک سب مہذب ۔ دنیا بھر میں بڑے فعل چاہے کیوں نہ کرے۔ تہذیب میں وہ ہی نہیں آئیں گے۔ یہ سب تو در کنار بعضے خدائی فوج دار ملکی ڈھنڈورچیوں کی تہذیب نے ناک میں دم کر دیا۔ روز نصیحت کے بہانے خدائی بھر کی آئیں بائیں شائیں بکا کرتے ہیں۔“ (۹)

اودھ پنچ اور اس کے طنز نگاروں نے مغربی تہذیب اور اس کی چمک دمک کے کھوکھلے پن کو عیاں کرنے کے لیے طنز کے تمام ہتھکنڈے آزمائے۔ نواب سید محمد آزاد جو اودھ پنچ کے مستقل لکھنے والے تھے اور ”مغربیت“ سے سخت متنفر۔ انھوں نے اس تہذیب کے نقائص سے اپنے ہم وطنوں کو آگاہ کرنے کے لئے ایک دلچسپ طریقہ یہ نکالا کہ ہندوستان سے اعلیٰ تعلیم کے لئے جانے والے ایک فرضی طالب علم سید ازلی کے فرضی خطوط کی اشاعت

کا سلسلہ شروع کیا۔ ان خطوں میں لندن کی زندگی اور وہاں کی تہذیب و معاشرت پر اس انداز سے طنز کیا جاتا تھا کہ ان کا مضحک پہلو نمایاں ہو کر سامنے آجاتا تھا۔ یہ خطوط زیادہ تر "مائی ڈیر پاپا"، "مائی ڈیر عفت بیگم " اور مائی ڈیر مولانااودھ پــــــــــــــنچ" کے نام لکھے گئے ہیں اور طنز و مزاح کا اعلیٰ نمونہ کہے جاسکتے ہیں۔مائی ڈیر عفت بیگم کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

لندن سورٹن اسٹریٹ نمبر ۲۲۸۹۵

تاریخ ۳۰جولائی ۱۸۷۸ء

مائی ڈیر عفت بیگم!

تمہاری فرقت مجھ پر سوار ہوئی ۔ اکثر راتوں کو جہاز میں تمہارے گیسوئے مشکیں ، موباف سرخ اور گرئی ملگجے دوپٹے کا خیال مجھے ستایا کرتا تھا مگر جب سے اس طلسماتی شہر لندن ، میں نے قدم رکھا ہے روز بہ روز صدمہ مفارقت گھٹتا گیا اور درد جدائی کی تکلیف کم ہوتی گئی۔ اب بہ خدا تمہاری محبت اسی قدر اور اسی طرح کی مجھے ہے کہ جیسے کسی کو اپنی پالی ہوئی چڑیا یا کسی پیارے جانور کی محبت اور یاد ہوتی ہے ۔ اس کے یہ معنی نہیں ، میں تم کو بھول گیا ہوں یا تمہاری محبت بالکل میرے دل سے مٹ گئی ہے بلکہ تمہاری حالت کا جب کہ میں اس ملک کی حور نژاد عورتوں سے مقابلہ کرتا ہوں تو تم بالکل ایک نیم وحشی چار پایہ بن کر میرے دیدہ تصور میں آتی ہو اور میں نہایت اس سے پچھتاتا ہو ں کہ کیوں میری پیدائش ہندوستان میں ہوئی۔ کیوں نیم وحشی آدمی کے دائمی عیش و آرام کا میں ضامن ٹھہرا ۔۔۔ کوہ قاف ، سبز پری ، لال پری ، زرد پری ، نیلم پری، سٹرپٹر پری کے قصے لڑکپن سے سنا کرتا تھا اور ان قصوں کو خیالی باتیں جانتا تھا مگر تمہاری جان کی قسم پریوں کا ملک یہی ہے۔ یہاں کی عورتیں آزادی کی ہوا کھا کر جیتی ہیں ، ہر قسم کی تعلیم پاتی ہیں ہر مجلس و محفل میں بے تکلف جاتی ہیں ، گاتی بجاتی ہیں، ناچتی ہیں۔ ہر قسم کے مردوں کو خوش کرتی ہیں، عمدہ سے عمدہ شرابیں پیتی ہیں۔ سواریوں پر سیر کو نکلتی ہیں لباس صاف پریوں کا سا ہے ۔ صرف پر کھونس دینے کی کسر ہے۔ غرضے کہ

مصالح جو ہوتا تو اڑ بھاگتی

میں تو یہاں پڑھنے آیا ہوں مگر کیا خاک کتاب دیکھوں۔ کوئی آن کوئی وقت کوئی لحظہ بھی تو آئینہ دل کسی پری وش کے جلوے سے خالی نہیں رہتا۔ جب کسی فرنگی کی واٹر سلک گون پر آنکھ پڑ جاتی ہے مجھے تمہارا گرنٹ کا پاجامہ کس نفرت سے یاد آتا ہے۔ جب کسی میم کو دوسرے صاحب کے ساتھ بے تکلف ناچتے کودتے دیکھتا ہوں تمہاری شرم ایک تیر کی طرح دل کے پار ہوجاتی ہے۔ جب کسی معزز لیڈی کو بیف کے ٹکڑے پر ہاتھ صاف کرتے دیکھتا ہوں تو

بو آتی ہے تمہارے سر کے حنا کے تیل کے خیال اور اس کی بری بو کے تصور سے دماغ پراگندہ ہوجاتا ہے۔ جب کسی

سے کمر کو سو جگہ سے خم دینا اور چوکی پر سے طاق تک عطر لانے جانا یاد ہوتا ہے تو دل کو سخت صدمہ پہنچتا ہے۔ جب ایک روشن دماغ عورت کو دیکھتا ہوں کہ اپنی گفتار ، رفتار اور ذہانت جودت سے بیس بیس جنٹل مین یعنی شریف مردوں کو خوش کرتی ہے تو اس وقت اس کا تاسف ہوتا ہے کہ تم عزیز مردوں کو دیکھ کر اس طرح سے مرجھا جاتی تھیں جس طرح لجالو۔۔۔ بھلا تم ہی خیال کرو کہ تم سے (میں؟) اور ایک جانور سے (میں؟)کیا فرق ہے۔ کھانا پینا سونا یہ سب کچھ تو ایک حیوان کو بھی نصیب ہے۔ تم اگر تھوڑا سا کام اپنی موٹی عقل سے لو تو تم کو خود معلوم ہوجائے گا کہ دنیا ایک قدرتی عیش خانہ ہے اور بندگان خدا اس میں عیش و آرام کرنے آتے ہیں نہ کہ قیدی بن کے پاگل خانے اور مرغی خانے میں رہنے۔۔۔

راقم سعید ازلی

از نئی روشنی کا نامہ پیام (۱۰)

اودھ پنچ نے مغربی تہذیب کے جن تاریک پہلوؤں کی نشان دہی کی، حیرت انگیز طور پر سرسید کی نگاہ ان کی طرف نہیں گئی۔ حالاں کہ سید محمد آزاد نے یہ خطوط ہندوستان میں بیٹھ کر لکھے تھے جب کہ سرسید نے تو مغربی تہذیب کا بہ چشم خود مشاہدہ کیا تھا۔ اودھ پنچ کو سرسید سے یہی شکوہ تھا کہ وہ مشرقی ہو کر مغرب کے پرچارک بنے ہوئے تھے۔ اور اسی لیے اس کے صفحات سرسید کی اصلاحی و مقصدی تحریک کے بخیے ادھیڑنے کے لیے وقف رہے۔ ۱۸۷۷ء سے ۱۸۹۳ء تک سرسید کے خلاف نظم و نثر میں اتنا کچھ لکھا گیا کہ انھیں یک جا کیا جائے تو کئی ضخیم جلدیں مرتب کی جاسکتی ہیں۔ ان مضامین میں سرسید کو کافر، کرسٹان، نیچری،

فریبی، دھوکا باز اور گداگر تک کہا گیا سرسید نے علی گڑھ کالج کے لئے چندہ جمع کرنے کی مہم شروع کی تو اودھ پنچ نے اس کا مذاق اڑایا:

"بھیک مانگنے کا نیچرل اور مہذب طریقہ
ارے کم بختو! مجھ کو روپیہ دو! ارے نالائقو! مجھ کو دو
ارے بیوقوفو! مجھ کو دو۔ ارے بے ایمانو! مجھ کو دو
ارے جاہلو! مجھ کو دو۔ اے کاہلو! مجھ کو دو۔ خدا کے واسطے
چاہے نہ دو مگر نیچر کی خاطر سے تو دو" (۱۱)

اودھ پنچ کو سرسید کی مغربیت پر ایک زبردست اعتراض یہ بھی تھا کہ وہ مغربیت کے زیر اثر دینی عقائد میں تحریف کے مرتکب ہوئے تھے اور دین کی ایسی تفسیر و تعبیر پیش کر رہے تھے جو مسلمانوں کے لیے کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ سرسید کی عالی ظرفی اور ضبط و تحمل کی غیر معمولی صلاحیت تھی کہ انھوں نے کبھی پلٹ کر اودھ پنچ کے ان حملوں کا جواب نہیں دیا۔ یہ حملے کبھی پر لطف ہوتے تھے اور کبھی ثقاہت سے گرے ہوئے۔ ایک پر لطف حملے کا انداز دیکھیے: "کیوں حضرت! یہ آپ جب دیکھیے خواہ مخواہ کو ہمارے بوڑھے سید کے منھ آتے رہتے ہیں۔ آخر سبب؟ غرض؟ ہمارے سرسید نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟ یہ بھی کیا غضب ہے کہ احسان تو مانتے نہیں الٹا دھڑا باندھا جاتا ہے۔ پوچھو سید کی اس میں کیا خطا کہ جو طالب علم یورپ جاتا ہے ایک میم صاحبہ بغل میں دبائے چلا آتا ہے۔ سچ پوچھو تو اس میں کسی کی بھی خطا نہیں۔ یہ تو آپ بھی مانتے ہیں کہ کھیل کود بھی بچوں کی تعلیم کا ایک جزو ہے۔ اگر چار گھنٹے سخت محنت کی پڑھائی میں صرف ہوئے تو کم سے کم ایک گھنٹا کھیل کود میں جس سے طبیعت خوش رہے۔ آپ اپنے بچوں کو نہیں خود ہی بازار سے کھلونے کھیلنے کے لیے لا دیا کرتے ہیں؟ بس اسی طرح سید کو سمجھ لیجئے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ آپ غیر مہذب ہیں۔ بچوں کے کھیلنے کو کھلونے میں لائیے گا تو چٹوا، جھنجھنا، بانسری۔ سید یہ نہیں کرتے کہ وہ زمانے کے نشیب و فراز کو دیکھ بھال کر لونڈوں کو ولایتی کھلونوں پر لگاتے ہیں اور یوں ان کا جی بہلاتے ہیں۔(۱۲)

منشی سجاد حسین کو سرسید سے ان کی انگریز دوستی کی وجہ سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ لہٰذا ہندی اردو تنازعے میں اردو کی حمایت کے معاملے کے سوا شاید ہی کوئی ایسا مسئلہ ہو جس پر انھوں نے یا ان کے اخبار نے سرسید کے کسی نقطہ نظر سے اتفاق کیا ہو۔ یہ مخالفت اس حد تک بڑھی ہوتی تھی کہ جب مرزا غلام احمد قادیانی نے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا تو اودھ پــــــــــنچ نے اس پر ایک طویل مزاحیہ آرٹیکل شائع کیا جس میں سرسید کو بھی گھسیٹ لیا اور انھیں یحییٰ ثانی قرار دیا۔

کیننگ کالج لکھنؤ کا مشہور کالج تھا۔ خود منشی سجاد حسین نے بھی کچھ عرصے وہاں تعلیم حاصل کی تھی۔ وہاں امتحان میں دھاندلی کا ایک واقعہ منظر عام پر آیا جس میں شاہجہاں پور کے رئیس موتی میاں کا بیٹا محمد اطہر ایف۔اے کے امتحان میں نقل کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ تب ہوائٹ نامی ایک انگریز کیننگ کالج کا پرنسپل تھا جس نے اس واقعہ کو دبانے کی کوشش کی۔ منشی سجاد حسین اس بے اصولی پر خاصے برافروختہ نظر آتے ہیں اور اودھ پنچ کے صفحات پر کچھ عرصے تک اس موضوع پر طنزیہ پیرائے میں کچھ نہ کچھ چھپتا رہا۔ مثلاً لکھتے ہیں: ''افسوس صد افسوس یہ ہندوستان ہے جہاں ہوائٹ صاحب کو اطمینان ہے کہ گورے چمڑے والے پوجے جاتے ہیں۔۔۔ اور جتلا دے کہ پبلک کی گاڑھی کہانی سے لمبی لمبی تنخواہیں اینٹھنا اور کوٹھیوں اور بنگلوں میں باس کرنا ٹیرھی کھیر ہے۔''(۱۳)سید احمد خاں کے انگریزوں کے کلچر کو اپنانے پر لکھا:

''۔۔۔جب سے اس جھل جھل وار ٹوپی اور بڑی مہری کا گھٹنا اور چار جیبوں بڑے بڑے بوتامیوں کا کرتا پہنا اچھا خاصا ولایتوں کا زائیدہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر رنگ روپ نہ بدل سکا خالی خولی بہروپ ہی بدلا ہے۔ سرتاسر انھیں کی تقلید۔۔۔ چھری کانٹے سے کھانا کھانا۔ اناج کو ہاتھ نہ لگانا۔ کھڑے ہو کر موتنا۔ کاغذ سے آبدست کرنا۔ ہر ایک بات میں انھیں کی پچ۔ ہر ذکر میں انھیں کی طرف داری۔ وہ لوگ ایسے اور وہ لوگ ویسے۔ جدت پسند، مہذب، عقل مند، تعلیم یافتہ، خاک سے روپیہ پیدا کریں۔ انتہا کے مستقل مزاج۔ بلا کے صاحب وقر۔ کمال صابر۔ صفائی کے حاکم۔ بلا کے انسان۔ چنیں اور چناں۔ غرض جو وہ کرسکتے ہیں کسی سے نہیں ہو سکتا۔ یا میرے خدا ایسا بڑھایا کہ جھنڈے پر چڑھایا۔'' (۱۴)

''مینڈک کانفرنس'' کے عنوان سے ایک مضمون جلسوں اور چندوں کے خلاف چھپا تھا۔ (۱۷۳) اس میں راقم کا نام ''ناآشنا از دریاآباد بقلم م ع ح'' دیا ہے۔ س م ہ از سلطان پور نے ایک مضمون میں اردو شاعری کی بھد اڑائی گئی ہے اس کا اقتباس :۔ ''بھئی واللہ بعضے وقت جی چاہتا ہے ان شاعروں کا منہ نوچ لوں۔ کیا کیا اپج کی لیتے ہیں کہ واہی واہ۔

پرُ نور شعلہ طور۔ گال جلتے بلتے انگارے۔ بالوں کی جگہ بڑے بڑے کالے سانپ ۔۔۔ دل لگی تو جب ہو کہ شاعر

میں خطا ہو جائے''(۱۵)

مغربی تصورات کے اثر سے ہندوستانی عورتوں کی زندگی بھی محفوظ نہ رہ سکی۔ اس نے ان کی زندگی کے روشن اور تاریک پہلوؤں کو منظر عام پر لا کر بہت سی اصلاحی تحریکات کو پیش رفت کے مواقع بہم پہنچائے جس کی بدولت گزشتہ ایک سو سال کے

دوران عورتوں کی قانونی حیثیت اور ان کے تصور حیات کے بارے میں بہت سی انقلابی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ موجودہ صدی کے آغاز پر تک خواتین کی اکثریت جہالت اور توہم پرستی کا شکار تھی اور انھیں قانونی طور پر کسی قسم کے حقوق حاصل نہ تھے۔ سوائے اس کے چند خواتین کو ان کے شوہروں یا پھر اُن کے اپنے والدین نے بعض مراعات دے رکھی تھیں۔ اکثر و بیشتر گھرانوں میں پردہ تمام ساجی سرگرمیوں میں عورتوں کی شرکت میں مانع اور حائل تھا۔ جیسا کہ مہارانی بڑودہ نے ۱۹۲۷ء میں خواتین کی کل ہند خواتین کانفرنس میں کہا تھا۔

"اگر عورتوں کو ساجی زندگی کا معیار بلند کرنے میں حصہ لینا ہے اور اگر وہ اپنے فرزندوں کی تربیت کی ذمہ داریوں اور فرائض سے بخوبی واقف ہونا چاہتی ہیں تو انھیں فوراً پردہ ترک کرنا ہوگا۔ اگر عورتیں ذہنی آزادی اور مختلف سرگرمیوں میں حصہ لینا چاہتی ہیں جس کے بغیر زندگی خوشگوار نہیں ہو سکتی تو انھیں پردہ سے باہر آنا چاہیے۔" (۱٦)

بچپن کی شادی، قبل از وقت ماں بننے کی خواہش، بیوگی کے مصائب، کثرت ازدواج، جائداد متروکہ میں عورتوں کو حصہ دینے سے انکار، دیوداسی طرز زندگی اور دیگر ساجی برائیوں نے عورتوں کے وقار اور ان کے مقام کو متاثر کر رکھا تھا۔ اور ان کی وجہ ان کے مصائب و آلام میں بہت اضافہ ہو گیا تھا۔ اسی دوران یورپی خواتین اور ہندوستانی عیسائی خواتین کی آزادانہ طرز زندگی ہندوستانی خواتین کے لئے ایک چیلنج ثابت ہوئی۔ جس کے لئے ہندوستانی قائدین مثلاً ایشور چندر ودیا ساگر، راجہ رام موہن رائے، بی۔ ایم ملیباری، جسٹس راناڈے، پروفیسر کاروے، کے نٹراجن، پنڈتہ رامابائی، ڈاکٹر متھو لکشمی ریڈی، سسٹر سبا لکشمی اور دیگر ممتاز شخصیتوں نے ہندوستانی ساج کی اصلاح کے لئے متعدد تحریکیں شروع کیں۔

دوسرا اہم مسئلہ جس کی طرف فوری توجہ کی ضرورت تھی۔ وہ تعلیم نسواں کا تھا۔ جس کی حالت بہت قابل افسوس تھی۔ ۱۸۳۵ء تک بھی خواتین کی تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گی۔ اس خصوص میں "ولیم آدم" اپنی ایک رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ در حقیقت ہندو خاندان کی اکثریت میں یہ احساس عام تھا کہ کسی لڑکی کو لکھانے اور پڑھانے سے وہ بہت جلد بیوہ بن جاتی ہے۔ اس وہم کو دراصل ہندو خواتین نے ہی پروان چڑھایا تھا جس کی تائید ہندو مردوں نے بھی کی۔ یہ بھی خیال عام تھا کہ لڑکیوں کو خطو کتابت کرنا آجائے تو وہ اپنے آشناؤں سے خط و کتابت کا مذموم عمل اختیار کر سکتی ہیں۔ مسلمانوں نے تعلیم نسواں کی مخالفت میں ہندوؤں کے ان خیالات سے پورا پورا اتفاق کر لیا تھا۔ تعلیم نسواں کے پرجوش حامیوں نے ان مخالف حالات میں بڑی ہمت اور حوصلے سے کام لے کر ہر قسم کی مخالفت، نفرت، مضحکہ انگیزی اور تنقید و تعریض کی پرواہ کئے بغیر تعلیم نسواں کو پھیلایا۔ اس خصوص میں عیسائی مبلغین نے بھی اور لوگوں کے مقابلے حتیٰ کہ حکومت کے مقابلے میں بھی اس معاملے میں نمایاں خدمت انجام دی ہے۔ گزشتہ تیس چالیس برس میں تعلیم نسواں میں غیر معمولی ترقی ہوئی۔ اور تعلیم کے مختلف

میدانوں میں عورتوں کو ممتاز مقام حاصل ہوا۔ اس طرح خواتین کے راہ ترقی پر گامزن ہو جانے کے بعد دیگر معاملات اور مسائل میں ترقیوں کے لئے صرف وقت ہی کا سوال باقی رہ گیا۔ تعلیم نسواں کے عام ہونے کے ساتھ ہی کم عمری کی شادیوں اور طفل کشی پر پابندی عائد کر دی گئی۔ پردہ بھی آہستہ آہستہ ترک ہو گیا۔ کثرت ازدواج کو غیر قانونی قرار دیدیا گیا۔ خاندانی جائداد میں عورتوں کو حقدار تسلیم کر لیا گیا اور انھیں قانوناً طلاق کا حق بھی حاصل ہو گیا۔ آج کل ہندوستانی خواتین کو وہ تمام حقوق حاصل ہو گئے ہیں جو صرف مردوں کو حاصل تھے۔ اور اس طرح قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں بھی وہ مردوں کے دوش بدوش اپنے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ سید ستار حسین عثمانی کی تحریروں میں بھی طنز و مزاح کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ ’’منطق آرا بیگم بنام مسٹر چرچل‘‘ میں مغربی تہذیب پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ’’مردوں کے واسطے نیم برہنہ یعنی آدھے ڈیل سے ننگا ہونا کوئی عیب نہیں۔ یورپ میں تو آج کل تہذیب نے اتنی ترقی کی ہے کی عورتیں بھی جامے سے باہر پڑی پھرتی ہیں چیتھڑا تک ڈیل پر نظر نہیں آتا، جتنی چھپانے کی چیزیں ہیں سب اللہ رکھے ہوا اور دھوپ کھاتی پھرتی ہیں۔ ‘‘ (۱۷) آزاد نے بھی منشی سجاد حسین کے شانہ بشانہ انگریزی تہذیب اور کلچر کا مضحکہ اڑاتے ہوئے اپنے مضمون ’’پرانی روشنی کا نامہ و پیام ‘‘میں لکھتے ہیں:

> ’’یہاں لوگ گویا آزادی کے عاشق ہیں اور نقش آزادی گویا ان کے سینوں پر کندہ ہیں ان کو دولت حشمت اور ریاست کسی چیز کی پروا نہیں۔ آزادی کے نشہ سے کچھ انگلستانی لوگ ایسے مدہوش ہیں کہ اس کی ترنگ میں انھوں نے اپنے سب قسم کے حقوق کو عورتوں کے ساتھ بانٹ لیا ہے اور مرد عورت کی حالت میں کوئی فرق نہیں ہے۔۔۔ یہاں کے مکانات ، سواریاں سب بے پردہ ہیں۔ ‘‘(۱۸)

اودھ پنچ میں بہت معیاری قسم کی ’’پیروڈیز‘‘ بھی شائع ہوئیں جو اس رسالے کے ادبی معیار کو بلند کرتی ہیں۔ مثلاً شفیع عقیل کی ڈائری جس میں موصوف نے بھرپور مزاح سے کام لیتے ہوئے مختلف مکتبہ ہائے فکر کے لوگوں کی فرضی اور مزاحیہ ڈائری پیروڈی کے انداز میں لکھی ہے مثال کے طور پر ’’کالج گرل‘‘ کی ڈائری کا ایک ورق ملاحظہ فرمائیں: ’’آج نسرین نے زبردستی پرویز سے انٹرڈیوس کرا دیا۔ پرویز نسرین کا ’’بیلوڈ‘‘ ابھی نیا ہی کالج میں داخل ہوا ہے ویسے ساجد بھی اچھا لڑکا ہے خوب صورت بھی ہے اور ذہین بھی مگر اس میں ایک برائی ہے اور وہ یہ کہ وہ کالج میں سب کے سامنے مذاق کر دیتا ہے شکیل احمد بڑا ہینڈسم لڑکا ہے خصوصاً اس کی آنکھیں تو مجھے بہت اچھی لگتی ہیں پرسوں اس نے مجھے ایک ’’پن پریذنٹ‘‘ کیا تو امتحانات شروع ہونے والے ہیں سوچتی ہوں کہ ’’اسٹڈی‘‘ شروع کر دوں‘‘ (۱۹) رفاہ قوم کے کاموں میں بیٹھے ہیں تو عورتوں کو بھی ساتھ لے لیتے ہیں اور ان کا ذکر اس طرح کرتے ہیں: ’’جب کہ ہمارے مشن میں بہت سی ناکردہ مجرم اور مقید خاتونیں داخل ہو گئیں اور ان کہ تعداد اور

ہمت میں کسی قدر تشفی پختگی بھی آگئی تو ہم نے دیکھا کہ بلا مبالغہ ہم پر ایک سر اور ہزاروں سودا کی مثل صادق آتی ہے کہ ایک آدمی سے اتنی مختلف المقام اور مختلف المزاج میں عورتوں کا آلہ ضرورت بننا۔ " (۲۰) مزید لکھتے ہیں کہ:

> " دکن میں بقول اورنگ زیب عالم گیر آدم صورت بہت ہیں اور آدمی کمیاب۔ یہی وجہ ہے کہ جتنی باتیں اعلیٰ انسان سوسائیٹیوں میں ضروری سمجھی جاتی ہیں یہاں مفقود ہیں۔ یہ قاعدہ حرف مردوں تک محدود نہیں ہے بلکہ اگر یہاں کی عورتوں پت بھی نظر تحقیق ڈالی جائے تو وہ بھی اسی رنگ میں ڈوبی نظر آئینگی۔ عورتوں میں یہ خیال ایک خاص خصوصیت کے ساتھ جلوہ گر ہے وہ جہاں آدمی کو آدمی نہیں سمجھتیں انھیں صفت مردانگی سے بھی متصف نہیں جانتیں یہ جانوروں کا سا برتاو کرتی ہیں۔ " (۲۱)

اودھ پنچ کی مخالفت کے نتیجے میں جو ادب وجود میں آیا، اس نے ادب میں انفرادیت، انانیت، مزاج کی رنگینی اور نفاست و لطافت کا آغاز کیا۔ اس ادب میں مغرب پرستی کی پرُزور طریقے سے تبلیغ کی گئی۔ اس میں عشق و محبت کی آزادی، ازدواجی شادی کے لیے خاندان کے بزرگوں کی متابعت سے انکار اور عورتوں کی تعلیم پر سماجی پابندیوں کے خلاف سخت احتجاج کیا گیا۔ اودھ پنچ نے ایسی ہی مغربی تہذیب کے خلاف آواز اٹھائی۔ مصنف لکھتا ہے: "عورتیں جب تک پردے سے نہ نکلیں گی ہم مہذب نہیں ہوسکتے گویا انکے پاس مہذب بن جانے کا ڈپلومہ آگیا ہے۔ صرف فیس بے پردگی کی باقی ہے وہ داخل ہوئی اور تہذیب کا سرٹیفکیٹ بغل میں۔ " (۲۲) "اودھ پنچ" انگریزیت کے سخت خلاف تھے اس لیے مغربی معاشرے کی کمزوریوں اور خامیوں کو بے نقاب کرنے کے لیے ان تحریروں کا سہارا لیا۔ اس مضمون "قحط زدوں کو خوشخبری" میں عورتوں کی مغربی آزادی کے بارے میں یوں ارقام کیا گیا ہے۔ "آج کل جب ہندوستان میں اس سرے سے اُس سرے تک گرانی قحط اور فاقہ کشی سے چل پُون مچی ہوئی ہے۔ ہزار جند گان خدا فاقوں مرے جاتے ہیں اور قریب ہے کہ آدمی آدمی کو کھانے لگے یہ مردہ امریکہ اور بصرے کے گیہوں کی آمد سے کم نہیں کہ فرانس کی ایک کمیٹی کی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ مرد کی نسبت عورت کا گوشت مزیدار ہوتا ہے۔ " (۲۳) مزید رقم طراز ہیں کہ "لیکن ہمارے نزدیک یہ زن خوری کا مشغلہ یورپ امریکہ سے شروع ہو تو بہت بہتر ہے کیا معنے کہ سلامتی سے وہاں اس جنس کی بڑی کثرت ہے مردوں کے بہ نسبت تگنی چوگنی ہی نظر آتی ہیں۔ اعتدال پر لانے کے واسطے یہی تدبیر ہم شرما ہم ثواب ہے اور ہندوستان بیچارے میں کیا دھرا۔ یہاں زن و مرد سب ہی لقمہ اجل ہو رہے ہیں۔ " (۲۴) اس مضمون "ولایتی چکر پر سرسری نظر" میں مغربی تہذیب پر چوٹ کی گئی ہے۔ مصنف لکھتا ہے "میم لوگوں کو بہت شوق اس بات کا ہے کہ مردانہ کام کریں اور جب اُسکو وہ بخوبی انجام دیتی ہیں تو ایک خاص طرح کی مسرت انگیز کامیابی انکے چہرے سے ٹپکتی ہے۔ چنانچہ اکثر رانی کارٹ اور بگھی اور دوسرے قسم کی گاڑی جو خود ہانکنے کی ہے انکو یہ لوگ ایک غرور

اور مسرت کی اداسے ہانکتی ہیں اور اُنکے صاحب اسوقت بے تکلف گاڑی میں بآرام تمام لیٹ کر ایک بے وائی اور خوشی کی اداسے چرٹ پیتے رہتے ہیں۔ ایک کثیر جماعت عورتوں کی بیک کرنے نکلتی ہے اور اسمیں بارہ سے لیکر چالیس تک کی عمر کی میمیں ہوتی ہیں زیادہ تر اس کلاس میں طرحدار اور جوان عورتیں شامل ہیں۔ یہ تماشاولایتی چکر میں سب سے زیادہ پُرجوش اور صحت افزا ہے۔ " (۲۵)اس مضمون میں مزید رقم طراز ہیں کہ

> "یورپین جنٹلمین اپنی میموں کو لیکر ہواخوری کے غرض سے نکلتے ہیں۔ ان عورتوں کی آن بان ٹھاٹ تراش خراش۔ وضع قطع اور ترکیب لباس و پوشاک قابل دید ہے۔ " (۲۶)

اس مضمون "ہندو لیڈیز و سوشل کلب" مغربی تہذیب کے ساتھ ساتھ ہندو تہذیب پر بھی تنقید کی گئی ہے۔ اور انگریزوں نے کسی طرح عورتوں کے ذریعے مغربی تہذیب مسلمانوں تک پہنچائی۔ "کیا انگلستان میں مشنری سوسائٹی اور زنانہ مشنری سوسائٹی کے فنڈ میں ایک مقدار کثیر روپیہ کے بڑے بڑے بہادر صاحبان دیتے اور انکی ممبر کو ہندوستان میں بھیجتے رہتے ہیں پس اس سے کیا دیسی لیڈیوں کا منھ لگانا ۔ " (۲۷)مزید رقم طراز ہیں کہ "یورپین لیڈیان ایسے وسائل اور ذرائع مہیا کریں جس سے ہندوستان کی لیڈیوں تک انکی رسائی ہوسکے اور عمدہ ترین اصلاح سر الیگزنڈر کی یہ تھی کہ جسقدر اور جہاں تک ممکن ہوسکے یورپین لیڈیان ڈاکٹری تعلیم حاصل کرکے ہندوستان جائیں کیونکہ ہندوستان کے زنانخانوں میں آزادی سے جانے کا پروانہ اس سے بڑھکر اور کوئی ہو نہیں سکتا۔ " (۲۸)مصنف مزید لکھتے ہیں کہ "یہ بات ہماری آپکی سمجھ میں نہ آئے نہ سہی مگر اس گر کو امریکہ کی عورتوں نے پالیا ہے بس اسی وجہ سے تو انھوں جدوجہد کرکے جال میں سوسائٹی قائم کی ہے کہ نوجوان عورتیں بیاہ سے روکی جائیں۔ چلیے صاحب جب عورتوں کیطرف سے اسطرح کھینچ تان ہوگی تو آخر صاحب کیا کریں گے۔ بہت دن کی لین گے جنگل میدان کا رستہ لیں گے بقول شخصے۔ رانی روٹھیں گی اپنا راج لین گی یا کسی کا سہاگ۔ " (۲۹)اس مضمون "پردہ نسواں "میں راقم "ا۔ح۔ مغربی اور مذاق۔(مشرقی) ارقام کرتے ہیں کہ:

> " ہمارے تعلیم یافتہ بھائیوں نے تہذیب کے فضل و کرم سے اپنی فیشن ایبل زندگانی میں یہاں تک ترقی فرمائی کہ اب عورتوں کو بے پردہ کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی کیونکہ بغیر اسکے واقعی فیشن کی تکمیل ناممکن ہے۔ " (۳۰)

مزید ارقام کرتے ہیں کہ:

> " دوست۔ یہ صاحب مضمحل کیوں چلے جاتے ہیں دوسرا دوست۔ اجی اماں نے انکی میم کا ہاتھ دیکھ کر بتایا ہے تمہارے دو شوہر ہونگے اور دوسرا حسین آدمی ہوگا۔
> دوست۔ اسی سے یہ سمجھے مجھے بدصورت کہا۔ دوسرا دوست۔ یہ بات نہ ہوگی سمجھتے ہونگے میم کی

ایک شادی ہو دو چکی ہے اور مجھ سے چھپائی ہے " (۳۱)

مغرب سے میل جول اور ربط وضبط کا ایک اہم نتیجہ ہندوستانی قومیت کے جذبہ کی نشو ونما اور ترقی ہے۔ ہندوستان نے گو بہ اعتبار تہذیبی اکائی ترقی کر لی تھی لیکن پھر بھی سیاسی قومیت کا تصور اس کے لیے نیا تھا۔ اس تصور کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بھی برطانوی شہنشاہیت ایک ذریعہ بنی کیونکہ اسی کی بدولت ملک میں بد نظمی پھیلانے والی قوتوں کی سرکوبی امن وضبط کا قیام، حمل و نقل اور مواصلات کے ذرائع کی ترقی نظم و نسق میں مرکزیت اور یکسانیت پیدا کرنے کے لیے اصلاحات اور مغربی تصورات اور مغربی نصب العین کی اشاعت ممکن ہو سکی۔ قومیت کے جذبہ کو کسی قدر مغربی تہذیب کے جارحانہ طرز عمل کی مقادمت کے جذبے نے اور کسی قدر مغرب ہی کے سیاسی قومیت کے تصور مثلاً سلف رول (سوراج) کو اپنانے کے جذبے نے پروان چڑھایا۔

ہندوستانی عوام کو متحد کرنے کے تعلق سے سریندر ناتھ بنرجی کے نظریہ کی بنیاد بھی بڑی حد تک میزینی کے نصب العین اور اس کے حوصلوں پر ہی رکھی گئی ہے۔ لالہ لاجپت رائے بھی ہندوستان میں قومی نظریہ کے فروغ کے لیے واشنگٹن کاور، مزینی، بسمارک، کوستھ، ایمتھ اور پارنیل کے ساتھ ساتھ پرتاب، رام داس، گرد گوبند سنگھ، شیواجی، ٹیپو سلطان اور مہارانی جھانسی کو رہنما اور رہبر تصور کرتے ہیں۔ خود ان لوگوں نے بھی مغربی طرز پر سیاسی تحریکوں کے لئے صحافت، سیاسی پمفلٹ بازی، عام جلسوں اجتماعی محضروں وغیرہ کے حربے استعمال کئے۔ دہشت پسند تحریک کو مذہب و اخلاق کے منکر روسیوں کا فیضان حاصل تھا اور پر تشدد تحریک کی وکالت کوستھ کی تخلیق تھی۔ حتیٰ کہ بیشتر سیاسی پارٹیوں جیسے نیشنل کانگریس، ہوم رول لیگ اور سیاسی نعرے تک مغربی ممالک کی سیاسی انجمنوں سے نقل کئے گئے تھے۔ ہندوستانی قومیت کے جذبہ کی رہنمائی میں برطانوی سیاست دانوں جیسے گلیڈ سٹون اور برک کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ مہاتما گاندھی بھی بڑی حد تک بائبل اور ٹالسٹائے اور دیگر مفکرین کی تصانیف اور تخلیقات سے متاثر تھے۔ لالہ لاجپت رائے جیسا برطانوی شہنشاہیت کا کٹر مخالف بھی ہندوستان میں برطانوی عہد کو درخشاں تسلیم کرتا ہے۔ ہندوستان میں انگریزی راج بھی بعض خوبیوں کا حامل رہا ہے۔ انگریزوں کی تاریخ اور ان کے ادب میں آزادی اور حقوق انسانی کے جو سر چشمے ابل رہے تھے، ہندوستان کی نوجوان نسل اس سے بہت کچھ سیراب ہوئی ہے مغرب میں مستعدی اور توانائی پائی جاتی ہے جو تہذیب جدید کی روح رواں ہے۔ ہندوستان کی نئی نسل نے اسی سے فیض حاصل کیا ہے۔

جولا پرشاد برق (۱۸۶۳۔۱۹۱۱) کے ہاں مذاق بہت کم ہے۔ سنجیدہ تنقید سے زیادہ کام لیا ہے۔ محاورے اور لکھنؤ کی مخصوص زبان کے استعمال کے شائق ہیں۔ اسلوب "اودھ پنچ" کے دیگر لکھنے والوں کا سا ہے۔ ذیل کا مضمون انھوں نے "اودھ پنچ"" میں لکھا تھا۔ اس وقت حکومت نے بنیوں کے کم تولنے کے خلاف قانون نافذ کیا تھا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہیں:

"ذرا ڈنڈی ترازو سنبھال کے "

"ڈیئر پنچ بنیے کی گون میں نوسن کے دھوکے کا حال اب کھلے گا۔ گورنمنٹ نے دیکھا کہ بنیے سیدھے نہیں ہوتے بٹے مختلف وزن مختلف۔ جب کوئی آنکھ کا اندھا گانٹھ کا پورا پھنسا، ترازو کے چکر میں ڈال کے ٹکے اینٹھ لیے۔۔۔ ہماری گورنمنٹ بھی بنیوں کی گرو گھنٹال نکلی۔۔۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ شہر کے ایک حصے کا وزن کچھ اور دوسرے کا کچھ۔ بھئی سنو۔۔۔ مانا قانون جاری ہوگیا۔ بٹے ترازو ٹھیک ہوگئے۔ مگر ایک ٹیڑھی کھیر ہے۔ پولیس کو نئے نئے موقع جھٹے مارنے کو ملیں گے۔ " (۳۲)

ش چ لاہوری نے ۱۸۸۳ء کے فائل میں ان کے بھی کچھ مضامین ملتے ہیں۔ اکثر ایک شمارے میں دو دو تین تین مضامین یا شذرات لکھے ہیں۔ مثلاً ۹ جنوری، ۱۶ جنوری، ۱۳ مارچ اور ۱۷ جولائی کے شماروں میں ان کے مضامین موجود ہیں۔ ان کے ہاں مزاح ج ب فروغ کی نسبت زیادہ ہے بلکہ دیگر نامور لکھنے والوں کے ساتھ ان کا نام بھی رکھا جاسکتا ہے۔ ۱۶ جنوری ۱۸۸۳ء کے چرچے میں "کل کل کل کل" کے عنوان سے ایک اچھا مضمون انھوں نے لکھا ہے، جس میں انسان (بالخصوص امیر زادوں) کی کاہلی اور کام کو کل پر ٹالنے کی عادت کو عمدگی سے واضح کیا ہے۔ اکثر لاہور کے مقامی مسائل مثلاً صفائی کا فقدان وغیرہ کو موضوع بنایا ہے۔ ذیل کے اقتباس میں ان کے زمانے کے شدت سے زیر بحث موضوع "لوکل سیلف گورنمنٹ" کو لفظی الٹ پھیر کے ذریعے تفنن کا سبب بنایا ہے: "خدا اس رپن لاٹ کو صدو سی سال عمر عطا کرے۔ ایسا سیر چشم تو انگریزوں کی کل قوم میں چراغ لمپ کیا برقی روشنی لے کر ڈھونڈے سے بھی نہ ملے۔" "کیوں حضرت سیر چشمی کی دلیل؟" "اجی میاں بھلا اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ اپنی قومی حکومت تک کو ہندوستان کی آزادی پر قربان کر دیا۔ اور صاف صاف ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ لو! کل سلف گورنمنٹ (اپنے گزشتہ زمانے کی حکومت) کو کل لے لو۔ بس اب کل سے پھر وہی ہندوستان اور وہی ہماری سلف یعنی گزشتہ زمانے کی حکومت۔" (۳۳)

منشی سجاد حسین نے لکھنؤ کا ماحول بہ چشم خود دیکھا تھا۔ لکھنؤ کا تہذیبی ورثہ ان کے خون میں تھا۔ انگریزی اقبال کا سورج بلند ہو رہا تھا اور برعظیم کی تہذیب کا زوال بھی تیز تر ہو رہا تھا۔ برعظیم سیاسی طور پر انگریزوں کا محکوم تھا اور انگریزی تہذیب بھی برعظیم کو فتح کرنے لگی تھی۔ منشی سجاد حسین برعظیم کی تہذیب کے علم بردار بن گئے تھے۔ انگریزوں اور علی گڑھ سے ان کو

فکری اختلافات تھے۔ چوں کہ طبعاً ظریف اور بذلہ سنج تھے لہذا یہ اختلاف " اودھ پنچ " کے صفحات پر طنز اور مزاح کے پیرائے میں پیش کیا اور ناولوں میں بھی یہی انداز برقرار ہے۔

منشی سجاد حسن کے مزاح پر دو باتوں نے خاصا گہرا اثر ڈالا۔ ایک تو لکھنؤ کا ماحول جس میں ضلع جگت، رعایت لفظی اور ایہام خوب پھل پھول رہے تھے اور دوسرا مغربی ادب اور ڈکنس (Dickens) (۱۸۱۲ء۔ ۱۸۷۰ء) کا مزاح۔ ان دونوں عوامل نے سجاد حسین کے مزاح پر اس طرح اثرات مرتب کیے کہ لکھنؤ کے ماحول نے تو ان کی تحریر میں ضلع جگت، لفظی رعایتیں اور لکھنؤ کے محاوروں اور زبان کے مخصوص استعمال کو فروغ دیا اور مغربی ادب کے مزاح کے اثر سے انھوں نے اودھ پنچ جاری کیا (جیسا کہ گزشتہ صفحات میں مذکور ہوا کہ یہ "لندن پنچ" کے اتباع میں جاری کیا گیا) نیز مغرب کے ناولوں سے متاثر ہو کر ان کے انداز مزاح کا نمونہ اردو میں منتقل کیا۔ سرشار کی طرح وہ بھی سروانتے ہیں (Cervantes) (۱۵۴۷ء۔ ۱۶۱۶ء) کے ناول ڈان کوئک زوٹ (Don Quixote) (پہلا حصہ ۱۶۰۵ء میں اور دوسرا ۱۶۱۵ء میں) سے متاثر ہوئے۔ " حاجی بغلول " پر ڈکنس کے پک وک پیپر (Pickwick Papers) (۱۸۳۶ ۔ ۳۸ء) کا بھی اثر ہے ۔ ڈان کوئک زوٹ (Don Quixote) اور سانچو پانزا (Sancho Panza) سرشار کے ہاں آزاد اور خوجی بن جاتے ہیں اور سجاد حسین کے ہاں حاجی بغلول اور حرفہ ریوڑی۔ ڈان کوئک زوٹ کا نیزہ سرشار کے ہاں قرولی اور سجاد کے ہاں جریب زیتونی بنتے ہیں۔ جس طرح ڈکنس نے پک وک کو مختلف مقامات پر بوکھلاہٹ اور حماقتوں سے گزار کر مزاح پیدا کیا ہے اسی طرح حاجی بغلول کو سجاد حسین نے بوکھلاہٹ، زود رنجی اور حماقت میں مبتلا دکھایا ہے البتہ حاجی بغلول کو ہمارے معاشرے اور ماحول میں رکھ کر تبدیلیاں پیدا کی گئی ہیں۔

منشی سجاد حسین کے ہاں طنز بھی خاصا ملتا ہے اور بعض مقامات پر انھوں نے طنز کے نہایت کامیاب اور اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں۔ جو فرضی خطوط انھوں نے گلیڈ اسٹون، ملکہ وکٹوریا اور مختلف ریاستوں کے سربراہوں وغیرہ کے نام لکھے ان میں ان کے مزاح کا انداز بدل جاتا ہے۔ یہاں وہ پُرلطف گفتگو اور طنزیہ تبصرے سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ زبان پر عبور اور محاوروں کے استعمال سے انھوں نے بہت کام لیا ہے۔ "لوکل" کے عنوان سے " اودھ پنچ "میں منشی سجاد حسین نے موسم کا احوال قلم بند کیا ہے اور اس کے پردے میں عام حالات اور واقعات کا تذکرہ اور ان پر تبصرہ کیا ہے۔ اس کی بڑی شہرت ہے۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ ان میں مزاح کبھی کبھار ہی ہوتا تھا اور زیادہ سے زیادہ انھیں دلچسپ ہی کہا جا سکتا ہے۔ طول طویل بیانات نے سجاد حسین کے مزاح کو بڑا نقصان پہنچایا۔ ایک تو یہ طویل کلام اس دور میں رد اور رائج تھا۔ دوم پینتیس سال تک ہر ہفتے وہ تازہ

یہ تازہ اور مزاحیہ نثر بھلا کہاں سے لاتے جب کہ موضوع بھی زیادہ وسیع نہ تھا اور خود کو اور اودھ پنچ کو انھوں نے عام حالات اور واقعات اور مشرق و مغرب کے تہذیبی تفاوت تک محدود کر رکھا تھا۔

سجاد حسین کانگریس کے حامی تھے اور مرتے دم تک حامی رہے۔ ان میں اور سید احمد خاں کے نظریات میں قطبین کا فرق ہے۔ سجاد حسین انگریزوں کے مخالف اور انگریزی تہذیب سے بیزار تھے۔ جب کہ سید احمد خاں انگریزوں سے مفاہمت کے حامی اور ان کی تہذیب سے مرعوب تھے اور چاہتے تھے کہ برعظیم کے باشندے بھی اس کا "کامل ترین سویلزیشن" (سید احمد خاں کے الفاظ میں) کو اپنالیں۔ چنانچہ سجاد حسین انگریزوں اور سید احمد خاں پر چوٹ کرنے کا کوئی موقع جانے نہیں دیتے۔ " حاجی بغلول" میں جب حاجی صاحب بیرسٹر صاحب کی کوٹھی سے نکلتے ہیں اور بیرسٹر کا کتا انھیں کاٹ لیتا ہے وہاں لکھتے ہیں: " صاحب کا ڈیئر کتا جو بہت منھ لگا تھا (یعنی مُنھ چاٹ لیا کرتا تھا)۔

"کایاپلٹ" اس لحاظ سے ایک عجیب ناول ہے کہ اس میں ایک طرف تو مصری لوح کا موکل اور اس کے کارنامے ہیں اور دوسری طرف انگریز، مصر میں مہدی سوڈانی کی انگریزوں سے جنگ، سید احمد خاں، کانگریس، ہوائی جہاز اور نہ جانے کس کس کے تذکرے ہیں۔ لگتا ہے کہ اس ناول میں منشی سجاد حسین کو مزاح اور پلاٹ سے زیادہ سیاسی اور سماجی حالات کو مقید کرنے کی فکر تھی۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں "موکل" کوٹ پتلون پہنے مسٹر جانسن کے کمرے میں اچانک نمودار ہوتا ہے اور جانسن صاحب کی یہ حالت ہے کہ:

> "اب تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ عجیب کوئی بے ڈول ہندوستانی نیمر، بے تمیز۔۔۔ معلوم ہوتا ہے سید صاحب کا کوئی اشکل چیلا ہے جس نے انگریزوں کی دیکھا دیکھی کوٹ پتلون تو پہننا سیکھ لیا ہے۔ مگر [آداب] اور اخلاق سے ناواقف ہے غصہ اس بنا پر اور بھی زیادہ ہو گیا کہ سید صاحب کا گروہ اس زمانے میں انٹی کانگریس ہونے کی وجہ سے کانگریس والوں کا دشمن سمجھا جاتا تھا" (۳۴)

منشی سجاد حسین کی مزاح نگاری کے بارے میں مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کا مزاح اس دور کے اہم مسائل کو موضوع بناتا ہے اور سماجی تبدیلیوں کا عکاس ہے۔

نواب آزاد کی ایک اور قابل قدر تصنیف "سوانح عمری مولانا آزاد" ہے۔ یہ اودھ پنچ میں قسط وار شائع ہوتی رہی۔ اس کی پہلی قسط ۴ جنوری ۱۸۸۹ء کو اور آخری قسط ۲۳ مئی ۱۸۹۰ء کو شائع ہوئی۔ کتابی صورت میں ۱۸۹۱ء میں سامنے آئی۔ نواب آزاد مغربیت کے شدید مخالف تھے۔ اپنی تصانیف میں انھوں نے مغرب، مغربی تہذیب اور انگریزوں کا مذاق اڑایا۔ ان پر گہرے

طنز کیے۔ نواب آزاد نثر میں وہی کام کرنا چاہتے تھے جو اکبر نے نظم میں کیا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ آزاد کو جہاں جہاں مشرقی تمدن ،اقدار اور افراد میں عیب اور کمی نظر آئی ہے انھوں نے اس کی بھی نشان دہی ضرور کی ہے۔ گویا یہ ایک طرح سے اپنی تہذیب کی خامیوں کا بھی اعتراف اور اہل وطن کی توجہ اس جانب مبذول کرانے کی کوشش ہے۔ یہ عنصر آزاد کی تحریر میں توازن اور اعتدال پیدا کرتا ہے اور مغرب کا متعصب نقاد ہونے سے بچا لیتا ہے۔ مغربی تصورات و افکار کی ہندوستان میں اشاعت کا ایک اور اہم ذریعہ عیسائی مذہب ہے۔ ملک میں اس مذہب کی تبلیغ و اشاعت کا کام ایک عرصہ قبل ہی شروع ہو چکا تھا کیونکہ چھٹی صدی عیسوی کے دور ہی سے جنوبی ہند میں ایک کلیسا منظم و مستحکم طریقہ پر کام کر رہا تھا لیکن سولہویں صدی عیسوی میں پرتگزیوں کی ہندوستان میں آمد کے ساتھ ہی عیسائیت کی مستعد و سرگرم تبلیغی جماعتوں نے کارہائے نمایاں انجام دینے شروع کئے۔ ملک کے مختلف عیسائی گرجاؤں سے تعلق رکھنے والی متعدد تبلیغی جماعتوں کی کوششوں کے نتیجے میں ہندوستان میں عیسائیوں کی ایک قابل لحاظ تعداد پیدا ہو گئی اور اسے ایک اہم اور موثر اقلیت کا درجہ حاصل ہو گیا۔ عیسائی مذہب کے موثر ربط ضبط پیدا کر لینے کے زمانے میں ہندوستان میں ہندو مت کے اعلیٰ اصولوں اور اقدار ہر عمل کرنیوالے صرف چند باشعور رہ گئے تھے۔ جب کہ عوام توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ہندو مت کے اصل اور بنیادی تصورات اور موجودہ دور میں ہندو مت کے انداز فکر میں انقلاب رونما ہوا۔ جبکہ انھیں عیسائی مذہب کی تبلیغ و اشاعت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ بعض اشخاص تو عیسائیت کے مذہبی عقائد اور اصولوں سے متاثر ہو گئے تھے۔ عیسائیت کا پورے جوش و خروش کے ساتھ استقبال کیا اور اس مذہب کی جسے وہ از کار رفتہ خیال کرتے ہوئے ترک کر چکے تھے پورے زور شور کے ساتھ مذمت شروع کر دی۔ لیکن بیشتر اشخاص ایسے موجود تھے جنھوں نے ہندو مت کے بنیادی تعلیمات کو مسلسل تلاش و جستجو کے ذریعہ جدید تصورات اور ضروریات کے مطابق اسے ہم آہنگ بنایا۔

عیسائی مذہب اور عقائد کے ساتھ ساتھ پر جوش اصلاحی تحریکات کے سبب ہندو مت کے اہم اور بنیادی اقدار کے قیام اور مغربی تہذیب کی خامیوں اور برائیوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس خصوص میں برہمو سماج' پراتھنا سماج' آریہ سماج' رام کرشنا مشن وغیرہ ان تمام تحریکوں کا مقصد ہندو مت کی عظمت رفتہ اور اس کی پرانی قدروں کو عصری ضروریات سے ہم آہنگ کرنے اور ان کے لیے نشاۃ ثانیہ کا موقع فراہم کرنا تھا۔ لیکن ان تحریکوں کو ملک میں سماجی انقلاب کی ضامن سماجی اصلاحات سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ ملک میں مغرب کے بر خلاف ہندو سماج کی تنظیم کا محور مذہبی اور سماجی نظام تھا۔ اور اس سے طبقہ داری نظام ، مال و جائداد ، شادی بیاہ ، خاندانی زندگی وغیرہ جیسے تمام مسائل مذہبی بنیادوں پر منسلک و مربوط تھے۔ ہندوستان میں اجتماعی سماجی اداروں نے انفرادی حیثیت کو بالکلیہ ختم کر کے رکھ دیا تھا۔ کیونکہ کسی بھی فرد کی جانب سے انفرادی ترقی کی

کوشش کو جماعتی مفاد کے خلاف تصور کئے جانے پر کسی صورت برداشت نہیں کیا جاتا تھا۔ عیسائیت کے نئے تصورات وافکار اور اس کے انسان دوست اصولوں نے ان اداروں پر سے مذہب کی گرفت کو کمزور کر کے رکھ دیا اور متعدد سماجی اصلاحات کی تحریکوں کو جنم دیا۔ طبقہ داری گھمنڈ اور نخوت، فرقہ ورانہ حکومت پسندی، اوہام پسندی، روایاتی عقائد وغیرہ سب سماجی جمہوریت کے آگے دم توڑنے لگے۔ اور سماجی اصلاح کی تحریکات نے ہندومت کی اصلاح کر کے ایک نئی ہندو سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ ان تمام تحریکات کی ترقی میں بڑی حد تک اُن روشن خیال ہندوؤں اور مذہبی مصلحین کی جدوجہد بھی شامل ہے۔ جنھوں نے ماضی میں ہندومت کی اصل روح کے خلاف پھیلی ہوئی سماجی لعنتوں اور بدعتوں کو دور کرنے کے لئے موثر طریقہ پر صدائے احتجاج بلند کی تھی۔

نئی تعلیم کے اثر و نفوذ، مواصلاتی وسائل کے پھیلاؤ معاشی ڈھانچہ کی تنظیم جدید اور مغربی تصورات کی روز افزوں اشاعت نے ہر شعبہ حیات میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دیا جس کے ساتھ ہی ملک کا نقشہ بدل گیا۔ ان تمام تبدیلیوں کے علاوہ عوام کے ذہنی شعور نے بھی سائنٹیفک اور ترقی پذیر انداز فکر اختیار کیا۔ انھوں نے قدامت پسندی کا لبادہ پھینکا اور وہ ترقی وکامیابی کی نئی راہوں پر گامزن ہو گئے۔ اس نئے نقطہ نظر نے ترقی کامیابی کے مغربی تصورات اور ہندوستان کی روحانی اقدار کے حیرت انگیز تصادم کے طور پر ایک اہم ورثہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اس قسم کی تلخ، ترش اور طنزیہ تحریروں میں بھی درپردہ اشارہ سر سید کی مصلحانہ کوششوں کی جانب ہوتا تھا اور مقصد ان کی مذمت ہی ہوتی تھی۔ مثلاً: ''شیک ہینڈ کرتا ہوں میں اس ریفارمر سے دنیاوی ترقی حاصل کرنے کی غرض سے، عہد کرتا ہوں کہ تجاوز نہ کروں گا ایک قدم بھی اس رستے سے جو راستہ میرا ریفارمر مجھے بتلائے (چاہے وہ جہنم کا راستہ ہو) نہ واسطہ رکھوں گا دین اور ایمان اور کل مذہبی خیالات سے کسی طرح۔ مقدم سمجھوں گا خوشنودی یورپ والوں کی، خدا کی خوشنودی پر، تعمیل کروں گا ان کے احکام کی، احکام الٰہی چھوڑ کر، نہ فرق کروں گا حلال وحرام میں، قولاً ہو یا فعلاً۔ نہ گردپھٹکوں گا ان پرانے ڈھکوسلوں کے جن کو فرض، واجب یا سنت مستحب کہتے ہیں۔۔۔ جھٹلاؤں گا حدیثوں کو۔۔۔ باطل سمجھوں گا اس کلام کو جس کو نادان اللہ کا کلام سمجھتے ہیں۔ حقیر سمجھوں گا ان لوگوں کو جو پابند ہوں گے مذہب کے۔۔۔ پلٹادوں گا قرآن وحدیث کے معنی کو۔۔۔ موتوں گا سیدھا کھڑے ہو کر اور پاک سمجھوں گا ان چھینٹوں کو جو زمین سے اڑ کر منھ پر پڑیں۔ دریغ نہ کروں گا بنیاد اسلام کے کھدوانے میں چاہے مسجد ہو۔ منھ چوموں گا کتوں کا طاہر جان کر ۔۔۔ شراب پیوں گا رمضان کے مہینے میں فرض کر کے۔ کلمہ پڑھوں گا اہل یورپ کا کلمہ اسلام کے بدلے۔ گیند یا کرکٹ کھیلوں گا نماز کے بدلے۔ لندن شریف کی زیارت کروں گا حج کے بدلے۔ تبرک سمجھوں گا اس کھانے کو جو جھوٹا ہو کسی انگریز کا۔ اے میرے ریفارمر! اگر لڑکھڑائیں میرے قدم ان راہوں پر چلتے ہوئے تو انجام میرا ہو ساتھ پرانی روشنی والوں کے اور نہ

نصیب ہو مجھ کو اس پاک چیز کا جو بکسوں میں بند ہو کر ولایت سے آتی ہیں"(۳۵)علی گڑھ، سید احمد خاں اور نئی تہذیب کے کٹر مخالف تھے۔ ذیل میں ان کے مزاح کا ایک نمونہ پیش خدمت ہے۔ اس میں انھوں سید احمد خاں کی انگریز دوستی اور مذہبی عقائد پر طنز کیا ہے۔"سید احمد خاں دوسرے خیال کا کہن سال انسان ہے۔ وہ نیچر سے کہتا ہے کہ اے نیچر مرحبا تجھ پر اور تیری ہفتاد پشت پر کہ تو نے ایسی قوم کو پیدا کیا جیسے انگریز ہیں۔ ہم کو ایسے گورے چٹے خوب صورت بالا بلند عالی حوصلہ جفاکش دلیر غیور دانش مند حکیم مزاج حکام کہاں ملیں گے۔ ہم کو مذہب کی قید سے آزاد کون رکھے گا۔ ہم کو دوزخ کے جھوٹے دھڑکوں سے کون نجات دے گا۔ ہم کو اچھی اچھی نوکریاں کون دے گا۔ ہم کو ایسی باریکی سے کون انصاف کرے گا۔ اے نیچر! ان انگریزوں میں جو رہی سہی ایک دو تین چار پانچ چھ سات آٹھ نو دس گیارہ (للہ اختصار مد نظر رکھیے) بُرائیاں ہیں ان کو بھی دُور کر دے اور تاقیام دہر ان کو ہمارے سر پر سایہ فگن رکھ اور ہم لوگ یکدل ہو کر ہل ہل پنیاں کو جائے ری نندیا گایا کریں۔" (۳۶)مصنف مزید ارقام کرتے ہیں کہ:

> "مذہب بہت نازک چیز ثابت ہو رہا ہے لیکن اسمیں جو کہا گیا ہے کہ عقل میں آئے یا نہ آئے۔ ایک بے ڈھب جملہ ہے مثلاً فرشتوں کا وجود سر سید قبول نہیں فرماتے بہشت دوزخ نہیں مانتے اور یہ باتیں مشاہدات سے اور عقلی دلیل سے ہرگز نہیں ثابت ہو سکتیں۔" (۳۷)

ہندوستان میں انگریزوں کا اقتدار قائم ہو جانے کے بعد میں ہندوستانی صنعت میں بھی انقلاب رونما ہوا۔ اوراس کے ساتھ ہی برطانوی صنعتی پیداوار کی کھپت اور نکاسی کے لئے ہندوستان کا میدان کافی وسیع ہو گیا۔ نتیجتاً ہندوستانی صنعتیں تباہ ہو کر رہ گئیں۔ انگریزی حکومت کی عدم مداخلت کی پالیسی نے تو ان کے بچے کھچے وجود کو بھی ختم کر دیا۔ آزاد تجارت کی پالیسی صرف اُن ممالک میں کامیاب ثابت ہو سکتی ہے جہاں کہ سرمایہ دار حوصلہ مند ہوں اور مزید برآں انھیں اعلی ترقی یافتہ اور ماہر کاریگر حاصل ہوں۔ "جولاہا کانفرنس" نامی ایک مضمون میں یوپی کے دیہات کے لہجے کی نقل کی ہے اور علاقائی اردو کا نمونہ پیش کیا ہے۔ اس میں بھی کچھ نہ کچھ سماجی اور معاشی مسائل پر روشنی ڈالی ہے:

> "اے بھائیو آپ لوگن کھوب جانت ہیں کہ ہندوستان میں میجر (منچسٹر) کے کپڑے اور کسم کسم کے انگریجی لوگے کی تجارت نے ہمرے پیسہ میں کیسی نکسان پہنچائی ہے۔ ہمری آمدنی ہمری روجی اور ہمری ترکی میں کیسی کچھ کمی اور جرر رسائی کا سبب بھئی ہے۔" (۳۸)

سوانح عمری مولانا آزاد نواب سید محمد آزاد کی فرضی سوانح عمری ہے۔ اس پُرلطف اور مزاحیہ سوانح عمری میں نواب سید محمد آزاد نے اپنی زندگی کے فرضی واقعات بیان کئے ہیں اور مغرب زدگی، آزادیٔ نسواں، مکر و فریب اور سید احمد خاں پر گہرے طنز کیے ہیں۔ سوانح عمری کے پردے میں انھوں نے سید احمد خاں کے نام نہاد "رفارمروں" پیروں، مولویوں، وکیلوں اور سیاست دانوں وغیرہ کے لتے لیے ہیں۔ سوانح عمری کی ابتدائی اتنی سنجیدہ ہے کہ لگتا ہے نواب آزاد اپنی زندگی کے صحیح صحیح حالات اور واقعات بیان کرنے جارہے ہیں۔ اس سوانح عمری میں سید احمد خاں اور ان کے معتقدوں پر کھلم کھلا چوٹ کی گئی ہے:
"اردو میں ہم سید مغربی کی عبارت اور تصانیف کے بے انتہا تعریف کرتے تھے اور اون کو بلا خیال اس کے کہ کوئی نسبت مشبہ اور مشبہ بہ میں ہو یا نہو، بائرن، مکالے، ہملٹن، سر والٹر سکاٹ، گولڈ سمتھ غرض جس انگریز سے جی چاہتا ملا دیتے تھے اور اس پر حاضرین جلسہ بغیر اس علم کے کہ یہ سارے انگریز مصنف و محرر تھے یا جنگلی جانور بلا تامل صاد کر دیتے تھے۔"(۳۹) اس سوانح عمری میں دراصل نواب آزاد نے اپنے زمانے کے حالات اور بدلتی ہوئی اقدار پر طنز کیا ہے کہ:

> "موجودہ زمانے کے تمدن اور قواعد ناموری کے مطابق کوئی نیک نیت، ایمان دار اور سچا آدمی بڑا شخص نہیں بن سکتا اور دنیا میں اس کو معصوم رہ کر ہر طرح کا عیش و آرام کبھی نصیب نہیں ہو سکتا۔" (۴۰)

ہندوستان کی تاریخ اس کی تین مثالیں پیش کرتی ہے کہ کس طرح مختلف نسلوں اور تہذیبوں میں یہاں تصادم ہوا اور کس طرح یہ نسلیں اور تہذیبیں ایک مدت تک دوسروں پر برتری حاصل کرنے کی جدوجہد کرتی رہیں اور آخر کار آہستہ آہستہ ایک دوسرے میں جذب ہو کر باہم ایک ہو گئیں، باشندگان ہند کے رسم و رواج، مذاہب ادبیات اور فنون لطیفہ میں جو تہذیبی انجذاب کا عمل جاری رہا۔ اس مضمون "حضرت حالی کی شاعری" میں مغربی تہذیب کے ساتھ مغربی ادب و زبان کے اثرات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ کہ کسی طرح اردو ادب پر انگریزی اثر انداز ہوئی۔ "آپ نے تو بیڑا اٹھالیا ہے کہ اردو شاعری کا ستیاناس پورے طور سے کیا جائے اور کوئی وجہ نہیں صرف آپ کے مقتضائے طبیعت ہے۔ مگر واللہ اردو اشعار کو انگریزی جامعہ پہنانا ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے عزارہ دار پائجامہ پر پتلون پہن لیا مگر یہ نہ سمجھئے کہ آپ ہی اس رنگ میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔" (۴۱) چکبست مزید ارقام کرتے ہیں۔ "اسی طرح کل نظم میں خرافات کا انبار لگا ہوا ہے اردو شاعری کی گردن کند چھری سے دیتی ہے واقعی افسوس کا مقام ہے۔ اردو شاعری نے کیا کیا رنگ دیکھے ایک زمانہ وہ تھا کہ اسنے عالم طفولیت میں سودا و میر ایسے باکمالون کے دامن میں پرورش پائی۔ آتش۔ ناسخ۔ غالب۔ ذوق نے اسکا شباب دیکھا اب بیچاری حضرت داغ سے بوڑھے غمزے کر رہی تھی کہ مولانا حالی نے کلمہ پڑھکر گلے پچ چھری پھیر دی۔ اب کبھی کبھی فاتحہ پڑھ دیتے ہیں۔" (۴۲)

مضمون ''معشوقہ فرنگ'' اس اعتبار سے ایک پہلا ڈرامہ ہے کہ شکسپیئر کے ڈراما رومیو جولیٹ کی شکل سے اردو نظم کے خوشنما لباس میں آیا سوسائٹی کے لحاظ سے انگلش طرز معاشرت کا نقشہ جیسا انگریزی ڈراموں میں کھینچا جاتا ہے۔ اس سے ہندوستان کے خیالات بہت فاصلے پر ہیں۔ مصنف اس مضمون میں ادب میں مشرقی اور مغربی تہذیب کے ادغام کے بارے میں لکھتا ہے کہ ''اردو زبان میں شاعری کا نیا مذاق جو انگریزی لٹریچر کے سائے سے پیدا ہوئی ہے اب بے سروپا غزل بازی اور فضول لفاظی پر پانی پھیر رہا ہے جو لوگ صرف غزلوں ہی کے چکر میں پڑے ہوئے اسی کو شاعری کی دنیا سمجھ رہے ہیں۔ وہ وسیع نظر کے نہ ہونے سے اسی طرح مجبور ہیں جسطرح انڈے کے اندر بچہ کے لیے انڈہ ہی کرہ ارض ہے مگر جنکی واقفیت وسیع اور قابلیت کافی ہے انکو یونہی اردو شاعری پر احسان کرنا چاہیے۔ جس طرح حضرت برق نے کیا۔'' (۴۳) مصنف مضمون ''بے تکی شاعری'' مزید ار قام کرتا ہے کہ ''بے تکی شاعری کا سلسلہ ہندوستان میں خوش قسمتی سے انگریزی میں لایا گیا۔ قید قافیہ و ردیف و بحر وترک متروک استعمال سے آزاد۔'' (۴۴)

اودھ پنچ کے مصنف مغربیت کے سخت خلاف تھے۔ اور عوام کو مغرب کی تقلید اور انگریزیت سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ ساتھ ہی وہ مشرقی تہذیب کی کمیوں کو بھی برداشت نہیں کرتے اس لئے انھوں نے مشرق کے باعث تنگ اور مخرب اخلاق پہلوؤں کو بھی ہدف طنز بنا کر اپنی وسعت نظری کا ثبوت دیا ہے۔ ''علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کہ جو ایک زمانے تک تشبیہ ایک جماعت کے لوگوں میں کتاب آسانی کی طرح پڑھا اور مانا جاتا تھا اسکی حالت بھی بہت عبرت انگیز ہے قومی مذاق لٹریچر کا زینہ نہایت پست ہے۔'' (۴۵) مزید رقم طراز ہیں کہ:

> ''جو دس بیس اعلی درجے کے انگریزی مصنفوں کی تصنیف پڑھ سکیں وہ مغربی انشا پردازی کے ہادی بننے پر نازاں ہیں اور چاہتے ہیں کہ اور لوگ انکو اپنا استاد یا امام قبول کر لیں۔'' (۴۶)

غرض کی نئی تعلیم کے اثر و نفوذ، مواصلاتی وسائل کے پھیلاؤ معاشی ڈھانچہ کی تنظیم جدید اور مغربی تصورات کی روز افزاں اشاعت نے ہر شعبہ حیات میں ایک انقلابِ عظیم برپا کر دیا۔ ان تمام تبدیلیوں کے علاوہ عوام کے ذہنی شعور نے بھی سائینٹیفک اور ترقی پذیر اندازِ فکر اختیار کیا۔ انھوں نے قدامت پسندی کا لبادہ اتار پھینکا اور وہ ترقی وکامیابی کی نئی راہوں پر گامزن ہو گئے۔ اودھ پنچ نے نئے نقطہ نظر کے مغربی تصورات اور ہندستان کی روحانی اقدار کے تصادم کی بھرپور مزاحمت کی ۔ جس نے ایک اہم ورثہ کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔

حوالہ جات

۱۔اودھ پنچ،اگست ۱۸۷۷ء

۲۔ اودھ پنچ،دسمبر ۱۸۹۰ء

۳۔احمد سرور، پروفیسر آل، مشمولہ سہ ماہی رسالہ وادیب،علی گڑھ ، اردو میں طنز و مزاح، ص۳۹

۴۔صدیقی، رشید احمد،طنزیات و مضحکات، دہلی، کوہ نور پرنٹنگ پریس، ۱۹۷۲ء، ص ۱۱

۵۔ Pickwick Papers by Clarles Dickene , pp .227 India ed . Rajendra Printers , Dehli , 1972.

۶۔اکرام الدین،خواجہ محمد رشید احمد صدیقی کے اسلوب کا تجزیاتی مطالعہ، نئی دہلی،۲۰۱۶ء، ص۵۷

۷۔جوالا پرشاد برق، البرٹ بل، مشمولہ نقوش طنز و مزاح نمبر۱۹۵۹ء، ص۲۲۹

۸۔اودھ پنچ ،مارچ،۱۸۷۹ء

۹۔اودھ پنچ،نومبر،۱۸۸۳ء

۱۰۔اودھ پنچ،جولائی،۱۸۷۸ء

۱۱۔اودھ پنچ، جنوری،۱۸۷۹ء

۱۲۔اودھ پنچ، مئی،۱۸۸۴ء

۱۳۔اودھ پنچ، اپریل ۱۸۸۰ء

۱۴۔ایضاً

۱۵۔اودھ پنچ،جون،۱۸۸۲ء

۱۶۔ ایضاً

۱۷۔ ابن اسماعیل، بحوالہ اردو طنز و مزاح، احتساب و انتخاب، ص ۴۴

۱۸۔ اودھ پنچ، اکتوبر، ۱۹۰۳ء

۱۹۔ اودھ پنچ، فروری ۱۹۰۵ء

۲۰۔ مصباح الحسن قیصر، ڈاکٹر، معاونین اودھ پنچ، ۱۹۳۶ء، ص ۱۳

۲۱۔ اودھ پنچ، اگست ۱۹۰۳ء

۲۲۔ اودھ پنچ، اکتوبر ۱۹۰۳ء

۲۳۔ اودھ پنچ، جولائی، ۱۸۹۶ء

۲۴۔ ایضاً

۲۵۔ اودھ پنچ، جون، ۱۹۰۳ء

۲۶۔ ایضاً

۲۷۔ اودھ پنچ، اپریل، ۱۹۰۳ء

۲۸۔ ایضاً

۲۹۔ اودھ پنچ، مارچ، ۱۹۰۳ء

۳۰۔ اودھ پنچ، جولائی، ۱۹۰۳ء

۳۱۔ ایضاً

۳۲۔ اودھ پنچ، جون، ۱۹۰۶ء

۳۳۔ اودھ پنچ، جنوری، ۱۸۸۳ء

۳۴۔ اودھ پنچ، نومبر، ۱۹۰۶ء

۳۵۔ ایضاً

۳۶۔ اودھ پنچ، جون، ۱۹۰۶ء

۳۷۔ ایضاً

۳۸۔ اودھ پنچ، جنوری، ۱۹۰۶ء

۳۹۔ اودھ پنچ، اگست، ۱۹۰۶ء

۴۰۔ ایضاً

۴۱۔ اودھ پنچ، جولائی، ۱۹۰۳ء

۴۲۔ ایضاً

۴۳۔ اودھ پنچ، جون، ۱۸۹۶ء

۴۴۔ ایضاً

۴۵۔ اودھ پنچ، جنوری، ۱۸۹۱ء

۴۶۔ ایضاً

باب نمبر ۴

نو آبادیاتی ہندوستان میں مفاہمتی رویوں پر طنز بحوالہ خصوصی اودھ پنچ کی نثر

۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے مسلمانوں کی حالت اور بھی بدتر کر دی۔ حالاں کہ اس ہنگامے میں ہندو بھی برابر کے شریک تھے، لیکن انگریزوں نے بغاوت کا محرک کار سب سے زیادہ مسلمانوں کو ہی ٹھہرایا۔ اس طرح مسلمانوں کی حالت ٹھیک ہونے کے بجائے اور بھی زیادہ بگڑ گئی۔ ہر گلی کوچہ اور بازار میں مسلمانوں کا قتل ہوا۔ بے گناہوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔ غدر کے ان دردناک مظالم کا بیان خود کئی انگریز مورخوں نے کیا ہے: ”بوڑھے آدمیوں نے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ ان سے اور بے کس عورتوں سے جن کی گود میں دودھ پیتے بچے تھے ان سے ہم نے اس طرح بدلا لیا جس طرح بڑے بڑے باغیوں سے لیا جاتا ہے“ (۱)اس غدر نے مسلمانوں کو مکمل طور پر برباد کر دیا تھا۔ ان کی حالت ہر اعتبار سے مایوس کن تصویر بنی ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی حالت اس قدر خراب تھی کہ بقول سر سید احمد خاں: ”جس حساب سے یہ تنزل شروع ہوا ہے اگر اس اوسط سے اس کا اندازہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ چند ہی برس اس بات کو باقی ہیں کہ مسلمان سائیس، خانسامانی، خدمت گزاری، گھس کھودنے کے سوا اور کسی درجہ میں نہ رہیں گے اور کوئی ایسا گروہ جس کو دنیا میں کچھ بھی عزت حاصل ہو، مسلمانوں کے نام سے نہ پکارا جائے گا۔“ (۲)

ان حالات سے سر سید کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اب مسلمانوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے کسی تلوار یا ہتھیار کی ضرورت نہیں ہے بلکہ مغربی علوم و فنون سے واقفیت ہی ان کی حالت کو بہتر بنانے میں معاون ہو سکتی ہے۔ جب سر سید ضلع بجنور میں تھے انھیں یہاں پر دو سال چار مہینے ہو چکے تھے۔ تب ہی ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو دلی میں بغاوت ہوئی اور ۱۲ مئی کو یہ خبر بجنور پہنچی۔ اس وقت وہاں پر ۲۰ یورپین مرد، عورت اور بچے موجود تھے۔ سر سید نے ان کی جان بچانا اپنا پہلا فرض سمجھا اور انھیں خیریت کے ساتھ رڑکی پہنچا دیا۔ جب ہنگامہ ختم ہو گیا تو انگریزوں کا قہر و عتاب سب سے زیادہ مسلمانوں کے حصے میں آیا۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ مسلمانوں میں تعلیم کی کمی تھی جس کی وجہ سے وہ اپنی بات حکومت تک پہنچانے میں قاصر تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ انگریزوں نے ملک مسلمانوں کو شکست دے کر حاصل کیا تھا اس لیے انگریز انھیں بغاوت کا اصل سرچشمہ تسلیم کرتے تھے۔

اس وقت پوری دنیا کے مسلمانوں کی حالت قریب قریب بہتر تھی۔ سوائے ہندوستانی مسلمانوں کے جو کہ حکومت کی طرف سے باغی کے خطاب سے نوازے جا چکے تھے۔ اس بغاوت کی وجہ سے انگریزوں کا مسلمانوں کے ساتھ سلوک یہ تھا کہ اگر انھیں یہ معلوم ہو جاتا کہ یہ شخص مسلمان ہے تو اس کو فوراً سزا دینے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ حالاں کہ انھیں یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ بغاوت میں اس کا ہاتھ نہیں ہے لیکن سزا دینے کے لیے یہی جاننا کافی تھا کہ یہ شخص مسلمان ہے۔ اس وقت مسلمانوں

کی سیاسی، سماجی اور معاشی حالت درست نہ تھی، لیکن باوجود اس کے مسلمان بھی انگریزوں سے حد درجہ نفرت کرتے تھے۔ وہ ان کے صحیح قدم کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے، ان کے اسکولوں میں اپنے بچوں کو نہیں بھیجتے تھے، انگریزی ملازمت کرنا پسند نہ تھا، بھوکوں مرنا پسند تھا۔ مولوی حضرات کا یہ عالم تھا کہ ان سے ہاتھ ملانا تک گوارا نہ کرتے تھے۔ ادھر انگلستان سے آئے ہوئے خطوط نے مسلمانوں کی بے چینی میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا اور اب ان کا شک یقین میں بدل گیا کہ اب تو ہمارا مذہب رسم ورواج، رہن سہن اور طور طریقے سب تبدیل ہو جائیں گے۔ ۱۸۵۹ء کے اس خط نے اور بھی بے چین کر دیا اس میں لکھا تھا کہ:

> "تمام ہندوستان میں ایک عمل داری ہو گئی ہے۔ تار برقی کی وجہ سے ایک جگہ کی خبریں دوسری جگہ بڑی آسانی سے آجاسکتی ہیں۔ ریل کے اجراء کی وجہ سے آمدورفت میں بھی آسانی ہو گئی ہے اس لیے مناسب ہے کہ لوگوں کا مذہب بھی ایک یعنی کہ عیسائی مذہب ہو جائے۔ (۳)

اس طرح کے خطوط سے مسلمانوں میں نفرت و غصہ اور بھی زیادہ بڑھ گیا۔ سر سید نے انگریزوں اور مسلمانوں کا بہ غور مطالعہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ کوشش کرنی بیکار ہے کہ انگریز ہندوستان کو چھوڑیں گے۔ اگر کوشش ہی کرنی ہے تو اس بات کی کی جائے کہ مسلمانوں کی حالت بہتر بنائی جائے۔ اس لیے انھوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ مسلمانوں کی حالت کو بہتر تب ہی بنایا جاسکتا ہے کہ جب ان کو سیاست سے بالکل الگ رکھا جائے کیوں کہ یہ لوگ عقل سے زیادہ جذبات سے کام لیتے ہیں۔ سر سید نے مسلمانوں کو سیاست سے دور رہنے کے مشورے دیے اور زیادہ سے زیادہ یہی کوشش کی کہ انھیں جدید تعلیم یعنی سائنس و ٹیکنالوجی کی طرف راغب کیا جائے اور ایسی تعلیم سے دور رکھا جائے جو کہ ہمارے ہندو بھائی صرف نوکری حاصل کرتے ہیں۔ سر سید نوکری حاصل کرنے کی غرض سے تعلیم حاصل کرنے کے خلاف تھے۔ وہ ایسی تعلیم کے حامی تھے جو انسان کو انسان بننے میں مدد کرے۔ ان کے اس منصوبے سے جواہر لال نہرو نے بھی اتفاق کیا۔ انھوں نے لکھا کہ: "سر سید کا یہ فیصلہ کہ تمام کوششیں مسلمانوں کو تعلیم جدید سے آراستہ کرنے پر صرف کر دینی چاہئیں، یقیناً درست اور صحیح تھا۔ میرا خیال ہے کہ بغیر اس تعلیم کے مسلمان طرزِ جدید کی قومیت کی تعمیر میں کوئی قابل قدر حصہ نہ لے سکتے تھے، بلکہ اندیشہ تھا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہندوؤں کے لیے ہندوؤں کے غلام بن جائیں گے جو تعلیم میں ان سے آگے تھے۔ اور معاشی اعتبار سے بھی زیادہ مضبوط۔ (۴) سر سید نے اس سلسلے میں خود کہا کہ:

> "جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ پالیٹیکل امور پر بحث کرنے سے ہماری ترقی ہوگی، میں ان سے اتفاق نہیں کرتا۔ ہماری قوم کو بجز ترقی تعلیم کے اور کسی چیز پر کوشش کرنے کی

ضرورت نہیں، اگر ہماری قوم میں کافی تعلیم ہو جاوے گی تو ہم کو وہی کافی ذریعہ تنزل کی حالت سے نکلنے کا ہو گا۔"(۵)

عرض یہ کہ سرسید نے اپنے اہم پہلو کے ذریعہ مسلمانوں میں تنگ نظری، تعصب اور انگریزوں سے نفرت کی بجائے ان سے میل جول کرنے کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ تاکہ مسلمان بھی ہندوؤں کی طرح حکومت کی نظر میں سرخ روئی حاصل کر سکیں۔ اپنے ایک خط میں جو کہ انھوں نے انگلستان سے بھیجا تھا لکھا کہ: "اے ہندوستان کی بھلائی چاہنے والو! تم کسی سے توقع مت رکھو اور خود اپنے بھروسے اور آپس کے چندے سے اپنے ملک میں تمام علوم اعلیٰ درجے سے ادنیٰ درجے تک اپنی زبان میں پھیلاؤ، پھر جب تم علوم سے واقف ہو جاؤ گے تب تمہاری نگاہ میں گورنمنٹ کی نوکریوں کے لالچ کی کچھ بھی حقیقت نہیں معلوم ہوگی۔ امید ہے کسی نہ کسی دن ایسا ہو گا، ہو گا، ہو گا۔"(۶) سرسید نے مسلمانوں کو جو اپنے ہم وطن بھائیوں سے تعداد میں، تعلیم و تربیت میں اور دولت و عزت میں ہر لحاظ سے کم تھے، انھیں زیادہ سے زیادہ سیاست سے دور رہنے کی نصیحت و تلقین کی اور مفاہمتی راستہ اپنایا۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۸۶۶ء میں سرسید نے اسی ایسوسی ایشن سے نکالا، یہ ان کے آخر دم تک جاری رہا۔ شروع میں اس میں زیادہ تر سیاسیات سے متعلق ہی مضامین لکھے جاتے تھے۔ اس اخبار کا مقصد ہندوستانیوں کو انگریزوں کی پالیسیوں وغیرہ سے اور انگریزوں کو ہندوستانی عوام کے حالات وغیرہ سے آگاہ کرنا تھا۔ اس اخبار کی خوبی یہ تھی کہ اس کا ایک کالم انگریزی میں اور ایک اردو میں ہوتا تھا۔ سرسید نے ہر طرح سے مسلمانوں اور انگریزوں کو قریب لانے اور مفاہمتی رویہ اختیار کروانے کی کوشش کی۔ اس میں سوشل، اخلاقی اور پولیٹیکل مضامین برابر چھپتے تھے۔ اس کی آواز اور اخباروں کی طرح معمولی نہ تھی، بلکہ اس کی آواز حکمران اور عوام دونوں کے لیے ہی قابل توجہ تھی۔ کتاب 'پلرز آف دی انڈین امپائر' کا مصنف اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ:

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ سے جو مسلمانوں کا خاص آلہ ہے اگر پچھلے سال کے مضامین جمع کیے جائیں تو ہندوستان کے قابل اور معزز مسلمانوں کی رائے کا اگرچہ وہ تعداد میں کم ہیں، ایک عجیب اور مفید مجموعہ جنگ روم وروس اور روس وافغانستان اور روس وہندوستان کے بن جائے گا۔(۷)

اتنے لمبے عرصے تک جاری رہنے کی وجہ اس کی کچھ خصوصیات تھیں مثلاً اس نے کبھی کسی کی دل آزاری نہیں کی، سنجیدگی اور متانت سے کام لیا۔ قوم کی نسبت دوستی یا خیر خواہی کے خلاف کبھی ایک حرف نہیں لکھا۔ غیر قوم کے عہدہ داروں کی ترقی سے ناراضگی ظاہر نہیں کی، کبھی ہندو یا مسلم ریاست کے خلاف نہیں لکھا، کبھی ہندو مسلم تعصبات کو بڑھاوا نہیں دیا، ہمیشہ غیر جانب داری سے ہی کام لیا۔ حالاں کہ یہ گورنمنٹ اور اس کے مدبروں پر نکتہ چینی کرتا تھا لیکن تہذیب و تمیز کو

ہمیشہ ملحوظ رکھتا تھا۔ اس کی خبروں کا ماخذ ہمیشہ معتبر اور مستند اخبار رہے۔ ہر ایک واقعہ کو پوری دیانت کے ساتھ شروع سے آخر تک مسلسل بیان کرتا تھا۔ اس کی باقاعدگی کا یہ عالم تھا کہ وہ بتیس سال تک برابر جاری رہا۔

علی گڑھ تحریک کے محدود مقاصد کے پیش نظر سر سید احمد خان ملک کے سیاسی مسائل کی جانب بھی اپنے رویے کو محدود کرنا پڑا۔ ان کے سیاسی نظریے میں تنگ نظری کا عنصر شامل ہو گیا۔ ۱۸۸۵ء میں کانگرس کے قیام کے بعد کئی سال سر سید خاموش رہے۔ ۱۸۸۷ء میں لکھنو میں محمڈن نیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسے میں انھوں نے اپنی پہلی مخالف تقریر کی۔ انھوں نے اس تقریر میں کہا۔ ''آپ خیال کریں کہ وائس رائے کے ساتھ کونسل میں بیٹھنے کے لئے واجبات سے ہے کہ ایک معزز شخص ملک کی معزز شخصیتوں میں سے ہو۔ کیا ہمارے ملک کے رئیس اس کو پسند کریں گے کہ ادنیٰ قوم یا ادنیٰ درجہ کا آدمی خواہ اس نے بی۔ اے کی ڈگری لی ہو یا ایم اے کیا اور گو وہ لائق بھی ہو ان پر بیٹھ کر حکومت کرے۔ ان کے مال و جائیداد اور عزت پر حاکم ہو۔ کبھی نہیں کوئی ایک بھی پسند نہیں کرے گا۔ گورنمنٹ کی کونسل کی کرسی نہایت معزز ہے۔ گورنمنٹ مجبور ہے کہ سوائے معزز کسی کسی کو بھی نہیں بٹھا سکتی اور نہ وائسرائے ان کو مائی کولیگ یا مائی آنر ایبل کلیگ کہہ سکتا ہے۔ نہ شاہانہ ڈنروں میں اور اور شہنشاہی جلسوں میں جہاں ڈیوک اور ارل بڑے بڑے معززین شامل ہوتے ہیں بلایا جا سکتا ہے۔ سر سید کے ان خیالات کے پیش نظر پروفیسر شان محمد کہتے ہیں کہ سر سید کا نظریہ رجعت پسندانہ تھا''(۸)

سر سید احمد خاں سوچتے تھے کہ سیاسی اختیارات صرف امراء اور رؤسا کے ہاتھ میں رہنا چاہیے۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ سر سید کو یہ معلوم نہ تھا کہ برطانوی حکمراں سب کے سب اس طبقے سے تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ متوسط طبقے کے لوگ تھے۔ وہ صرف اس بات سے مطمئن تھے کہ انھیں اس بات کا علم نہیں کہ انگریز حکمران لارڈ یا ڈیوک خاندان یا پھر درزی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ انھوں نے صرف کونسل کے منتخب شدہ ممبروں کی توسیع کی مخالفت کی بلکہ کانگریس کی دوسری مانگ کہ سول سروس کا امتحان انگلستان کی طرح ہندوستان میں بھی ہوا کرے، مخالفت کی۔ ظاہر ہے ہند تعلقدار رئیس اور راجا سر سید کے ہم خیال تھے کیونکہ انھیں جمہوری نظام سے خطرہ لاحق تھا۔ برطانوی اقتدار پسند طبقہ کانگریس کو ایک بہت بڑا خطرہ سمجھتا تھا۔

سر سید احمد کی پالیسی کانگرس کے قیام ۱۸۸۵ء تک صحیح تھی۔ مگر ایک ترقی پسند قوم کے لیے یہ پالیسی نہ تو آخری مقصد ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس کو ہمیشہ اپنایا جا سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں کی اکثریت نے اُن کی پالیسی پر عمل نہیں کیا۔ بدرالدین طیب جی نے جو خود امیر طبقے سے تعلق رکھتے تھے شروع ہی سے سر سید کو خطوط لکھے کہ وہ اپنی اس پالیسی کو چھوڑ کر کانگرس میں شامل ہو جائیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد عموماً تمام ہندوستانی سیاسی اعتبار سے انگریزوں کے غلام ہوگئے تھے۔ سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کو انگریزوں کا ذہنی طور پر غلام ہونے کی مہم چلائی۔ انھوں نے علی گڑھ تحریک چلانے میں ایک متوازن راستہ نہیں اپنایا وہ انگریزی اور مغربی تعلیم کا فروغ ضرور کرتے مگر ادارے کو حد سے زیادہ انگریزوں اور برطانوی سرکار کے اثر میں نہ رکھتے۔ یہی وجہ تھی کہ سرسید احمد خان کی انتھک محنت کے باوجود اُن کی زندگی ہی میں علی گڑھ تحریک کے حامی دو گروپوں میں منقسم ہوگئے۔ ایک گروپ سرسید کی سیاسی علیحدگی کی پالیسی اور رجعت پسندی کو خیرباد کہہ کے قومی سیاست میں بھی شامل ہوگئے۔

منشی سجاد حسین سرسید احمد خان اور ان کی تحریک علی گڑھ کے روزِ اول ہی سے سخت مخالف تھے۔ کانگرس کے قیام کے دو برس بعد ۱۸۸۷ء میں کانگرس کے رکن بنے اور آخر عمر تک اسی کے حامی رہے۔ منشی سجاد حسین مغربی تہذیب اور معاشرے میں اس کے بڑھتے ہوئے اثرات کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ گویا معاشرتی اعتبار سے وہ قدامت پرستی کے زیادہ قریب تھے۔ منشی سجاد حسین فطرتاً نڈر اور بیباک تھے۔ ان کی اس بیباکی کی جھلک اودھ پنچ کی پالیسی میں بھی نظر آتی ہے۔ طنز و ظرافت ان کا اسلوب نگارش ٹھہرا تھا۔ "موافقت زمانہ" اپنے عہد کا بہترین سیاسی طنزیہ تھا۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام منشی سجاد حسین کی طنز نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "منشی حسین کا سیاسی طنز دلچسپ ہے مگر سطحی ہے۔ وہ محاورات سے ظرافت پیدا کرتے ہیں۔ واقعہ اور خیال ہے کم مگر کہیں کہیں ان کی طبعی خوش دلی طنز میں وہ شادابی اور جدت پیدا کر دیتی ہے کہ دھوپ میں بوندیں پڑنے کا سماں دکھائی دیتا ہے"۔(۹)

منشی سجاد حسین کے نزدیک ہندوستان اور ہندوستانیوں کی غلامی ایک ذلیل ترین حقیقت تھی جسے وہ کسی صورت میں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اور چوں کہ کانگریس قومی اتحاد کے نعرے کے ساتھ میدان سیاست میں اتری تھی اور بتدریج حکومت خود اختیاری کے مطالبے کی جانب بڑھ رہی تھی لہٰذا کانگریس کے قیام کے دوسال بعد انھوں نے باقاعدہ کانگریس میں شمولیت اختیار کرلی۔ اودھ پنچ کا جھکاؤ بھی واضح طور پر کانگریس کے حق میں ہوگیا۔ حالاں کہ اس زمانے میں مسلمان سرسید کی قیادت میں کانگریس سے بالکل الگ تھلگ تھے۔ لیکن منشی سجاد حسین کو بھلا یہ کیسے گوارا ہوسکتا تھا کہ وہ سرسید کی کانگریس سے علیحدہ رہنے کی ہدایت کو قبول کرلیتے۔ انھوں نے نہ صرف کانگریس کی کھل کر حمایت کی بلکہ لکھنؤ میں کانگریس مخالف جلسوں کو ناکام بنانے کے لیے اودھ پنچ کو پوری قوت سے استعمال کیا۔ اس طرح مسلمانوں کے اخبارات میں اودھ پنچ واحد اخبار تھا جس نے کانگریس کی پشت پناہی کی۔ ۳۰ دسمبر ۱۸۹۹ء کو لکھنؤ میں کانگریس نے جلسے کے انعقاد کا اعلان کیا۔ کانگریس کے مخالف مسلمانوں نے اسے ناکام بنانے کے لیے اپنے ایک الگ جلسے کا منصوبہ بنایا۔ اس کے اشتہار چھاپے گئے۔

اشتہار میں ایک جملہ یہ تھا کہ "اس جلسے میں مع اعزاواحباب کے شرکت فرمائیں اور گورنمنٹ کے خیر خواہ بنیں"۔ منشی سجاد حسین کو موقع مل گیا۔ انھوں نے "انڈے بچے والی چیل چلہار" کے عنوان سے ایک کالم لکھ کر جلسے کے منتظمین کا خوب مذاق اڑایا۔ کالم میں کہا گیا: بھلا یہ کیوں کر ممکن ہے کہ بی کانگریس صاحبہ لکھنؤ مرحوم میں جان تازہ پھونکیں، چہرے کی رونق بڑھانے خراماں خراماں تشریف لائیں اور بی انٹی صاحبہ چپ شاہ کی بالکی نموہی بنی، منہ میں گھنگھنیاں بھرے بیٹھی رہیں۔ اجی تو یہ کیجئے بولیں اور بیچ کھیت بولیں جیسے ار ہر کے کھیت میں پہندیت بٹیر، بلکہ گلا پھاڑ کے غل مچا کے، سارا شہر سر پر اٹھا کے جس میں یہاں سے لندن تک خبر ہو جائے کہ لکھنؤ میں بھی کچھ انٹی بھائی ہیں۔(۱۰)"اعزاواحباب" کی جلسے میں شرکت کی دعوت پر طنز کرتے ہوئے لکھا کہ: جب سارا گھریوں شریک ہو گا تو اس دن ضرورت کا سامان بھی ہمراہ ہو گا خواصیں، پیش خدمتیں، شیر خوار جس کے ابھی ٹیکا لگا ہو گا اور دانہ ابھرنے یا دانت نکلنے کی وجہ سے چڑچڑا ہو گا پھر اس کا گہوارہ، پالنا، جھنجھنا، چسنی، انا، چھوچھو مع برادر رضاعی اس کے علاوہ بکری کا بچہ، چند خرگوش اور چینی چوہے، طوطے کا پنجرا جو خاص اس مصلحت سے آئے گا کہ بولنے والوں کی بولیاں یاد کرے۔ باورچی خانے کا بگلہ، انا کے صاحب زادے نطفہ نا تحقیق کا پالا ہوا۔ لینڈی کتے کا پلہ۔ چھوٹی صاحب زادی کا گلہری کا بچہ، بی گربہ خانم مسماۃ پس، کبوتروں کا کابک، مرغی کا ٹاپہ، بٹیروں کا تھیلا، بیگم صاحبہ کا پان دان یعنی سب کچھ دان، آفتابہ، آئینہ، اگال دان، طشت، تسلہ، لوٹا، ڈھولک، پایاں، منجیرے، بچھونے، گاؤ، بچے کے پوتڑے، پہالچے، لحاف، توشک، سلامتی سے سب ہی ہوا چاہئیں۔ پس معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا کیا سامان کیا گیا ہے اور ہاں بڑی بات تو رہی جاتی ہے یعنی ان سب کا کرایہ کون ادا کرے گا؟(۱۱) چکبست نے منشی سجاد حسین کے کانگریسی کارکن بننے پر لکھا کہ:

> انڈین نیشنل کانگریس چوں کہ قومی اتحاد کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی لہٰذا یہ بھی اس پولیٹیکل تحریک کے دل و جان سے مددگار ہو گئے تھے۔ اس صوبے میں منشی سجاد حسین کانگریس کے رکن تھے اور باوجود بہت سے انقلابات کے جن کے دھچکے سے اکثر قدم ڈگمگا گئے، منشی صاحب موصوف آخر دم تک اپنی وضع پر قائم رہے۔(۱۲)

اس قسم کی تلخ، ترش اور طنزیہ تحریروں میں بھی در پردہ اشارہ سرسید کی مصلحانہ کوششوں کی جانب ہوتا تھا اور مقصد ان کی مذمت ہی ہوتی تھی۔ مثلاً: شیک ہینڈ کرتا ہوں میں اس ریفارمر سے دنیاوی ترقی حاصل کرنے کی غرض سے، عہد کرتا ہوں کی تجاوز نہ کروں گا ایک قدم بھی اس راستے جو راستہ میرا ریفارمر مجھے بتلائے (چاہے وہ جہنم کا راستہ ہو) نہ واسطہ رکھوں گا دین اور ایمان اور کل مذہبی خیالات سے کسی طرح۔ مقدم سمجھوں گا خوشنودی یورپ والوں کی، خدا کی خوشنودی پر، تعمیل کروں گا ان کے احکام کی، احکام الٰہی کو چھوڑ کر، نہ فرق کروں گا حلال و حرام میں، قولاً ہو یا فعلاً۔ نہ گردپھٹکوں گا ان پرانے ڈھکوسلوں کے جن کو فرض، واجب یا سنت مستحب کہتے ہیں۔۔۔ جھٹلاؤں گا حدیثوں کو۔۔۔ باطل سمجھوں گا اس کلام کو جس کو نادان اللہ کا کلام

سمجھتے ہیں۔ حقیر سمجھوں گا ان لوگوں کو جو پابند ہوں گے مذہب کے۔۔۔ پلٹا دوں گا قرآن حدیث کے معنی کو۔۔۔ موتوں گا سید ھا کھڑے ہو کر اور پاک سمجھوں گا ان چھینٹوں کو جو زمین سے اڑ کر منھ پر پڑیں۔ دریغ نہ کروں گا بنیاد اسلام کے کھدوانے میں چاہے مسجد ہو۔ منھ چوموں گا کتوں کا طاہر جان کر۔۔۔ شراب پیوں گا رمضان کے مہینے میں فرض کر کے۔ کلمہ پڑھوں گا اہل یورپ کا کلمہ اسلام کے بدلے۔ گیند یا کرکٹ کھیلوں گا نماز کے بدلے۔ لندن شریف کی زیارت کروں گا حج کے بدلے۔ تبرک سمجھوں گا اس کھانے کو جو جھوٹا ہو کسی انگریز کا۔ اے میرے ریفارمر! اگر لڑکھڑائیں میرے قدم ان راہوں پر چلتے ہوئے تو انجام میرا ہو ساتھ پرانی روشنی والوں کے اور نہ نصیب ہو مجھ کو اس پاک چیز کا جو بکسوں میں بند ہو کر ولایت سے آتی ہیں۔(۱۳)

وہ اودھ پنچ کے صفحات میں "لوکل" اور "موافقت زمانہ" کے عنوان سے سیاسی اور سماجی معاملات پر بڑے دلچسپ طنزیہ انداز سے بحث کرتے تھے۔ سیاسی زندگی میں وہ کانگریس کے ہمنوا اور سر سید احمد خاں کی تحریک کے مخالف تھے۔ اودھ پنچ کو انھوں نے اپنے سیاسی مسلک کی ترویج و اشاعت کے لیے وقف کر لیا تھا۔ استذال اور پھکڑ پن اور طعن و تشنیع کی اس روش سے قطع نظر مسائل حاضرہ پر سجاد حسین کی بحث کا ظریفانہ انداز ایک تاریخی حیثیت کا حامل ہے اور اس کا اندازہ ان کی تحریر کے ان چند نمونوں سے بہ آسانی ہو سکتا ہے: "بھلا یہ کیونکر ممکن ہے بی کانگریس صاحبہ لکھنؤ مرحوم میں جانِ تازہ بھونکنے، چہرے کی رونق بڑھانے خراماں خراماں تشریف لائیں اور بی اینٹی صاحبہ چپ شاہ کی بالکی بنی منھ میں گھنگھنیاں بھرے بیٹھی رہیں۔ جی تو یہ کیجئے۔ بولیں اور بیچ کھیت بولیں۔ اس طرح بولیں جیسے ارہر کے کھیت میں پھندیت بٹیر۔ بلکہ گلا پھاڑ کے، غل مچا کے، سارا شہر سر پر اُٹھا کے جس میں یہاں سے لندن تک تو خبر ہو جائے کہ لکھنؤ میں کچھ اینٹی بھائی ہیں چنانچہ یوں تو عرصے سے سڑ پٹر جلسے ہوتے تھے اور بعض حضرات اپنے نزدیک حق ادا کرنے یا مستحق بننے کی کوشش کرتے تھے مگر جب دیکھا کہ کانگریس کا اجلاس سر ہی آپہنچا، ادھر لیفٹیننٹ گورنر بہادر بھی شہر میں تشریف فرمائیں۔ ادھر حضور وائسرائے بھی عنقریب دربار فرمانے والے ہیں۔ چھتری سرکس بھی تماشے کر رہا ہے۔ الفریڈ تھیٹیریکل کمپنی بھی آتی ہے۔ ان حضرات کو بھی مثل عارضہ متعدی ہیچ پچی چھوٹی بے چینی بڑھی۔ مادی ہیجان میں آ ہی گیا اور ایک بار آنکھ بند کر کے کچکچا کے عظیم الشان جلسے "اینٹی کانگریس" کا اشتہار دے ہی دیا"۔ وغیرہ وغیرہ از "انڈے بچے والی چل چلہار" "مولوی گلیڈ اسٹون صاحب طول عمرہ"۔ دعائے خیر۔ نصیب شاباد۔ ایسے زمانے میں جب کہ چاروں طرف سے ہوائے شر و فساد ہر ملک سے سموم بعض و عناد کے جھونکے آرہے ہیں۔ تمہارے حق میں اس سے بڑھ کر مناسب دنیا میں شاید ہی کوئی دعا ہو گی۔

تم پولیٹیکل دستر خوان کے اچھے خانساماں اور ہوشیار خدمت گار ہو۔ پکاپکایا کھانا، تیار ہانڈی تم خوبی سے چن سکتے ہو۔ مگر ہانڈی پکانے اور چیز تیار کرنے کے نام سے خاک دھول بکائن کے پھول۔ تم جانتے ہو کہ طرح طرح کے کھانوں کے واسطے کون کون مصالحہ کیوں کر پیسا اور ترکیب دیا جاتا ہے۔ کبابوں میں کس چیز سے کلاوٹ آتی ہے۔ پلاؤ کو دم کیسے دیتے ہیں۔ فارن پالیسی کا مزعفر اور متنجن کیوں کر خوشگوار چاشنی پیدا کرتا ہے۔ کہتے ہیں جو کوئی چھچھوندر مار ڈالتا ہے اس کے ہاتھ کی لذت جاتی رہتی ہے۔ شاید ایسا ہی ہوا ہو۔ مگر اب یہ ضرورت بے شک معلوم ہوتی ہے کہ پہلے اچھا باورچی اور رکابدار سب کچھ تیار کرلے پھر دستر خوان لگانے اور خاصہ چننے کو تم بلالئے جاؤ۔ تم ہرگز اس لائق نہیں کہ دونوں کام تمہارے سپرد ہوں۔ یہ خدمت کچھ کنسرویٹو ہی خوب جانتے ہیں۔"۱۴

یوں تو ہنگامی مسائل اور سیاسی الجھنوں کے بارے میں اظہار خیال کے ضمن میں سجاد حسین کے علاوہ اور بہت سے معاونین اودھ پنچ کا نام لیا جاسکتا ہے، تاہم اس سلسلے میں منشی جوالا پرشاد برق کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ کہ انھوں نے اپنے مضامین میں ہنگامی مسائل کے مختلف پہلوؤں کو خاص طور پر نمایاں کرکے پیش کیا۔ صحافت میں ان کا طریق کار اس ایک نمونے سے واضح ہوسکتا ہے: "یکایک بلائے آسمانی پھٹ پڑی، ایک اینٹ کی خاطر مسجد ڈھائی۔ پیار ابل ہاتھ سے بے ہاتھ ہوگیا۔۔۔ کلیجہ دھک سے ہوا۔ کیسی کچھ دل پر چوٹ لگی۔ رپن کا زمانہ ہم تو خوشیاں مناتے، بغلیں بجاتے مست پڑے ہوئے تھے۔ آخر کو پالا ہمارے ہی ہاتھ رہے گا۔ مگر یکایک پردہ غفلت جو آنکھوں سے اٹھا تو بھور ہوگیا۔ ان اینگلو انڈین سے خدا سمجھے۔ عین موسم بہار میں ہمارا آشیانہ نوچ گھسوٹ کے پھینک دیا۔ کمبخت "کنکارڈٹ" نے منحوس شکل دکھائی۔ سخن سازوں نے ملکہ معظمہ کے پروکلیمیش کے الفاظ کو نئے نئے معنی پہنائے۔ پیارے رپن کو مجبور کیا۔ وہ بھی برے پھنسے۔ کچھ دھرتے بن نہ پڑا۔ ممبران کونسل کے نقار خانے میں طوطی کی آواز کسی نے نہ سنی۔ آخرش وہ بھی انہی کے ساتھ سر ہلانے لگے۔

جا کر قفس میں عاشق صیاد ہوگیا

بلبل کا حال قابل فریاد ہوگیا

البرٹ بل (۱۵)

اودھ پنچ کے بارے میں پروفیسر رشید احمد صدیقی رقمطراز ہیں: "اودھ پنچ معاشرت میں قدامت اور سیاست میں جدیدیت کا قائل تھا۔ اودھ پنچ نے اپنی پالیسی کے ذریعے ملک و قوم کی خدمات ایسے وقت میں سرانجام دیں جب ہندوستان کے حریت پسند عوام اپنی آزادی اور تہذیب کی حفاظت کے لئے جدوجہد کررہے تھے۔ آسمان سیاست پر بے چینی اور

انتشار کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اودھ پنچ نے ایسے ہی وقت میں ملک کے عصری تقاضوں کو پورا کیا۔ اس کے مدیر منشی سجاد حسین نے ملک کی آزادی میں حصہ لیا۔ اور ملک و قوم کی خدمت و تحفظ کے لیے متعدد سیاسی مضامین لکھے۔ منشی سجاد حسین بذات خود کانگرسی ذہن رکھتے تھے۔ اور اس دور میں جنم لے رہے سیاسی مسائل کو پیش کرنے کے لئے انڈین نیشنل کانگرس کی حمایت میں کچھ نہ کچھ سپرد قلم کرتے رہتے تھے۔"(۱۶)وزیر آغا اودھ پنچ کے عہد کے سیاسی تناظر کو پیش نظر رکھتے ہوئے رقم طراز ہیں:۔ اودھ پنچ اپنے زمانے کی انقلابی تبدیلیوں کے خلاف رد عمل کے طور پر نمودار ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ ے تھا کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے زندگی سے شگفتگی اور آسائش چھین لی تھی اور اس کے چہرے پر سنجیدگی کی تیوریاں پیدا کر دی تھیں۔ سیاسی، سماجی، اور ادبی ماحول میں سنجیدگی اور انہماک کا دور دورہ تھا۔ انتہائی پستی اپنے جوبن پر تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کی گویا ہر شخص اپنے طوفانی بہاؤ کے ساتھ ایک تنکے کی طرح بہتا چلا جائے گا۔ ایسے میں اودھ پنچ نے فرد کو روک کر اس کے ہاتھ میں آئینہ تھما دیا۔ اور اس سے درخواست کی کہ وہ ایک لمحہ کے لئے اس میں اپنی صورت دیکھنے کی تکلیف گوارا کرے۔ جب آئینے میں ایک انتہائی سنجیدہ چہرہ مضحکہ خیز حرکات کرتا نظر آیا تو فرد کو ندامت محسوس ہوئی اور اس کے جوش و انہماک میں اعتدال پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اودھ پنچ نے قوم کے طوفانی دریا کو کناروں سے چھلکنے اور یوں تباہی و بربادی پھیلانے سے بروقت روکنے کی انتہائی کوشش کی اور اس دریا سے طنز و ظرافت کی بے شمار چھوٹی چھوٹی نہریں نکال کر اس کی طغیانی میں دھیماپن پیدا کرنے کا قابل رشک کام سرانجام دیا۔"(۱۷)مذکورہ بالا اقتباس میں اودھ پنچ کے عصری مسائل کا پورا تناظر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ وزیر آغا مزید لکھتے ہیں:۔

> "اودھ پنچ کے ذریعہ تاریخی کام سجاد حسین کی مساعی کا رہین منت ہے۔ سجاد حسین خود بلا کے لکھنے والے تھے اور آج بھی حاجی بغلول، طرحدار لونڈی، اور احمق الدین کے مصنف کی حیثیت سے مقبول خاص و عام ہیں۔ ان تصانیف کے علاوہ انہوں نے جو خط ہندوستانی رؤسا کے نام لکھے وہ بھی انتہائی دلچسپ اور طنزیہ انداز میں لکھے ہیں۔ علاوہ ازیں اودھ پنچ میں "لوکل" اور "موافقت زمانہ" کے زیر عنوان ان کے جو مضامین چھپے تھے ان میں ملک کے سیاسی، موسمی اور سماجی حالات پر وہ بڑی دلیری سے طنز کرتے تھے۔"(۱۸)

سجاد حسین نے متعدد سیاسی اور سماجی مضامین سپرد قلم کئے نیز ان مضامین میں اپنے عہد کے سیاسی مسائل سے بھی بحث کی۔ سجاد حسین کے مضامین "انڈے بچے والی چیل چلہاڑ" عوام و خواص میں از حد مقبول ہوا۔ اس کے علاوہ کھلے خط سربستہ مضامین نیچر کا مارشل لاء، مٹی خراب خلق میں مہر و وفا کی ہے، ہڈیوں پر میری لڑتے ہیں، جھنجھٹ کا یہ مزہ ہے، کہ ہوں وہ بھی

بے قرار، پروفیسر اودھ پنچ کے پولیٹیکل اقلیدس، بے مارکی توبہ، ٹیکس کی دم، ابر کامل اور سرکار انگلشیہ، منھ لگائے ڈومنی گائے تال بے تال، یہ مبارک جنگ کا چندہ ہے، پولیٹیکل باغ و بہار یعنی قصہ چہار درویش، قانون اور اس کا دم ترمیم وغیرہ مضامین خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ سجاد حسین کانگرس کے حامی تھے اور آخر تک کانگرس کے علمبردار رہے۔ اس لئے انہوں نے طنز و مزاح کے پیرائے میں برطانوی حکومت کی کوتاہیوں اور بدعنوانیوں کا پردہ ایسے دور میں فاش کیا جبکہ سیاسی رہنماؤں کے لئے لب کشائی بھی مشکل تھی۔ انہوں نے انگریزوں کی عمل داری کی ان پالیسیوں کے خلاف لکھا جو عوام کے منافی تھیں۔ یہ مضامین طنز و مزاح کے پردے میں پیش کئے گئے تھے اس لئے قانون کی گرفت میں بھی نہیں آسکے اور استہزاء کا پہلو بھی برقرار رہا۔ ان مضامین میں پہلی بار سیاست کو طنز و مزاح کا موضوع بنا کر پیش کیا گیا۔ منشی سجاد حسین کا مضمون " انڈے بچے والی چیل چلہاڑ" اس دور کا تخلیق کیا ہوا ہے جب انڈین نیشنل کانگریس میں زندگی کے آثار پائے جا رہے تھے۔ اور کانگرس کی مخالفت میں " انٹی کانگریس" کے نام سے ایک طبقہ پیدا ہو چکا تھا۔ لہٰذا سجاد حسین " انٹی کانگریس" کی مخالفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> " بھلا یہ کیونکر ممکن ہے بی کانگریس صاحبہ لکھنؤ مرحوم میں جان تازہ پھونکنے، چہرے کی رونق بڑھانے خراماں خراماں تشریف لائیں اور بی اینٹی صاحبہ چپ شاہ کی بالکی نموہی منھ میں گھنگھنیاں بھرے بیٹھی رہیں۔ اجی توبی کیجئے بولیں اور بیچ بولیں کھیت بولیں۔"(۱۹)

سجاد حسین طنز و مزاح کے پیرائے میں سب کچھ کہہ جاتے ہیں اور خیالات کا اظہار بھرپور انداز میں کر دیتے ہیں۔ سجاد حسین کے خطوط بھی سیاسی اعتبار سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ خطوط انہوں نے بحیثیت مدیر اودھ پنچ مختلف اوقات میں مختلف افسران بالا کو تحریر کئے تھے، خط کا ایک حصہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے:۔ " صاحب من! جب کسی قسم کی کاروائی کا مصمم ارادہ کر لیا جائے اور کچھ لحاظ نہ رہے کہ ملک کے مناسب حال ہے یا نہیں تو ظاہر ہے کہ موقع افہام و تفہیم، گنجائش، پند و وعظ اس طرح غائب ہے جیسے بر ہمایا ہندوستان مگر دنیا کا کوئی حل بے نتیجہ رہ نہیں سکتا۔ آج نہیں کل، یہاں نہیں وہاں، ضرور بالضرور، کچھ نہ کچھ اثر ضرور کرتا ہے۔ ممکن کیا یقین سہی کہ تم نے آہ و نالے کی طرف سے کانوں میں انگلیاں بڑے زور سے ٹھونس لیں، حالت خستہ کی طرف آنکھ پھیر لی۔"(۲۰) منشی سجاد حسین اپنے خطوط میں طنز کا پہلو پیدا کر لیتے ہیں جو یقیناً طنز سے خالی نہیں ہوتا۔ انہوں نے جو خطوط انگریز افسروں کو لکھے ہیں، ان میں بھی تیر و نشتر سے کام لیکر اپنی بات کہی ہے، ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

> " لارڈ رنڈالف چرچل جو بد قسمتی ہندوستان سے وزیر ہند ہوئے ہیں، بجائے خود تیز آدمی ہیں مگر کمسنی اور درشت گوئی اور بدزبانی مانع ترقی ہے۔ معاملات ہندوستان تمہاری خاص

توجہ کے محتاج ہیں اور میری رائے میں تم بھی اس کی یہ سمجھ لو کہ آزادگی اور شوریدگی قوم
کی دست بردسے اعزاز قیصری سے محفوظ رکھنے کا صندوقچہ ہندوستان ہی ہے۔"(۲۱)

منشی سجاد حسین کے اس طرح کے متعدد خطوط ملتے ہیں جن میں طنز و مزاح کے پیرایۂ بیان میں حکام بالا کو خواب غفلت سے بیدار کیا ہے یا پھر ان کے دانستہ طور پر اپنائے گئے بے جا رویے کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔۱۸ مئی ۱۸۸٦ کو جب لوکل سلف گورنمنٹ کا بل کونسل کے سامنے پیش ہوا تو سرسید نے اس پر خاصی طویل اور اسی قدر اہم تقریر کی انھوں نے اس بل کی صرف تائید ہی نہیں کی بلکہ لوکل باڈیز کو وسیع تر اختیارات دینے پر زور دیا۔ اسی تقریر میں سرسید نے طریقہ انتخاب پر بھی اظہار خیال کیا تھا۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی پنڈت جوالا پرشاد برق ہیں۔ انہوں نے طنز و مزاح اور تحریف کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے جوالا پرشاد برق کو اُردو ادب کا ہوریس اور چاسر کہا ہے۔ پنڈت جوالا پرشاد برق کے بیشتر تراجم ملتے ہیں۔ انہوں نے چند ایسے مضامین بھی لکھے ہیں جن میں سیاسی اور ملکی مسائل پر سیر حاصل بحث مل جاتی ہے۔ ان کا ایک مضمون "البرٹ بل" بطور خاص قابل توجہ ہے۔ اس مضمون کا ایک فکاہیہ نمونہ ذیل میں پیش کیا جارہا ہے۔ "۔۔۔اختیار ملا مگر برائے نام مگر ہمت نہ ہارنا چاہیے۔ پارلیمنٹ میں واویلا ضرور ہو۔ ہندیو، دشمنو سے سبق لو، کچھ کھو چکے اب تو سیکھو۔ دیکھو حقوق کے واسطے لڑنا جھگڑنا ہی کام آتا ہے۔ جس کی لاٹھی اُس کی بھینس۔ اگر تم بھی گورنمنٹ ہوس پر چڑھ دوڑنے کی فکر کرتے، فتنہ انگیزی پر کمر باندھتے، تلواریں سنبھالتے تو کچھ مل ہی رہتا مگر شر ہمارا شیوہ نہیں ہم تو سچے خیر خواہ سرکار ہیں۔ مگر ہائے رے سال بھر کی محنت کھاری کنویں میں ڈوب گئی، کیا کیا خیالی قلعے بنائے گئے مگر کنسکاڈٹ کے ایک ہی گولے نے ان کا صفایا کر دیا۔"(۲۲) طنز و مزاح نگاروں میں نواب سید محمود آزاد کا نام بڑی خصوصیت کا حامل ہے۔ وہ اپنے تلخ تجربات کو شوخی و ظرافت کے پیرائے میں پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے خطوط میں مغربی تہذیب اور ثقافت کا مضحکہ اڑایا ہے۔ انہوں نے تحریفات کے انداز میں ایک "ڈکشنری" بھی تحریر کی تھی جس میں انہوں نے ظریفانہ پیرائے میں بعض تلمیحات کے معنی بتائے ہیں۔ چند اقتباس ذیل میں نقل کئے جارہے ہیں۔ "پالیسی (حکمت عملی)۔۔۔ ممبران پارلیمنٹ کے آپس کا ناز و نیاز کمزور کو دبانا زبردست سے ڈرنا۔۔۔مار کے آگے بھاگتے کے پیچھے جانا۔ کسی کے جلتے ہوئے گھر سے تاپنا، پارٹی فیلنگ (پاسداری جماعت) مرغ بے ہنگام کی طرح چلانا۔ غول بیابانی کا قائم مقام بن کر اپنے ہم قسموں کو راہ راست سے بہکانا، بے ہودہ شکایت، ناجائز تہمت، وزارت کے کھونے کا صدمہ، جگر گداز، کوئی سُنے نہ سُنے اپنی کہے جانا۔۔۔""پارلیمنٹ (جلسہ مدبران ملکی) مدبروں کا آشیانہ، کسی ملک کے قابل لوگوں کی قوت گویائی کا تماشہ دکھانے کا تھیٹر، باہمی نفاق اور ذاتی رشک وحسد کا تنور، انصاف آموزی کا وہ اسکول جہاں روسیوں کے ظلم ناحق کے انسداد کی کوئی عمدہ سبیل نہیں۔""یورپین کنسرٹ (یورپ کے سلاطین کا

اتفاق) تمدن کی آراستہ فوج، دنیا کی آزادی کا ضامن، مشرقی مسلوں کے حل کرنے کی کھرل، کمزور کو زور آور اور زور آور کو کمزور بنانے والی ولایتی کل، کمزور سلطنتوں کے لئے بٹوارے کا نیا قانون۔۔۔"(۲۳)

سید محمود آزاد کے مضامین میں " روئداد، اجلاس جنجال کونسل، اور گرما گرم تار کی خبریں ہندوستان کے مسائل پر لکھی گئی ہیں۔ اس دور کے اخبارات میں الپنچ بھی قابل ذکر ہے۔ یہ اخبار پٹنہ سے جاری ہوا تھا۔ اس اخبار نے اس دور کے عصری سیاسی اور سماجی مسائل اور ہنگاموں سے بحث کی ہے۔ الپنچ میں سوال از آسمان و جواب از ریسمان " کے عنوان کے تحت انگریزی تہذیب کی مخالفت، غلامی کا احساس اور ہندوستانیوں کی زبوں حالی کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا ہے۔ چند اقتباسات ذیل میں پیش کئے جا رہے ہیں:

"سوال: ہندوستانی دن میں کتنی دفعہ کھاتے ہیں۔ اور انگریز دن میں کتنی دفعہ اور کون کون وقت کھاتے ہیں؟

جواب: امیر ہندوستانی دن میں ایک دفعہ کھاتے ہیں کیونکہ اس سے زیادہ بیچاروں کو میسر ہی نہیں۔ اور غریب بیچارے کبھی دو دن اور کبھی تین دن میں ایک مرتبہ کھاتے ہیں۔ انگریز دن میں پانچ مرتبہ۔۔۔

سوال: انگریزی کھانوں میں پڈنگ بنانے کا کیا طریقہ ہے؟

جواب: پڈنگ بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ ہندوستان سے گیہوں روپے من کے حساب سے خرید کر انگلینڈ چلان ہوتا ہے وہاں اس کا مائدہ بنتا ہے اور وہاں سے روپے سیر کے حساب یہاں روانہ کیا جاتا ہے۔ اس مائدہ میں گھی، دودھ اور چینی ملا آگ پر چڑھا دیتے ہیں۔ جب تیار ہو جاتا ہے تو اس میں سور کی چربی بجائے گلاب اور کیوڑے کے ڈالتے ہیں"۔(۲۴)

ایک اقتباس اور ملاحظہ کیجئے۔

"سوال: خون کے مجرم کو قانون کی کس دفعہ کی رو سے سزا دی جائے گی؟

جواب: ہندوستانی کو سزا دینے کے لئے کسی دفعہ کی ضرورت نہیں، جب چاہے قید کیجئے اور جب چاہے پھانسی دیجئے۔ مگر کوئی انگلش نژاد وفادار رعیت دس ہندوستانی بھی مار ڈالے تو کچھ پرواہ نہیں۔

سوال: سزائے حبس دوام بعبور (کذا) دریائے شور کن مجرموں کے لئے مقرر کی گئی ہے؟

جواب: پہلے تو یہ سزا صرف دو تین مجرموں لے لئے تھی مگر جرم اس میں اور بڑھائے گئے ہیں۔ ایک تو کسی انگریز سے مقابلے کے ساتھ باتیں کرنی، دوسرے گورنمنٹ کی کسی بات پر نکتہ چینی کرنی۔"(۲۵)

زیر نظر چند اقتباسات تحریر کئے گئے جو انگریزوں اور حاکموں کے سفاکانہ رویے کے خلاف تھے۔ اودھ پنچ کانگریس کا ہمنوا تھا۔ اور کانگریس اس وقت ہندوستان کی واحد سیاسی جماعت تھی جو اہل ہندوستان کے سیاسی حقوق کی تحفظ کی خاطر وجود میں آئی تھی۔ کانگریس کی چونکہ حکومت سے اکثر ٹھنی رہتی تھی۔ اس لیے اودھ پنچ اپنی ہر اشاعت میں کانگریس میں کی ہمنوائی کرتے ہوئے حکومت کے خوب لتے لیتا اور حکومت کے قول و فعل کے تضاد کو تضحیک کا نشانہ بناتا۔ اس قسم کا کوئی لطیفہ واقعہ 'چٹکلہ' فقرہ یا شعر جب اودھ پنچ میں نکل جاتا تو زبان زد عام ہو جاتا۔ اودھ پنچ نے سرسید تحریک کی بھی اس لیے مخالفت کی تھی کہ وہ انگریزوں کی ہمنوا تھی۔ سرسید احمد خان ہر شعبے میں مسلمانوں کی تہذیب و ترقی کے خواہاں تھے اور وہ مسلمانوں کو ہمیشہ زمانے کا ساتھ دینے کی تلقین کرتے تھے۔ سرسید احمد خان نے اس مقصد کے لیے "موافقت زمانہ" کی اصطلاح استعمال کی۔ اودھ پنچ نے اپنی ایک اشاعت میں "تہذیب اور موافقت زمانہ" کے عنوان سے سرسید احمد خان کا یوں مضحکہ اڑایا: " زمانہ کی موافقت یوں کرو کہ اگر کوئی کہہ دے کہ کوا کان لیے جاتا ہے تو کوے کے پیچھے دوڑو اور کان کو نہ ٹٹولو۔ یہاں تک کے کوے کو گرفتار کرو۔ اس کی تلاشی لو۔ جب کان نہ ملے 'تب اور جگہ ڈھونڈو' جب کہیں پتہ نہ لگے تب اپنے کان کو ٹٹولو اور پھر اشتہار جاری کرو کہ تجربے سے معلوم ہوا کہ کان کے واسطے کوے کے پیچھے دوڑنا فضول ہے۔ پہلے اپنے کان ٹٹول لو' بعد اس کے دوڑو اس پر تمام دنیا میں تعریف ہو کہ سبحان اللہ کیا حکیمانہ خیالات ہیں۔ دیکھئے کیا اچھا تجربہ ہاتھ آیا۔"(۲۶) اس تحریر میں سرسید احمد خان کے خیالات سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے چٹکیوں میں اڑانے کا انداز ملتا ہے۔ اودھ پنچ کی ظرافت کا یہی اندازہ تھا بس اس کا رخ ظرافت کبھی معاونین علی گڑھ کی طرف مڑ جاتا اور کبھی برطانوی سامراج کی بوالعجبیوں کی طرف۔ اور حضرت "پنچ" اسی طرح دلوں کو چھیدتے، گدگدی کرتے کم و بیش اٹھاون برس تک لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتے رہے۔ اودھ پنچ ہندو مسلم اتحاد کا زبردست حامی تھا اور دونوں اقوام کے نزاعی مسئلوں کو طنز و مزاح کا نشانہ بنا کر ان کی تلخی کو کم کرنے کی کوشش کرتا تھا قومی یکجہتی پیدا کرنے کے سلسلے میں اودھ پنچ کی یہ بڑی یادگار کوششیں تھیں اس سلسلے میں ایک مثال دیکھیں۔: اے باد صبا ایں ہمہ آوردہ تست" کے عنوان سے گاؤ کشی" کے سلسلے میں ہندو اور مسلمانوں میں (خاص کر " گیا" میں) جو جوتی پیزار اور کشت و خون ہوا تھا اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اودھ پنچ لکھتا ہے کہ:

"حکومت نے تو اس کی ذمہ داری گئورا کھشی سبھا پر ڈالی ہے اور ولایت کے اخباروں نے کانگرس کو اس کا ذمہ دار قرار دیا ہے مگر اصل وجہ۔۔۔اجی یہ تو انگریزی طرز حکومت

> کے کھلے کھلے نتائج ہیں۔ یہ گائے اور محرم اور دسہرے اور پارس ناتھ کی رتھ وغیرہ حیلے ہیں جن کے پیرائے میں بخارات نکلتے ہیں۔ بخارات پیدا ہونے کے اسباب پر نظر کرنی چاہیے۔"(۲۷)

بظاہر اودھ پنچ مسخرہ اور منسوڑ دکھائی دیتا تھا لیکن یہ اپنے اصل فرائض سے کبھی بھی غافل نہیں ہوا۔ اہل ہندوستان کی سیاسی بیداری میں جہاں اور بہت سے عوامل کار فرما تھے وہاں اودھ پنچ کی یہ خدمات بھی فراموش نہیں کی جاسکتیں کہ اس نے ہندوستان کے باشندوں کو سیاسی طور پر باشعور بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اہم سیاسی موقعوں پر اودھ پنچ عوام کا ترجمان بن جاتا اور سیاسی لیڈروں کی دو عملی کا پول کھول کر رکھ دیتا تھا۔ "مولانا پنچ کی نوٹ بک" میں "گاندھی کے فاقے پہ موقوف تھا ہنگامہ قوم" کے عنوان سے اودھ پنچ لکھتا ہے:

> "لیجئے صاحب جو ہم نے کہا تھا وہی ہوا۔ قانون شکنی کے پہلے التواء تو انتہا گیر لیڈروں نے صرف ناک بھوں چڑھائی تھی اور اب جو دوسری مرتبہ التواء کا اعلان ہوا تو؟
> چڑھ گئیں آستینیں' تن گئے ڈگ اور گھونسے' ان تناتنی کا نتیجہ ابھی لوگوں کو معلوم نہیں (۲۸)"

سیاسی شعور کو اجاگر کرنے اور عوام میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کے علاوہ خالصتاً ادبی نقطہ نظر سے بھی اودھ پنچ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ادب اور صحافت میں طنز و مزاح کے فروغ کے علاوہ اردو زبان کی خدمت میں بھی اودھ پنچ پیش پیش رہا۔

سیاسی اعتبار سے اودھ پنچ نے علی گڑھ تحریک کی زبردست مخالفت کی لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ انگریز مخالفت کا فریضہ انجام دینے سے بھی غافل نہیں رہا۔ غدر کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں پر جن سے انگریزوں نے حکومت چھینی تھی۔ بڑا نازک وقت تھا۔ انگریز ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کو شک وشبے کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اودھ پنچ نے اپنی تمام تر صلاحیتیں مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لیے صرف کر دیں۔ لکھنؤ میں سیاسی شعور بیدار کرنے میں اودھ پنچ کا بڑا حصہ ہے۔ اودھ پنچ ایک طرف کانگرس کا حامی تھا تو دوسری طرف معاشرتی معاملات میں قدامت پرست تھا۔ اگرچہ نئی تہذیب کی روشنی کو اودھ پنچ نے ضرور قبول کیا۔ لیکن انگریزوں کی اندھا دھند تقلید کی ہمیشہ مذمت کی۔ اپنے سیاسی مضامین میں انھوں نے انگریزی گورنمنٹ اور حکام کی چالاکیوں نوابین، راجاؤں اور روسا کی نااہلی اور غفلت اور عام ہندوستانیوں کی خامیوں اور بدعنوانیوں کو ہدف طنز بنایا ہے۔ "کھلا خط سربستہ مضامین" عنوان کے تحت مہاراجہ کشمیر، نواب ریاست رام پور،

شہزادی سلطان جہاں بیگم والیۂ بھوپال، نظام حیدرآباد دکن لارڈ ڈفرن وائسرائے ہند، گلیڈ اسٹون وزیراعظم انگلستان اور قیصر ہند ملکہ وکٹوریہ کو ارسطو کے فرضی نام سے خطوط لکھ کر طنز و ظرافت کے پردے میں ان کی خوب خبر لی ہے۔ ایک خط میں نظام حیدر آباد کو ان کے مصاحبین پر چوٹ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔ "۔۔۔۔جب گدھوں کی کافی تعداد بن چکی اور بہت سا تخم باقی رہا تو ملائکہ نے خداوند تعالیٰ کے حضور میں عرض کیا کہ اس کو کیا کرنا چاہیے۔ حکم ہوا ان کو صورتِ انسانی میں لاکر اور کسی بلند مقام پر کھڑے ہو کر زمین میں برسا دو۔ چنانچہ چار مینار سے ان حضرات کی بارش ہوئی غالباً انھیں میں سے دو چار تمہاری مصاحبت میں آ گئے ہیں۔۔۔۔

تم کو یہ بات ملحوظ خاطر رکھنی چاہیے کہ رئیس ریاست کے واسطے بنا ہے نہ عیش و آرام لہو و لعب سے واسطے۔ کسی سے ناچاقی عداوت شکر رنجی کچھ ہی کیوں نہ ہو مگر کوئی وجہ نہیں انتظام ریاست کی باگ چھوڑ دی جائے۔ ملک کی رونق رعایا کے دل سے فرحت اس طرح سے فرار ہو جیسے تمہارے دیوان کے دماغ سے تمہاری عظمت۔ تم خفا ہو خوش ہو، لڑو جھگڑو، کو چاہو کرو۔ مگر ملک کی جانب سے غفلت نہ کرو اور خداوند کے یہاں گنہگار نہ ہو۔ مردم شناسی کرو، قدر دانی میں مشق بڑھاؤ، ملک کے رنج و راحت کو اپنا رنج و راحت بناؤ، تب حق سے ادا ہو گے ورنہ پولو میں کرتب دکھانے یا گھوڑ دوڑ میں بازی جیتنے سے کچھ نہ ہو گا۔ تم رئیس ہو نہ سوار و سائیس۔ ایک خط میں بیگم بھوپال کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔ "دام بھوپالہا! غالباً اس غیر مانوس دعا پر تم مسکراؤ اور دل میں سوچو اقبالہا کا بدل بھوپالہا کیسے سو اس کی وجہ یہ ہے کہ سلامتی سے تمہاری ذات مجمع صفات میں خداوند تعالیٰ نے تمام خوبیوں جو آج کل اقبال مندی کے واسطے لازمی ہیں بدرجہ اتم کوٹ کوٹ اور ٹھونس ٹھونس کر بھری ہیں۔ تمہارے حق میں ایسی دعا تحصیل لاحاصل ہے۔۔۔ اس میں برا ماننے کی ضرورت نہیں۔ خداوند کی عنایت اوت تمہاری اور تمہارے بزرگوں کی لیاقت سے تمہاری ریاست اپنی طاقت اعلیٰ سے اچھا برتاؤ رکھا کی ہے تم نے ابھی شخصی اور ذاتی طور سے کچھ ہی کیا مگر بحیثیت ایک رئیسہ اور حاکمہ کے وہ کیا جو بڑے بڑے مردوں سے نہ ہو سکا۔ میں تم کو تہ دل سے سراہتا اور دست اشرافی سے تمہاری پیٹھ ٹھونکتا ہوں"(۳۰)مزاحمتی رویوں کے حوالے سے آزاد کی وہ ڈکشنری میں بھی خاصی شہرت کی حامل ہے جس میں آزاد نے اپنے مخصوص اسلوب میں اپنے عہد کے ملکی و معاشرتی' سماجی و تہذیبی حالات و واقعات پر روشنی ڈالی ہے ۔الفاظ کے معانی بیان کرتے ہوئے آزاد نے ملک کی سیاست و معاشرت پر بھرپور انداز میں تنقید کی ہے لیکن اردو ادب میں یہ ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ رشید احمد صدیقی اس ڈکشنری کے بارے میں لکھتے ہیں: "حقیقت یہ ہے کہ یہ ڈکشنری بجائے خود اس عہد کی صحیح اور سچی تصویر ہے اور اسی عہد کی نہیں بلکہ چونکہ یہ حقیقت اور انسانی فطرت اور معاشرت پر مشتمل ہے اس لیے آئندہ ایک نامعلوم مدت تک اس کی کارفرمائی رہے گی۔"(۳۱)چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں: **اولڈ پاپا۔**(پدر بزگوار)

"اثبات حلال زادگی کے واسطے بے نظیر دلیل بے ضرورت دنیا میں رہنے اور دنیاوی امور میں دخل دینے کو ہر وقت تیار۔ آزادی نسواں کے لیے برق آفت۔ انیسویں صدی میں مسلمانوں کی سب سے بڑی شامت۔" (۳۲)

پارلیمنٹ۔

"وہ پالی جس کا اصیل اور ٹینی دونوں لڑے۔ تمدن کے دنگل میں حکمت عملی کے مطابق وزراء کے چیٹ پٹ ہو جانے کا سہارا۔" (۳۳)

پالیسی۔

"گیڈر بھبکی' ہوائی بندوق کی آواز 'کمزور کو دبانا' زبردست سے لڑنا۔ ممبران پارلیمنٹ کا آپس میں رازو نیاز کسی کے جلے ہوئے گھر سے تاپنا۔" (۳۴)

برعظیم کی ریاستوں اور راجواڑوں کے دگرگوں حالات، ان کے سربراہوں کی بدانتظامیاں، فضول خرچیاں اور عیاشیاں (جو ان کے زوال کے اسباب میں سے تھیں) سجاد حسین کا موضوع بنتی ہیں۔ مثلاً: "نواب صاحب سے جو خدا کے ہاں سے پرونوٹوں اور تمسکوں پر دستخط کرنے کا ٹھیکہ لے آئے تھے پرونوٹ لکھا، بخیر وعافیت گھر کا راستہ لیا" اس ڈرامے میں انگریز عمال کی لوٹ کھسوٹ کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ ملکی اور غیر ملکی سیاسی مسائل، مغرب کی سماجی اقدار اور سیاسی معیاروں پر آزاد نے جابجا طنز کیے ہیں۔ خصوصاً ان کی مختلف لغات میں مغرب کی سیاست اور سیاسی خصوصیات، مفادات اور تضادات پر نہایت عمدہ طنز اور مزاحیہ تبصرے ملتے ہیں۔ ان سب کا فرداً فرداً تذکرہ باعث طوالت ہوگا۔ صرف عنوانات سے اس کی وسعت اور اور موضوعات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے: پولیسی (حکمت عملی)، انٹرسٹ (حقوق)، کورٹ شپ (عشق ازدواجی)، یورپین کنسرٹ، پارلیمنٹ، اولڈ پاپا، الیکشن زادہ، کون شینس، تھینکس، پارٹی فیلنگ، آنر، سویلیزیشن، سائنٹیفک فرنٹیر وغیرہ۔

ڈکشنری کے علاوہ اودھ پنچ میں ناولوں میں بھی سیاسی مسائل پر مزاحمت کی جاتی رہی۔ "کایا پلٹ" اس لحاظ سے ایک عجیب ناول ہے کہ اس میں ایک طرف تو مصری لوح کا موکل اور اس کے کارنامے ہیں اور دوسری طرف انگریز، مصر میں مہدی سوڈانی کی انگریزوں سے جنگ، سید احمد خاں، کانگریس، ہوائی جہاز اور نہ جانے کس کس کے تذکرے ہیں۔ لگتا ہے کہ اس ناول میں منشی سجاد حسین کو مزاح اور پلاٹ سے زیادہ سیاسی اور سماجی حالات کو مقید کرنے کی فکر تھی۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں "موکل" کوٹ پتلون پہنے مسٹر جانسن کے کمرے میں اچانک نمودار ہوتا ہے اور جانسن صاحب کی یہ حالت ہے کہ:

"اب تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ عجیب کوئی بے ڈول ہندوستانی نیمر، بے تمیز۔۔۔۔ معلوم ہوتا ہے سید صاحب کا کوئی اشکل چیلا ہے جس نے انگریزوں کی دیکھا دیکھی کوٹ پتلون تو

پہننا سیکھ لیا ہے۔ مگر آداب اور اخلاق سے ناواقف ہے غصہ اس بنا پر اور بھی زیادہ ہو گیا
کہ سید صاحب کا گروہ اس زمانے میں انٹی کانگریس ہونے کی وجہ سے کانگریس والوں کا
دشمن سمجھا جاتا تھا۔"(۳۵)

منشی سجاد حسین کی مزاح نگاری کے بارے میں مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کا مزاح اس دور کے اہم مسائل کو موضوع بناتا ہے اور سماجی تبدیلیوں کا عکاس ہے۔ مگر بات کوئی بھی ہو منشی صاحب سرسید کا نام لینا نہ بھولتے تھے۔ پارلیمنٹ کی مندرجہ ذیل تشریح ان کی طنزیہ تحریر کی عکاسی تو کرتی ہی ہے آج کے دور کی پارلیمنٹ کا جیتا جاگتا نقشہ پیش کرتی ہے:۔ "مدبروں کا آشیانہ، فصحار اور یلغار کی پرورش کا زچہ خانہ 'کسی ملک کے قابل لوگوں کی قوت گویائی کے تماشہ دکھانے کا تھیٹر' وہ پالی جہاں کا اصیل اور ٹیئی دونوں کٹر، ابانی لڑائی کا میدان، خیالی پلاؤ بیچنے والے کی دوکان، باہمی نفاق اور ذاتی رشک و حسد کا تنور، خیالی اور لسانی کشتی کا اکھاڑا، تمدن کے دنگل میں حکمت عملی کے مطابق وزرا کے چٹ پٹ ہو جانے کا سہارا، ملکی مصلحتوں اور قومی حقوق بچانے کا سنگی حصار، غل مچانے اور گپ ہانکنے کا بلند زینہ ' قومی دولت قومی عزت، قومی لیاقت، قومی فصاحت اور قومی شرکت کا خزینہ (۳۶)"

سجاد حسین کے مزاح کا بڑا حصہ سید احمد خاں، انگریز، نیچریت، علی گڑھ اور مغربی تہذیب سے فکری اختلاف کا نتیجہ ہے۔ ملکی و غیر ملکی سیاست اور عام واقعات و حالات بھی ان کے مزاح کی زد میں آئے۔ سجاد حسین کانگریس کے حامی تھے اور مرتے دم تک حامی رہے۔ ان میں اور سید احمد خاں کے نظریات میں قطبین کا فرق ہے۔ سجاد حسین انگریزوں کے مخالف اور انگریزی تہذیب سے بیزار تھے۔ جبکہ سید احمد خاں انگریزوں سے مفاہمت کے حامی اور ان کی تہذیب سے مرعوب تھے اور چاہتے تھے کہ برعظیم کے باشندے بھی اس 'کامل ترین سویلزیشن" (سید احمد خاں کے الفاظ میں) کو اپنالیں۔ چنانچہ سجاد حسین انگریزوں اور سید احمد خاں پر چوٹ کرنے کا کوئی موقع جانے نہیں دیتے۔ "حاجی بغلول" میں جب حاجی صاحب بیرسٹر صاحب کی کوٹھی سے نکلتے ہیں اور بیرسٹر کا کتا انھیں کاٹ لیتا ہے وہاں لکھتے ہیں: "صاحب کا ڈیر کتا جو بہت منھ لگا تھا (یعنی منھ چاٹ لیا کرتا تھا)"

یہاں سجاد حسین کی بے باکی اور اصول پسندی جھلکتی ہے۔ پرنسپل کے باوجود انگریز ہونے کے انھوں نے اس کی مخالفت کی۔ حکومت اور انجمن ہند کو بھی طنز کی لپیٹ میں لے لیا کیونکہ اس ناانصافی پر ان کی خاموشی پر سجاد حسین مطمن نہ تھے۔ البتہ اودھ پنچ میں کئی انگریزوں کی تعریف ملتی ہے۔ مثلاً ۱۳ جنوری ۱۸۹۰ء کے پرچے میں "محبان ہند" کے عنوان سے ایک قلمی تصویری خاکہ شائع کیا جس میں ہیوم اور بریڈ لا کو محبان ہند میں شامل کیا گیا۔ یہ "اعزاز" ہیوم کو غالباً انڈین نیشنل کانگریس کی تشکیل کے صلے میں اور بریڈلا کو اہل برعظیم کا حامی ہونے کی بنا پر دیا گیا ہے۔ کانگریس کا حامی ہونے کی بنا پر سجاد حسین کا یہ رویہ

بعید از فہم نہیں۔ لیکن یہ چیز بہر حال اس بات کی غماز ضرور ہے کہ سجاد حسین کی صحافت اصولوں پر استوار تھی۔ عام واقعات پر "لوکل" کے عنوان سے وہ تبصرہ کرتے تھے اس پر موسم کے ساتھ ساتھ لکھنؤ کے شہری مسائل کا بھی تذکرہ ہوتا تھا اور کبھی کبھی ان کا تبصرہ نہایت دلچسپ ہوتا تھا۔ مثلاً محصولات میں اضافے پر لکھتے ہیں:

> "ایک صاحب اپنے پڑوسی کی گائے کے مرنے کی خدا سے دعا مانگا کرتے تھے۔ اتفاق سے انھی کا گدھا مر گیا۔ جھلا کر آپ کیا فرماتے ہیں "سبحان اللہ چندیں مدت خدائی کردی گاؤ خر رانشاختی" اس طرح غلے کی گرانی کا رونا تھا۔ ہمارے لفٹنٹ گورنر نے پانی کا ٹل ایسا تجویز کرایا کہ میونسپلٹی ان علاوہ پانی کے ٹیکس کے اور بہت سے محصولات چنگی بڑھا دے۔ سبحان اللہ چندیں مدت حکومت کردی غلہ و آب رانشاختی" (۳۷)

ملکی اور عالمی سیاست بھی سجاد حسین کا خاص موضوع ہے۔ انھوں نے اس وقت کے برطانوی وزیر اعظم گلیڈ سٹون ملکہ وکٹوریہ، مہاراجہ کشمیر، نظام دکن وغیرہ کے نام جو خطوط لکھے ہیں بظاہر تو ان میں وہ مشورے دیتے اور غلطیاں نکالتے نظر آتے ہیں لیکن در حقیقت یہ عالمی اور ملکی سیاسی واقعات اور حالات پر تبصرہ ہے۔ آج ان کی بعض باتیں مثلاً روس، افغانستان، برطانیہ، مصر، ترکی، اٹلی کے حالات، فلاں لیڈر، فلاں جنرل، فلاں لارڈ یا زار روس اور مہدی سوڈانی کے تذکرے کچھ عجیب اور دور از کار لگتے ہیں۔ لیکن یہ اس دور کے اہم مسائل تھے اور اہل بر عظیم بالخصوص بر عظیم کے مسلمانوں کو اپنے مخصوص سیاسی اور مذہبی رجحانات کی بنا پر ان سے دلچسپی بھی تھی۔ مثلاً افغانستان کے مسئلے پر برطانوی وزیر اعظم کو فرضی خط میں لکھتے ہیں:

> "مولوی گلیڈ اسٹون طولعمرہ
>
> ـــــ دوسری خطا یہ ہوئی کہ جب معلوم تھا کہ افغانستان پر ہم قبضہ نہیں رکھ سکتے۔ اس میں آمدنی نہ منافع۔ قوم پرورش پا سکتی ہے نہ تجارت چل سکتی ہے تو پھر شیر علی خاں سے لڑنا اور کابل قندھار فتح کرنا ہمارا فضول تھا۔" (۳۸)

آزاد کے دور میں بر عظیم اور عالمی سیاست کی بساط پر جو تبدیلیاں ہو رہی تھیں آزاد کی نہ صرف اس پر نظر تھی بلکہ انھوں نے اسے موضوع بھی بنایا اور ان پر اپنے مخصوص انداز میں تبصرے کیے۔ روس اور مالٹا کی لڑائی، سر سید کی نیچریت، وہابی عقیدے کا پھیلاؤ،، ترکی کے سلطان اور اس کی سلطنت کی بقاء کا سوال، یورپی سلطنتوں کا مفاد پرستانہ اتحاد، برطانوی وزیر اعظم گلیڈ اسٹون کی وزارت عظمیٰ سے معزولی، مقامی نوجوانوں کا ولایت جانے کا بے جا شوق، جنگ افیون، اہل بر عظم کی افیم خوری اور غلیظ عادات، حاجیوں کی جو تم پیزار، انگریزوں کی آلو خوری کی عادت، ترکی ٹوپی کا استعمال، چھری کانٹے سے کھانا، غرض اس دور کے بے شمار چھوٹے بڑے تہذیبی، سماجی اور سیاسی مسائل پر انھوں نے رائے زنی کی ہے۔ اس وقت کی ملکی اور غیر ملکی سیاست کے اتار چڑھاؤ اور ترکی کے مسلمانوں اور خلافت سے مقامی مسلمانوں کی دلچسپی اور ہمدردی کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

"---- مسٹر گلیڈ اسٹون کی حالتِ صحت بہت نازک اور مخدوش ہو رہی ہے---- سرسامی حالت میں بعض اوقات مبتلا ہو کر زیرلب سلطان کی نسبت کچھ لعن طعن اور گریس کے حق میں دعا کر لیتے ہیں، اور وزارت سے اپنی معزولی پر اکثر آہ سرد بھرتے ہیں۔ ڈاکٹروں نے اس مرض کو بلگیرین ہذیان بتایا ہے اور مذہبی جوش، انسانی ہمدردی اور مسلمانوں کی فطرتی عداوت کو اس کی اصل وجہ کہتے ہیں۔"(۳۹)

دراصل گلیڈ اسٹون نے برطانوی وزیر اعظم ڈرزائیلی کے دور اقتدار ۸۰۔۱۸۷۴ء میں ڈرزائیلی کی ٹرک حامی پالیسی کی سخت مزاحمت کی تھی۔ نیز بلغاریہ کے ۱۸۷۶ء کے انقلاب نتیجے میں ہونے والی روس ترک جنگ (۷۸۔۱۸۷۷ء) سے بھی ان دونوں رہنماؤں کے درمیان مشہور سیاسی زور آزمائی ہوئی۔ گلیڈ اسٹون ترکی کے مخالفین میں سے تھے اور برعظیم کے مسلمان مذہب کی بنیاد پر ترک مسلمانوں اور خلافت کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے۔ چنانچہ آزاد کا گلیڈ اسٹون پر طنز قرین قیاس ہے۔ بلغاریہ ہی کی مناسبت سے انھوں نے "بلگرین ہذیان" کا ذکر کیا ہے۔ سیاسی اعتبار سے اودھ پنچ بڑا ترقی پسند تھا۔ وہ سہی سہی میں انگریزی راج کے تشدد اور اقتصادی لوٹ مار پر شدید چوٹیں کرتا تھا۔ قوم پرستی اور قومی یک جہتی کا علم بردار ہونے کی وجہ سے یہ انگریزی تہذیب و معاشرت کی خوب دھجیاں اُڑاتا تھا۔ "۱۸۹۱ء کی دھن" مضمون میں مصنف سیاست دانوں اور سیاسی پارٹیوں کو طنز کا نشانہ بناتے ہوئے کہتا ہے کہ:۔

"حضرتا۔ آپ جانتے ہیں آج کل میں کہاں ہوں؟ خاص الخاص زمین اور آسمان کے بیچوں بیچ اندر۔ اس لیے بھی آسمانی باتوں میں بیحد دخل ہو گیا ہے۔"(۴۰)

اودھ پنچ نے اپنی تمام تر صلاحیتیں مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لیے صرف کر دیں۔ لکھنؤ میں سیاسی شعور پیدا کرنے میں اودھ پنچ کا بڑا حصہ ہے۔ اودھ پنچ ایک طرف اگر کانگریس کا حامی تھا تو دوسری طرف معاشرتی معاملات میں قدامت پرست تھا۔ اگرچہ نئی تہذیب کی روشنی کو اودھ پنچ نے ضرور قبول کیا۔ لیکن انگریزوں کی اندھا دھند تقلید کی ہمیشہ مذمت کی۔ "شور برپا ہے انٹی ماروں میں / ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں" مضمون میں راقم لکھتا ہے کہ: "ول مسٹر اودھ پنچ ہی ہی ہی ہی۔ قہقہ قہقہ قہقہ قہقہ۔ ذرالوقت کے بعد کون تھوڑا ہنسے۔ اوہو ہو ہو ہو۔ چھی ہاہاہاہا۔ تمھیں اسی سرپاک کی قسم جو ہندوستان میں اول نمبر شمار کیا جاتا ہے دیکھو بہت ہنسی دل لگی میں اڑایا کرتے تھے کہ یہ جلسہ ایجوکیشنل کانگریس اور بعد مدت المخلص یہ کانفرنس کبھی ہمارے نیشنل کانگریس کی برابری نہیں کر سکتا۔ یہ اڑھائی اینٹ کی الگ مسجد بنانا سورج کو چراغ دکھاتا ہے۔ کیونکہ اب دیکھا اور پھر دیکھے گا۔ سچ کیلئے الہٰ آباد کا جلاس پنچ کس دھوم دھام ٹزک احتشام مذکر غائب بحث نفی فعل ماضی مجہول (اودھ پنچ) چہ خوش یہ وہی بات ہوئی بعد لیل مثل (بیوی جلیبن نوبت نقارے تو لونڈے ڈھنڈ ھورے تے کے

ساتھ)۔"(۴۱)منشی سجاد حسین بذات خود کانگرسی ذہن میں رکھتے تھے۔ اور اس دور میں جنم لے رہے سیاسی مسائل کو پیش کرنے کے لیے انڈین نیشنل کانگریس کی حمایت میں کچھ نہ کچھ سپرد قلم کرتے رہتے تھے۔ "حاجی کانفرنس الٰہ آباد ۱۸۹۰ء، من تراحاجی بگویم تومرا حاجی بگو" میں مصنف راقم طراز ہے کہ:۔ "جس شدت سے اسمیں تہذیب یافتہ اور قابل لوگوں نے ایک دوسرے کی خوشامد آمیز خود عرفیانہ تعریف کی ہے اسکے سننے کا کوئی معمول اور سچا آدمی ہرگز متحمل نہیں ہوسکتا اسلیے ضرور تھا کہ اس کانگریس کا نام حاجی کانفرنس رکھا جاتا۔"(۴۲)مزید لکھتے ہیں کہ: "کیا علی گڑھ کالج میں پڑھنے والے مسلمان اور نبی کی امت ہیں اور الٰہ آباد کے مسلمان اور نبی کے کلمہ گو۔"(۴۳)مزید لکھتے ہیں کہ

> "انگریزوں میں حاجی بگو یم کا طریقہ ایک مدت سے چلا آتا ہے اور اکثر پبلک اور پرائیوٹ مواقع پر نہایت عمدہ طور سے ہمارے عنوان کے مصرع پر عمل ہوتا ہے اور یہ انہی کی غیر مکمل اور ناپسندیدہ تقلید ہے جو کہ ہمارے حاجی کانفرنس والے کر رہے ہیں۔"(۴۴)

سجاد حسین نے کانگریس کے حامی ہونے کی وجہ سے طنز و مزاح کے پیرائے میں برطانوی حکومت کی کوتائیوں اور بدعنوانیوں کا پردہ ایسے دور میں فاش کیا جب کہ سیاسی رہنماؤں کے لیے لب کشائی بھی مشکل تھی۔ انہوں نے انگریزوں کی عمل داری کی ان پالیسیوں کے خلاف لکھا جو عوام کے منافی تھیں۔ "کیوں مسلمان نالائق ہیں؟" مضمون میں مصنف ان حالات کے بارے میں یہی رقم طراز ہے۔ "لاکھ لاکھ کی طرح سے لوگوں کو پٹی پڑھائی اور ہر ہر طرح سے وعدہ وعید اور سبز باغ دکھا کے سید صاحب نے راہ راست سے بہکایا مگر پھر بھی مسلمانوں نے قومی کانگریس سے منہ نہ موڑا۔"(۴۵) یہ مضمون "مرد آخر ہیں مبارک بندہ ایست" طنز و مزاح کے پردے "اس دور کا تخلیق کیا ہوا ہے جب انڈین نیشنل کانگریس میں زندگی کے آثار پائے جارہے تھے۔ اور کانگریس کی محفلات میں "انٹی کانگریس" کے نام سے ایک طبقہ پیدا ہو چکا تھا۔ ""حضرت مجھے بھی بتادیجیے بلکہ سمجھا دیجئے تو تمام عمر کیا مرنے کے بعد بھی ممنون رہونگا۔ اچھا کان چھپٹا کر سنئے۔ اسکی عرض یہ ہے کی گورنمنٹ پر یہ بات ظاہر ہوجائے کہ رعایا بر سر ترقی ہے یا تنزل۔ توبہ لاحول ولا قوۃ۔"(۴۶)مزید رقم طراز ہیں کہ:

> "سال نو کی مبارک باد
> لیڈی کانگریس۔ کھیلو! بیٹا کھیلو
> اور اس سے ترقی کا خوش آیندہ گانا گاؤ!!۔"(۴۷)

اودھ پنچ کا دوسرا حملہ مولانا حالی کو سہنا پڑا۔ اودھ پنچ کو شکایت محض یہ تھی کہ "مقدمہ شعر و شاعری" میں مولانا حالی نے لکھنؤ شعرا کی توہین کی ہے۔ یہاں بھی اودھ پنچ کا رد عمل سراسر جذباتی تھا۔ "اردو شاعری کی سفارش" میں گورنمنٹ سے اسی معاملے میں عرض کی گئی ہے:

"ایک صاحب مرزا پر سے ایک مضمون " بعنوان کا جبو شلی گورنمنٹ پر شعرا تحریر فرماتے ہیں اور شدومد سے اگلے پچھلے باوشاہان مغلیہ کے دستور کا حوالہ دیکے سفارش کرتے ہیں کہ اس جشن کی خوشی میں سرکار کو شعرا اور اردو کی عزت افزائی فرمانا چاہیے۔ ۔۔۔گورنمنٹ ان فضولیات کی جانب نہ متوجہ ہونیکی مہلت اور دولت رکھتی ہے نہ بغیر شعرا کی قدردانی کے اسکا خدانخواستہ پولیٹیکل یا غلامانہ ہرج ہوسکتا ہے۔"(۴۸)

سجاد حسین انگریزوں کے مخالف اور انگریزی تہذیب سے بیزار تھے۔ جب کی سید احمد خان انگریزوں سے مفاہمت کے حامی اور ان کی تہذیب سے مرغوب تھے۔

"آلہ معین الصوت کی دوکان
نیشنل کانگریس منعقدہ ۲۶ دسمبر (۱۸۹۰)ء
لیڈی کانگریس۔ اون لوگوں کے لئے جو بالکل میری نہیں! یا اونکے واسطے جو نہیں سنتی ہیں!! یہاں عمدہ عمدہ معین الصوت آلہ فروخت ہوتے ہیں۔"(۴۹)

ملکی اور عالمی سیاست بھی سجاد حسین کا خاص موضوع ہے انھوں نے اس وقت کے برطانوی وزیر اعظم گلیڈسٹون، ملکہ وکٹوریا، مہاراجہ کشمیر، نظام دکن وغیرہ کے نام پر جو خطوط لکھے ہیں بظاہر تو ان میں وہ مشورے دیتے اور غلطیاں نکالتے نظر آتے ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ عالمی اور ملکی سیاسی واقعات اور حالات پر تبصرہ ہے۔ جب انڈین نیشنل کانگریس میں زندگی کے آثار پائے جارہے تھے اور کانگریس کی مخالفت میں "انٹی کانگریس" کے نام سے ایک طبقہ پیدا ہوچکا تھا۔ لہٰذا سجاد حسین "انٹی کانگریس" کی مخالفت کرتے ہوئے "پاکیزہ خیالات" میں لکھتے ہیں: "حضرت ایک مدت سے میں شورش میں رہا ہوں کہ نیشنل کانگریس انٹی کانگریس اور حیران ہوں کی الٰہی کیا ماجرا ہے یہ مختلف الاسم کانگریس کیا چیز ہے کیا عجائب خانہ میں کوئی جانور آئے ہیں جنکا شہرہ ہے دھوم ہے جسے دیکھئے لپکتا بھاگتا چلا جاتا ہے"(۵۰) مزید رقم طراز ہیں کہ: "تم مجھے اپنا سا کرلینا چاہتے ہو۔ البتہ مجھے نیشنل کانگریس سے جسقدر مخالفت پہلے تھی اوسقدر تو اس تمہاری تقریر کے بعد باقی نہیں رہی اتنا تو ہین سمجھا کی یہ کانگریس ہند کے حق میں مفید ضرور ہوگی۔ لیکن بعض مقاصد اسکے بیموقع بھی معلوم ہوتے ہیں۔"(۵۱) سیاسی لحاظ سے اودھ پنچ آزادی ہند اور کانگریس کا حامی تھا ہندو مسلم اتحاد اور شیعہ سنی اتحاد کی بھی حمایت کرتا تھا جب کہ علی گڑھ تحریک کی اس نے شدید مخالفت کی۔ "من خوب مے شناسم این جبہ وعصارا" مضمون میں انٹی کانگریس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"نہیں نہیں ایسا بات نہیں ہوسکتا تعلیم یافتہ مہذب پارٹی سے پوچھ لیجئے۔ اسمیں کچھ خرابی نہیں ہے۔ مذہب کو کھانے سے کیا علاقہ انسان سب ایک ہی دادا کی اولاد میں ہیں۔"(۵۲)

سر سید کی شخصیت پر کئی اعتراضات کیے جاتے ہیں کبھی انھیں نیچری کہا گیا، کبھی انگریزوں کا پٹھو اور کئی لوگوں نے ان پر کفر کے فتوے تک لگا دیئے۔ علی گڑھ کے لئے چندہ جمع کرنے پر بھی بہت طنز کا نشانہ بنایا گیا۔ ''بنا کر فقیروں کا اب بھیس سید تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں'' مضمون میں اسی بارے میں ہی بیان کیا گیا ہے۔ ''ہمارے سر سید گلے میں جھولی ڈال جیلوں کو ساتھ لے دکن دکن کیطرف گداگری کے واسطے نکلنے والے ہیں خدا اس فقیر کی جھولی کو طرح طرح کے ٹکڑوں سے بھرا پُرا واپس لائے۔''(۵۳)اودھ پنچ کی سیاسی خدمات قابل ذکر ہیں اودھ پنچ شروع سے رعایا کا خادم اور سرکار کا آزاد مشیر تھا۔ کانگریس کے پہلے جو پولیٹیکل معرکہ آرئیاں پیش آئیں۔ ان میں اس نے ہمیشہ رعایا کا ساتھ دیا۔ ''تو اسکے معنے یہ ہونگے کہ گورنمنٹ کی حکومت جابرانہ ہے ناگوار ہے اور ملک اس حکومت کا متحمل نہیں ہو سکتا انجام یہ ہو گا کہ ملک تباہ ہو جائیگا۔''(۵۴)اودھ پنچ نے بہترین اپوزیشن کا کردار ادا کیا اور ہمیشہ سر سید کے مفاہمت پسند رویہ پر مزاحمت کی۔

حوالہ جات

1. حالی،حیات جاوید،   ،۱۹۹۷،ص:۱۰۶
2. روئداد نمبر ۶، سائنٹیفک سوسائٹی، منعقدہ ۱۶ اگست ۱۸۶۴ء بمقام علی گڑھ گورنمنٹ پریس الہ آباد، بحوالہ: افتخار عالم خاں، سرسید اور سائنٹیفک سوسائٹی، مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، جامعہ نگر نئی دہلی، ص ۱۷۱۔۱۸
3. مقدمہ ابواللیث صدیقی، اسباب بغاوت ہند ۱۸۵۷ء، ص:۱۹
4. نورالحسن نقوی، سرسید اور ہندوستانی مسلمان، جلد دوم، ب،ت، ص:۳۱۵
5. امام الدین گجراتی، مکمل مجموعہ لکچر زوا سپیچز، نول کشور پریس لاہور، ص:۱۵۲
6. مکتوب سرسید لندن، ۱۱۵ اکتوبر ۱۸۶۹ء، بنام سیکریٹری سائنٹیفک سوسائٹی، مشمولہ مکاتیب سرسید احمد خان، ص: ۳۵
7. شان محمد، سرسید احمد خان ، تاریخی و سیاسی آئینے میں، س ن، ص:۷۷
8. ڈاکٹر خورشید الاسلام، منشی سجاد حسین کی طنز نگاری، س ن، ص:۱۶۸
9. اودھ پنچ، ستمبر ۱۸۸۸ء
10. ڈاکٹر طاہر مسعود، اردو صحافت انیسویں صدی میں، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۰ء
11. اودھ پنچ، جنوری ۱۹۰۳ء
12. اودھ پنچ، جنوری ۱۸۹۸ء
13. اودھ پنچ، مئی ۱۸۹۶ء
14. ڈاکٹر وزیر آغا، اردو ادب میں طنز ومزاح، ایجوکیشنل بک ہاؤس: لاہور، ص:۲۸
15. ڈاکٹر ضیاالرحمٰن صدیقی، تحریک آزادی اور اردو نثر، مولانا آزاد پبلک کیشنز، جودھپور، ۲۰۱۴ء
16. ڈاکٹر وزیر آغا، اردو ادب میں طنز و مزاح، ایجوکیشنل بک ہاؤس لاہور، ۱۹۸۵، ص ۱۶۳
17. ایضاً ص ۱۲۴
18. اودھ پنچ، نومبر ۱۸۹۹
19. ڈاکٹر وزیر آغا، اردو ادب میں طنز و مزاح، ایجوکیشنل بک ہاؤس: لاہور، ص ۲۲۶
20. کشن پرشاد کول، اودھ پنچ کے نورتن، ۱۹۵۵ء، ص ۲۱۰
21. اودھ پنچ، ۱۹۰۳ء نومبر

22. نئی ڈکشنری، منقول از خیالات آزاد، مرتبہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ۱۹۶۷ء، لاہور، ص ۱۶۔

23. عبدالرزاق قریشی، نوائے آزادی، ۱۹۵۷ء ص ۵۵

24. ایضاً ص، ۵۷

25. اودھ پنچ، نومبر ۱۸۸۷ء

26. ایضاً اگست ۱۸۸۷ء

27. ایضاً اگست ۱۸۸۸ء

28. ڈاکٹر مصباح الحسن قیصر، بحوالہ اردو طنز و ظرافت اور منشی سجاد حسین، ص ۱۲

29. ایضاً ص ۱۳۲

30. رشید احمد احمد صدیقی، طنزیات و مضحکات، س ن، ص: ۳۸

31. ڈاکٹر رؤف پاریکھ، اردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی اور سماجی پس منظر انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۹۶، ص نمبر ۱۵۲

32. اودھ پنچ جنوری ۱۸۹۸ء

33. اودھ پنچ مارچ ۱۸۹۹ء

34. اودھ پنچ نومبر ۱۹۰۰ء

35. اودھ پنچ دسمبر ۱۹۰۰ء

36. اودھ پنچ فروری ۱۸۸۱ء

37. اودھ پنچ فروری ۱۸۹۱ء

38. اودھ پنچ فروری ۱۸۹۱ء

39. اودھ پنچ فروری ۱۸۹۱ء

40. اودھ پنچ فروری ۱۸۹۱ء

41. اودھ پنچ فروری ۱۸۹۱ء

42. اودھ پنچ جنوری ۱۸۹۱ء

43. اودھ پنچ جنوری ۱۸۹۱ء

44. اودھ پنچ جولائی ۱۹۰۳ء

45.اودھ پنچ	دسمبر ۱۸۹۰ء
46.اودھ پنچ	مارچ ۱۸۹۱ء
47.اودھ پنچ	مارچ ۱۸۹۱ء
48.اودھ پنچ	جولائی ۱۸۹۱ء
49.اودھ پنچ	اگست ۱۸۹۱ء
50.اودھ پنچ	دسمبر ۱۸۹۱ء
51.اودھ پنچ	نومبر ۱۹۰۰ء
52.اودھ پنچ	دسمبر ۱۹۰۰ء
53.اودھ پنچ	فروری ۱۸۸۱ء
54.اودھ پنچ	فروری ۱۸۹۱ء

باب۵

مجلّہ اودھ پنچ میں ہندوستان کی توہم پرستی رسم ورواج اور رویوں پر مزاحمت

اودھ پنچ میں ہندوستان کی معاشرت کی بھرپور جھلکیاں ملتی ہیں۔ اس کے مضامین سازوسامان، رہن سہن کا طریقہ، دعوتوں اور ضیافتوں کے نقشے لباس حتیٰ رسم ورواج بھی اسی تہذیب اور معاشرتی پہلو کی عکاسی کرتے ہیں۔ عقائدو توہمات ہندوستانی تہذیب کے ترجمان ہیں۔ اسلامی عقائد اور ضیعف لاعتقادیاں، رسم ورواج، طعام ولباس، مشاغل و معمولات، آداب اخلاق، غرض ہر قسم کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔

اودھ پنچ کا دور دو واضح انتہاوں کا دور تھا۔ ایک طبقے کو اگر قدیم پر اصرار تھا تو دوسرے کے جدیدیت سے انتہائی رعبت تھی۔ یہ دونوں طبقے جذبے سے زیادہ جذباتیت سے کام لے رہے تھے۔ اسی کے نتیجے میں ایک ایسے ماحول نے جنم لیا جس میں گھٹن کھینچاؤ اور تصادم کی فضاء موجود تھی۔ یہ فضاء اودھ پنچ کے لئے انتہائی سازگار ثابت ہوئی۔ لہٰذا اودھ پنچ نے ایک طرف اگر مغرب کی اندھا دھند نقالی کو تنقید کا نشانہ بنایا تو دوسری طرف قدیم تصورات پر بھی بھرپور طنز کرکے اعتدال کی فضاء قائم کرنے کی کوشش کی اور یہی اعتدال ہمیں اودھ پنچ کی ظرافت میں نظر آتا ہے۔

ادبی حیثیت سے اودھ پنچ نے اردو ادب پر جو اثرات مرتب کیے وہ یقیناً قابل ستائش ہیں۔ لکھنؤ میں اردو نثر مرزا رجب علی بیگ سرور کے مقفیٰ اور مسجع اسلوب سے نکل کر رواں اور سلیس اسلوب کے راستے پر گامزن ہوگئی اگرچہ دلی میں غالب اس کی ابتدا کر چکے تھے مگر لکھنؤ میں اودھ پنچ نے پہل کی۔ ادبی اعتبار سے اگرچہ اودھ پنچ نے کوئی بلند پایہ ظرافت کے نمونے تو پیش نہیں کیے۔ لیکن جس قسم کی عوامی ظرافت کو اودھ پنچ نے رواج دیا اس سے یقیناً اردو ادب پہلے سے زیادہ واقف نہ تھا۔

اودھ پنچ کے دور میں لکھنوی معاشرے اور لکھنوی ادب کا جو حال تھا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اردو نثر تکلف، تصنع اور بناوٹ کے خود ساختہ اصولوں کے تحت خاصی پابند تھی۔ دہلوی رنگ اختیار کرنے میں تو لکھنؤ والے ویسے ہی اپنی ہتک محسوس کرتے تھے لہٰذا ظرافت میں رنگ غالب کی تقلید یا پیروی کا خیال تو بعید از قیاس ہے۔ اس کے علاوہ تصنع اور بناوٹ کو تو اولیت اور علمیت کی دلیل سمجھا جاتا تھا۔ اس پرانے طرز تحریر کی مزاحمت کرتے ہوئے آسان اور سہل زبان کو رائج کیا۔ مجلہ کا پہلا معرکہ رتن ناتھ سرشار کے فسانہ آزاد کے خلاف تھا۔ رتن ناتھ سرشار اودھ پنچ کے ابتدائی لکھنے والوں میں سے تھے۔ مگر جب انہوں نے اودھ اخبار کی ایڈیٹری سنبھالی تو وہ اودھ پنچ سے الگ ہوگئے۔ اودھ پنچ کے جاری ہونے کے ایک سال بعد انہوں نے اودھ

اخبار میں فسانہ آزاد قسط وار لکھنا شروع کر دیا۔ اودھ پنچ کو فسانہ آزاد کی زبان اور اس کے استعمال شدہ محاورات پر یہ اعتراض تھا کہ سرشار نے اودھ کی بیگمات کی جو زبان لکھی ہے وہ گھٹیا اور نچلے طبقے کی عورتوں اور کنیزوں کی زبان ہے۔ دراصل اودھ پنچ کو فسانہ آزاد کی تیزی سے بڑھتی ہوئی مقبولیت ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ یہ سراسر معاصرانہ چشمک تھی کیوں کہ منشی سجاد حسین نے بھی فسانہ آزاد کی تقلید میں اودھ پنچ میں حاجی بغلول قسط وار لکھنا شروع کر دیا تھا۔ یہ ایک الگ بحث ہے کہ "حاجی بغلول" کو فسانہ آزاد جیسی شہرت حاصل ہوئی یا نہیں۔

اودھ پنچ کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین کا تخلیق کردہ مزاحیہ کردار "حاجی بغلول" اردو ادب کا ایک ایسا کردار ہے جو اپنی مضحکہ خیز شخصیت، بدحواسی، حماقت اور ناہمواری کی وجہ سے پورے ماحول کو زعفران زار بنا دیتا ہے۔ حاجی بغلول کی شخصیت اور کردار ایک حد تک فوجی سے ملتا ہے۔ دونوں جسمانی اور دماغی کمزوریوں کا شکار ہیں۔ دونوں کی ذات لوگوں کے لیے تفریح کا باعث ہے۔ ددونوں ہی ایک قسم کی جھوٹی پندار میں مبتلا ہیں اور ہر وقت اپنا وقار بلند کرنے کے چکر میں حماقتوں پر حماقتیں کرتے اور دوسروں کی نظروں میں سبک ہوتے رہتے ہیں۔ سجاد حسین نے بغلول کا حلیہ یوں پیش کیا ہے۔

> "نیچر نے بھی صورت شکل بنانے میں توجہ خاص مبذول کر رکھی تھی مثل اور لوگوں کے آپ کی تعمیر ٹھیکیدار کے سپرد نہ کی تھی بلکہ دستِ خاص کی صنعت تھی۔ سر چودہ انچ کے دور سے بال دو بال ہی زائد تھے۔ پیشانی پست، نیچے کی طرف جھکی ہوئی بنی شاید قلتِ فرصت کی وجہ سے ایسی مختصر بنی تھی کہ بانسا معدوم، نتھنے صرف تہ خانے کے روشندان۔ اوپر کالب چھوٹا، نیچے کا جبڑا معہ زنخدان آگے کو ابھرا رخساروں کی ہڈیاں دبی، داڑھی نور علی نور، چہرے کو نوکدار بناتے ہوئے بازو اور ہاتھ فی الجملہ دبلے شانے ڈھلے ہوئے، انگلیاں لکھنؤ کی مہین ککڑیاں، شکم مبارک کا بیضادی دور سینے سے سوا، ٹانگیں چھوٹی چھوٹی، اوپر کا دھڑ بڑا، یوں تو حضرت انسان ہونے میں کس جو محل شک ہو سکتا ہے مگر مورخین کو حکمت اساس میں اختلاف تھا۔" (۱)

منشی سجاد حسین نے اپنے کردار کی تخلیق میں حد سے زیادہ غلو سے کام لیا ہے۔ مزاحیہ کردار کی خوبی اس کی ناہمواری اور ماحول سے نا مطابقت ہوتی ہے جو مزاح پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہے لیکن سجاد حسین نے اپنے کردار کی ناہموراری کے ساتھ ساتھ اس کے حلیے سے بھی لطف اندوزی کے لیے اس کے اندر حد سے زیادہ جسمانی عیوب دکھائے ہیں۔ حاجی کی شخصیت انسانی روپ میں ہے لیکن

اس روپ میں اس قدر بگاڑ ہے کہ اس کے حلیہ کا صرف تصور ہی ہنسی کی تحریک پیدا کر دیتا ہے۔ سجاد حسین نے صرف اس پر اکتفانہ کرتے ہوئے جگہ جگہ اس کی عادات واطوار پر تبصرے کر کے اس کو نشانہ تمسخر بنایا ہے جس پر وزیر آغا کو کہنا پڑا:

"سجاد حسین نے حاجی بغلول سے دوسری زیادتی یہ کی ہے کہ قدم قدم پر اسے خود ہی نشانہ تمسخر بنایا ہے یعنی اگر ایک لحظہ کے لیے یہ مان بھی لیا جائے کہ مصنف نے حاجی بغلول کے حلیے کے بیان میں مبالغہ سے کام نہیں لیا بلکہ اسے بالکل اسی طرح پیش کیا ہے جیسا کہ وہ ہے تاہم یہ بات کسی صورت بھی مستحسن نہیں تھی کہ وہ خود اس کے حلیے پر تنقید وتبصرے سے کام لینے لگے۔" (۲)

حاجی بغلول کے کردار میں ناہمواری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ وہ جھوٹے پندار اور جھوٹے وقار میں مبتلا ہے۔ اس کے نزدیک دنیا کی تمام خوبیاں ایک جگہ جمع ہو کر اس کے اندر سمٹ آئی ہیں۔ وہ خود کو ہر فن مولا اور جگت استاد تصور کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں بلاسوچے سمجھے ہر کام کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ چاہے معاملہ شہسواری کا ہو یا اخبار نکالنے کا، مقدمہ بازی کا ہو یا عشق بازی کا وہ ہر چیز کو اپنے لیے آسان سمجھ کر فوراً میدان عمل میں کود پڑتا ہے۔ وہ حالات کے تجزیے کی صلاحیتوں سے بے پرواہ ہے اور ہر کام میں جلد بازی کے نتیجے میں بار بار بے عزتی کے عمل سے گزرتا ہے۔ وہ اپنی فطرت کی وجہ سے بارہا پٹا بھی ہے لیکن اس کے باوجود اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا۔ وہ اپنے متعلق حد سے زیادہ خوش فہمی کا شکار ہے۔ دوسروں کو اپنے سے کم تر اور کم عقل سمجھتا ہے۔ اسکو شکایت ہے کہ اس جیسے یکتا کے روزگار شخص کی ناقدری ہو رہی ہے۔ حاجی بغلول روایتی مزاحیہ کرداروں کی خوبیوں سے مرصع ہے۔ اس کے اندر عام انسانی لچک کا فقدان ہے۔ وہ حالات اور واقعات کی چکی میں پس کر بھی کوئی تجربہ حاصل نہیں کرتا اور ہمیشہ ایک سی حرکت کر کے دوسروں کے لئے تفریح طبع کا باعث بنتا ہے۔ وہ خود کو تبدیل کرنے کی صلاحیت سے محروم ہے۔ اس کے کردار میں لچک کے فقدان اور فطرت میں ناہمواری نے قدم قدم پر مضحکہ خیز واقعات کو جنم دیا ہے۔ اس لیے آل احمد سرور کا کہنا ہے۔ "سجاد حسین کا ناول حاجی بغلول یا احمق الذی پڑھیے تو آپ کو Pickwick Papers کا لطف آئے گا۔" (۳)

حاجی بغلول اپنی تمام ترخامیوں کے باوجود اردو ادب کا ایک سدا بہار اور لافانی کردار ہے جو اردو ادب کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اودھ پنچ کے احتساب کے خوف سے لوگ اس کے سالانہ خریدار بن جاتے تھے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اودھ پنچ لوگوں کو ڈرا دھمکا کر رقم وصول کرتا تھا۔ یہ مرزا صاحب کا حسن ظن ہے کہ وہ بد کردار شخص "برے افعال سے توبہ کر لیتا" اصل اہمیت اس ٹکڑے کی ہے کہ "اور اودھ پنچ کا سالانہ خریدار بن جاتا"۔ گویا جو لوگ اودھ پنچ ک سالانہ خریدار بن جاتے تھے

انھیں نیک اور تائب سمجھ کر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اس طرز عمل کو ڈرا دھمکا کر زبردستی سالانہ خریدار بنانے کے حربے کے علاوہ اور کیا نام دیا جاسکتا ہے؟ اودھ پنچ کے صفحات پر نادہندگان کے نام ادارتی نوٹ شائع ہوا کرتے تھے جن میں کہا جاتا تھا کہ سالانہ خریدار بقایاجات ادا کر دیں ورنہ ان کے نام اخبار میں شائع کر دیے جائیں گے۔ اس قسم کے نوٹس اور نادہندہ سالانہ خریداروں کے نام اس دور کے اکثر اخبارات میں شائع ہوا کرتے تھے اور یہ ایک عام بات تھی۔ مگر یہ ایک طرح کا جبر تھا اور لوگوں کو مجبوراً سالانہ خریدار بننا پڑتا تھا۔ لیکن اودھ پنچ ایک طرف تو ایسے اخبارات کی مذمت کیا کرتا تھا اور دوسری طرف خود اس کے صفحات پر ایسے دھمکی آمیز نوٹ چھپتے تھے۔ مثلاً ''نادھندہ خریدار اور اخبار'' کے عنوان سے ایک نوٹ ۱۹ ستمبر ۱۸۸۹ء کے اودھ پنچ میں صفحہ ایک پر شائع ہوا جس میں دہلی کے اخبار الاخیار کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ کس طرح اس اخبار نے بعض والیان ملک، دیسی رؤسا اور امرا کا نام نادہندگان کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ پھر صفحہ دو پر تحریر ہے:''ہر چند کہ ہم کو اپنے قدر دانوں اور معاونوں سے بفضلہ اس قسم کی کوئی شکایت نہیں تاہم ہمارا التماس ہے کہ وہ اس مضمون کو ذری توجہ سے معائنہ فرمائیں گے۔ اودھ پنچ کے اس عجیب و غریب رویے کو کیا نام دیا جائے؟ فرسودہ رسم ورواج کی مزاحمت کرتے کرتے خود بھی فرسودہ طریقہ اپنایا جاتا تھا تا کہ لوگوں کی تنقید سے بچ سکیں۔

منشی سجاد حسین کا یہ طنز ان کی تصانیف کی عکاسی کرتا ہے جیسا کہ ''میٹھی چھری'' میں مزاح نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس میں ایک رئیس کا گھر تباہ ہونے اور اس کے خاندان کو معاشی مشکلات میں گرفتار ہوتے دکھایا گیا ہے۔''پیاری دنیا'' کی طرح یہ ناول بھی دلچسپی کا حامل نہیں ہے لیکن اس میں ایک ''مِس'' کی زبانی منشی سجاد حسین نے اپنے دور کے لوگوں کو پیغام دیا کہ عزت کا معیار اور اشراف میں شامل ہونے کی وجہ دولت یا ریاست نہیں بلکہ محنت اور ہنر ہے اور جو لوگ محنت و ہنر سے عاری ہیں وہ بھنگی اور چمار سے بدتر ہیں۔ پیغام اس دور کے لوگوں کو جھنجوڑنے کے مترادف ہے اور مغرب سے اخذ کردہ ہے۔ منشی سجاد حسین کی مزاح نگاری کے بارے میں مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کا مزاح اس دور کے اہم مسائل کو موضوع بناتا ہے اور سماجی تبدیلیوں کا عکاس ہے۔

نواب آزاد کا ڈرامہ ''نوابی دربار'' جو بعد میں کتابی صورت میں طبع ہوا ''اودھ پنچ'' میں ۱۶ اپریل ۱۸۷۸ء سے ۱۶ جولائی ۱۸۷۸ تک قسط وار چھپتا رہا۔ نواب آزاد مغربیت کے شدید مخالف تھے۔ اپنی تصانیف میں انھوں نے مغرب، مغربی تہذیب اور انگریزوں کا مذاق اڑایا۔ ان کے گہرے طنز کیے۔ نواب آزاد نثر میں وہی کام کرنا چاہتے تھے جو اکبر نے نظم میں کیا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ آزاد کو جہاں جہاں مشرقی تمدن، اقدار اور افراد میں عیب اور کمی نظر آئی ہے انھوں نے اس کی بھی نشان دہی ضرور کی ہے۔ گویا یہ ایک

طرح سے اپنی تہذیب کی خامیوں کا بھی اعتراف اور اہل وطن کی توجہ اس جانب بہ غرض اصلاح مبذول کرانے کی کوشش ہے۔ یہ عنصر آزاد کی تحریر میں توازن اور اعتدال پیدا کرتا ہے اور انھیں مغرب کا متعصب نقاد ہونے سے بچالیتا ہے۔

آزاد کا بنیادی مقصد جدید و قدیم اور مشرقی اور مغربی اقدار کے درمیان اعتدال قائم کرنا اور اس افراط و تفریط سے بچنا تھا جو ان کے خیال میں علی گڑھ تحریک کے ہمنواؤں کی تقلید مگربی کے نتیجے میں پیدا ہو گئی تھی۔ وہ مغرب کے اُمڈتے ہوئے سیلاب سے اپنی تہذیب کو بچانا چاہتے تھے چنانچہ مغرب اور اس کے تمدن کی خامیوں کو بے نقاب کرنے کے ساتھ ساتھ خود اپنی تہذیب میں موجود بعض خرابیوں کی اصلاح کی طرف بھی انھوں نے توجہ دلائی تاکہ ایک طرف تو مغربی تہذیب کے بالاتر اور کامل کرنے کا رعب جو علی گڑھ نے پیدا کیا تھا دلوں سے نکل جائے اور دوسری طرف جو ہماری کمزوریاں ہیں اور جن کے سبب تہذیبی اور ذہنی طور پر مغلوب ہو جانے کا اندیشہ ہے انھیں بھی دور کرنے کا خیال پیدا ہو جائے۔ اس مقصدیت اور خلوص نے ان کی تحریر میں اثر، گہرائی اور خوبی پیدا کر دی ہے۔

آزاد نے اہل مغرب کی اخلاقی باختگی، بے راہ روی اور ان خامیوں کو خاص طور پر نشانہ بنایا جن کا تعلق اخلاق اور شرم و حیا سے تھا۔ اہل مشرق کی جن برائیوں کی انھوں نے بالخصوص نشاندہی کی ان میں صفائی اور پاکیزگی کا خیال نہ رکھنا، پیری مریدی، کاہلی اور نااتفاقی، کے علاوہ امرا اور روسا کی غفلت اور حماقت اور ان کے درباریوں کی خوشامد اور مکاریاں وغیرہ بھی شامل ہیں۔ آزاد نے اس دور کی ملکی اور غیر ملکی سیاست پر بھی اظہار خیال کیا اور مسائل و مباحث کی باریکیوں کو بیان کیا۔

مشرقی تہذیب کی خامیوں میں انھوں نے امرا اور روٗسا کی غفلت، حماقت اور رفتار زمانہ سے عدم واقفیت کو بہ طور خاص موضوع بنایا ہے اور ایک ڈراما اسی موضوع پر تحریر کیا ہے۔ "نوابی دربار" نامی اس ڈرامے کے نواب، ان کے زنان خانے اور درباریوں کے رویے، سوچ اور حرکات و اعمال سے اس دور کی ریاستوں کے حکمرانوں کی زندگیوں اور کمزوریوں کی صحیح تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اور یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ انگریزوں نے کس طرح ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر دھیرے دھیرے ریاستوں کو ہڑپ کرنا شروع کیا اور اپنے تسلط کو وسعت اور قوت دیتے گئے۔ اس ڈرامے کا مرکزی خیال یہی ہے کہ کس طرح امرا کے مصاحبین انھیں خوشامد سے بے وقوف بنا کر لوٹتے رہے اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد بھی ان امرا کو اپنے تفاخر اور آن بان کے معیار کو برقرار رکھنے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے۔ اور کس طرح اس مصنوعی شان و شوکت کی خاطر ریاستیں اور رجواڑے تباہ و برباد ہوتے رہے۔ طمانچے مار کر گال سرخ رکھنے کی اس پالیسی کو "نوابی دربار" میں نہایت عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔

سوانح عمری مولانا آزاد نواب سید محمد آزاد کی فرضی سوانح عمری ہے۔ اس پرُلطف اور مزاحیہ سوانح عمری میں نواب سید محمد آزاد نے اپنی زندگی کے فرضی واقعات بیان کیے ہیں اور مغرب زدگی، آزادیِ نسواں، مکر و فریب اور سید احمد خاں پر گہرے طنز کیے ہیں۔ سوانح عمری کے پردے میں انھوں نے سید احمد خاں کے علاوہ نام نہاد "رفارمروں" پیروں اور مولویوں، وکیلوں اور سیاست دانوں وغیرہ کے لتے لیے ہیں۔ سوانح عمری کی ابتدا اتنی سنجیدہ ہے کہ لگتا ہے نواب آزاد اپنی زندگی کے صحیح صحیح حالات اور واقعات بیان کرنے جارہے ہیں۔ اس سوانح عمری میں سید احمد خاں اور ان کے معتقدوں پر کھلا کھلم چوٹ کی گئی ہے:

"اردو میں ہم سید مغربی کی عبارت اور تصانیف کی بے انتہا تعریف کرتے تھے اور ان کو بلا خیال اس کے کہ کوئی نسبت مشبہ اور مشبہ بہ میں ہو یا نہو، بائرن مکالے، ہملٹن [غالباً ملٹن] سر والٹر سکاٹ، گولڈ سمتھ غرض جس انگریز سے جی چاہتا ملادیتے تھے اور اس پر حاضرین جلسہ بغیر اس علم کے کہ یہ سارے انگریز مصنف و محرر تھے یا جنگلی جانور بلا تامل صاد کردیتے تھے"۔ (۴)

ستم ظریف نے لکھنؤ کے حالات اور ماحول کو خاص طور پر موضوع بنایا ہے۔ لکھنؤ کی عورتوں، نوابوں، وکیلوں اور گواہوں کے حالات اور ان کی مخصوص زبان مضامین میں خاص طور پر جھلکتی ہے۔ (رمضان، نوروز، عید، نیا سال، محرم اور اسی قسم کے دیگر تہواروں پر اودھ پنچ میں خصوصی مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔) اسی مضمون میں لکھتے ہیں: "نکاح بہتیرے مگر شادیاں کم، بارش کا معاملہ وہی گھم گھم،۔۔۔ دن کو دھوپ رات کو تارے نظر آئیں، گرمی کے رمضان شریف پانی خوب پلوائیں۔۔۔ نماز کے وقت سویرا ہو یا چراغ تلے اندھیرا ہو۔ مسلمانوں میں افلاس ہو، روپیہ پیسا بنیوں کے پاس ہو۔۔۔ کالجوں میں چوہے ڈنڈ پیلیں طالب علم تالیاں بجائیں گلی ڈنڈا کھیلیں۔" (۵) اس اقتباس میں زیادہ زور محاورے باندھنے اور قافیہ پیمائی پر ہے۔ تاہم اس دور کے حالات کی جھلک اس میں ضرور موجود ہیں۔ ستم ظریف کا طنز اکثر براہ راست ہوتا ہے اور طوالت کی بنا پر لطف کھو دیتا ہے جیسے استاد شاگرد کی اس گفتگو میں:

"یہ کہو مدتوں میں جو ہم نے اپنا دماغ کھو کھلا کر کے تمھیں آدمی بنایا تھا۔ وہ سبق تو نہیں بھلا دیے؟ توبہ جناب۔۔۔ آپ کے پڑھائے ہوئے سبق تو اس طرح یاد ہیں جیسے کوے کو سر گمیں، رنڈیں کو چونگے، وکیلوں کو قانون، عملہ والوں کو رشوت، پولیس کو جھوٹی کاروائی، عبدالرحمان خان کو روسیوں کے احسانات، لکھنؤ والوں کو چانڈو خانہ، برقندازوں کو کبیر، کاشت کاروں کو خشک سالی، نمبرداروں کو مئی جون کی قسط، بنیا اخبار کو خوشامد، نیچریوں کو

اٹھارہویں صدی کے نصف آخر اور انیسویں صدی کے نصف اول زمانے میں اودھ اور الہ آباد کے صوبے اسی طرح سے اخلاقی اور مذہبی زبوں حالی میں گرفتار تھے۔ جس طرح شمال ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی حالت تھی۔ دہلی کی طرح لکھنؤ میں بھی گنڈے تعویذوں کے استعمال پر بڑا زور تھا۔ ہر قسم کے امراض کے لیے تعویذ کیے جاتے تھے۔ مثلاً برائے حمل، آسیب وغیرہ۔ مصنف اسی کی مزاحمت کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ: "یہ اُوسکی ذرہ نوازی ہے جو ہم ایسے گنہگاروں کی وہ سن لیتا ہے۔ الہ آباد میں کوتوال ہے اسکو بیچارے کو بڑا اعتقاد ہے اور اُسکو بیوی ہی خدا نے ایسی دی ہے کہ وہ اُس سے بھی زیادہ فقیروں کی عاشق ہے۔ پندرہ برس شادی کو گزر گئے تھے ایک چوہے کا بچا نہیں ہوا تھا۔" (۱۳) اس زمانے میں عورتوں کی حیثیت پر طنز کرتے ہوئے مصنف ارقام کرتا ہے کہ:

"بندہ نواز۔ گستاخی معاف۔ شاید فرانس کی عورتیں مردوں سے زیادہ حافظہ رکھتی ہوں۔
مگر اس گرم ملک میں تو یار لوگ انھیں ناقص کہتے ہیں تو وجہ کیا۔ روزمرہ کا حساب کتاب
شام کو پوچھنے بیٹھے تو بڑے خوض کمال غور کے ساتھ گھنٹہ بھر بُدبدانے۔ دو گھڑی دیدے
گھمانے کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔ ہائے اللہ۔ ایک روپیہ خرچ یاد ہی نہیں پڑتا۔" (۱۴)

اودھ پنچ کے دور میں لکھنوی معاشرے اور لکھنوی ادب کا جو حال تھا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ان حالات کی مزاحمت آزاد نے اپنی ڈکشنری میں کی ہے۔ جس میں آزاد نے اپنے مخصوص اسلوب میں اپنے عہد کی معاشرتی برائیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ ناچنے والیاں ہندوستان کے ہر شہر میں پائی جاتی تھیں۔ لیکن جیسی باکمال ناچنے اور تانے والی رنڈیاں لکھنؤ میں پیدا ہوئیں شاید کسی شہر میں نہ ہوئی ہوں۔ آزاد نے ان مشرقی بُرائیوں کے بارے میں دل کھول کر لکھا۔ ایک مضمون "تیرہویں صدی کی نئی ڈکشنری" میں اودھ کے رنڈی بازی معاشرے کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ "نایکا۔ وہ ڈینگوفیور جو قبر تک میں انسان کی ہڈی کو جلاتا رہے۔" (۱۵) مصنف مزید ارقام کرتا ہے کہ "قرم سیاق۔ نایکا جی کا وزیر۔ حیرت انگیز تعویذ تسخیر۔" (۱۶) اس ہی طرح مضمون "جودسویں صدی کی نئی روشنی کی ڈکشنری" میں مشرقی لبادہ میں ملبوس نایکا کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "مہذب بی بی۔ دلکش، دلربا اور دل فریب جڑی۔ میاں سے تین میں دس بیس برس بڑی۔" (۱۷) مصنف مزید اس معاشرے پر سے پردہ اٹھاتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ۔ "نوچی۔ نائکا جی کے امید و بیم اور راز و نیاز کا تجارتی جہاز۔" (۱۸) اودھ کے معاشرے میں بُرائیاں صرف مردوں کی حد تک محدود نہیں تھیں بلکہ عورتوں میں بھی یکساں موجود تھیں۔ جس کا تذکرہ آزاد اپنے مضمون "چودھویں صدی کی پرانی روشنی کی ڈکشنری" میں کچھ یوں کیا ہے:

"ڈومنی (برے چال چلن کی) بعض بیگمات کا جان دار اور مزہ دار آلہ تفریح۔" (۱۹)

تاریخ میں تصادم کے ذریعے تبدیلی آتی ہے فرسودہ روایات اور نظام ٹوٹتے ہیں اور ان کی جگہ حالات کے مطابق نئی روایات پیدا ہوتی ہیں وہ معاشرے کبھی ترقی نہیں کرتے جو مصلحت اور سمجھوتے پر عمل کرتے ہیں۔ سماج اسی وقت بدلتا ہے جب قدامت پرستی کی مزاحمت کی جائے اور جن پابندیوں میں لوگ اسیر ہیں ان زنجیروں کو توڑا جائے۔ ماضی سے راہنمائی کے بجائے مستقبل کی تعمیر کے لیے نئے خیالات و افکار کو پیدا کیا جائے۔ اودھ پنچ نے ہندوستانی زندگی اور سماج کی ساری بے اعتدالیوں کو ہدف طنز بناتے ہوئے اس معاشرے کی بھرپور مزاحمت کی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ آل احمد سرور۔ تنقیدی اشارے، علی گڑھ، مسلم ایجوکیشنل پریس، ۱۹۴۲، ص ۱۲

۲۔ اودھ پنچ ۲۸ فروری ۱۸۸۹

۳۔ اودھ پنچ ۶ مارچ ۱۸۹۰ء

۴۔ ایضاً

۵۔ اودھ پنچ، ۱۰ اگست ۱۸۷۹ء

۶۔ ایضاً

۷۔ اودھ پنچ، ۷ اگست ۱۸۹۰ء

۸۔ اودھ پنچ، ۱۲ اکتوبر ۱۸۹۶ء

۹۔ اودھ پنچ، اکتوبر ۱۸۹۱ء

۱۰۔ اودھ پنچ، ستمبر ۱۸۹۶

۱۱۔ ایضاً

۱۲۔ اودھ پنچ، دسمبر ۱۸۹۶ء

۱۳۔ ڈاکٹر غلام میمن ذوالفقار (مرتب)، خیالات زاد، مکتبہ خیابان لاہور، ۱۹۶۷، ص ۱۹

۱۴۔ ایضاً ص ۲۰

۱۵۔ ایضاً ص ۲۸

۱۶۔ ایضاً ص ۳۲

۱۷۔ ایضاً ص ۲۱

۱۸۔ اودھ پنچ، ۱۲ اکتوبر ۱۸۹۶ء

۱۹۔ ایضاً ص ۳

ماحصل

ماحصل

آج تک اودھ پنچ کو اولین صحافت اور نثر میں طنز و مزاح کی شروعات کے طور پر ضرور دیکھا جاتا تھا۔ لیکن اودھ پنچ کے معاشرتی ردِ عمل اور مزاحمتی رویہ پر تحقیق میں اب تک تحقیقی پہلو عیاں نہ ہو سکے تھے۔ گزشتہ ابواب کی روشنی میں یہ اندازہ لگانا مشکل نہ ہو گا اودھ پنچ کا مزاحمتی رویہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد وجود میں آیا تھا۔ اس رستاخیز میں ہندوستانیوں کو شکست ہوئی اور ملک میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ ملکہ وکٹوریا کی آمرانہ حکومت قائم ہوئی۔ اس ہنگامے سے ویسے تو ہندستان کا ہر طبقہ متاثر ہوا لیکن مسلمانوں پر سب سے زیادہ مصیبت آئی۔ اول تو یہ کہ نام نہاد مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اور مسلمانوں کے اقتدار کی یہ آخری یادگار بھی خاک میں مل گئی۔ دوسرے یہ کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں مسلمانوں کے پیش پیش رہنے کی وجہ سے انگریزی حکومت ان سے اس قدر برہم ہو گئی تھی کہ اس قوم کو نیست و نابود کرنے کے لیے کوئی کسر باقی نہ چھوڑی گئی۔ مسلمان مسلسل انگریزوں کے ظلم و جبر کا شکار ہوتے رہے اور حاکم وقت کے عتاب کے زیر اثر ان کی بقا کی آیندہ بھی کوئی امید نہ رہی۔ معاشی اور اقتصادی لحاظ سے تو وہ پہلے سے ہی کمزور چلے آرہے تھے اب انھیں تعلیمی، تہذیبی، سیاسی، مذہبی ہر طرح کے زوال کا منہ دیکھنا پڑا۔ مزاحمتی ادب جبر و استحصال مخالف ادب ہوتا ہے۔ اردو ادب کا آغاز جس دور میں ہوا وہ سیاسی انحطاط اور معاشرتی و تہذیبی زوال کا عہد ہے۔ اٹھارویں صدی کے آغاز سے اس زوال کی ابتدا ہو گئی تھی۔ سیاسی زوال کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء ایک مرکزی نقطہ ہے اور اودھ پنچ کی نثر ۱۸۵۷ء کے بعد رقم ہونے والی ناانصافی، ظلم، تشدد و بربریت یا جبر کی آئینہ دار ہے۔ غدر کے بعد ہندوستان بیرونی مداخلت اور تسلط کے شکنجہ میں پورے طور سے کسا ہوا ہے۔ مسلمانوں کی قوم خصوصیت کے ساتھ اپنی شامت اعمال کا نتیجہ بھگت رہی ہے۔ نفاذ خود غرضی و غداری نفس پرستی اور عیش پرستی کی گرم بازاری ہے۔ اس کے مقابلہ میں برطانیہ کا نقش ہر دل پر بیٹھا ہوا ہے۔ اب مغرب کا جادو ساری قوم پر چل گیا۔ علم و فضل کا معیار کمال یہ پایا کہ انگریزی زبان آجائے تلفظ انگریزوں کا سا ہو جائے اور انگریزی علوم سے واقفیت ہو جائے، تہذیب و شائستگی کی معراج یہ ٹھہری کہ انگریزی کھانا کھایا جائے، لباس انگریزی پہنا جائے اور انگریزی تقلید میں خاندان مشترکہ کے وجود کو ذلیل سمجھ کر ضعیف والدین اور دوسرے اعزہ سے قطع تعلق کر لیا جائے۔ شرافت و عزت کا منتہائے خیال یہ قائم ہوا کہ ہر ممکن ذریعہ سے انگریزی عہدے حاصل کئے جائیں۔ عقل و دانش کا مفہوم یہ قرار پایا کہ انگریزی مصنف کے قول پر بے چوں چرا ایمان لایا جائے اور اپنے علوم و فنون، شعائر و رسوم، عقائد و خیالات کو یکسر ادھام کا لقب دے کر انگریزیت کے صنم دلربا کے قدموں پر نثار کر دیا جائے۔ مجلہ اودھ پنچ نے اپنی کم و بیش چالیس سالہ زندگی میں جس موضوع کا سب سے زیادہ برتا اور جس کو

سب سے زیادہ تنقید کا نشانہ بنایا وہ انگریزی تعلیم اور انگریزی تہذیب و تمدن تھی اور غالباً اسی ضمن میں سرسید تحریک اور ان کے رفقا کی سرگرمیاں بھی اودھ پنچ کا نشانہ بنیں۔ اودھ پنچ کا اہم کارنامہ اس نو آبادیاتی معاشرے کے خلاف مزاحمتی کردار ہے۔

اودھ پنچ کا اجرا ۱۸۷۷ء میں ہوا۔ یہ ایک مزاحیہ جریدہ تھا۔ اس کے مدیر منشی سجاد حسین (۱۹۱۵ء۔۱۸۵۶ء) تھے۔ جو خود بھی مزاح نگار تھے۔ بلکہ اودھ پنچ کے لکھاریوں میں سب سے بسیار نویس وہی تھے اور اودھ پنچ کے شذرات، اداریوں اور مضامین کا خاصا بڑا حصہ انھی کے قلم کا رہین منت ہوتا تھا۔ منشی صاحب علی گڑھ کی تحریک اور سرسید (۱۸۱۷ء ۔ ۱۸۹۸ء) کی پالیسی کے اول روز سے مخالف تھے، نظام معاشرت میں قدامت پرستی کے قائل اور مغربی تہذیب کے دشمن تھے۔ ۱۸۸۷ء میں نیشنل کانگرس میں شریک ہوئے۔ اودھ پنچ بظاہر تو مزاحیہ جریدہ تھا لیکن سنجیدہ اور سماجی مسائل پر اس کا اپنا ایک نقطہ نظر تھا جسے وہ طنز و مزاح کے پیرائے میں ظاہر کرتا رہتا تھا مزاحمت اور مصلحت سے وہ بلند تھا، جس بات کو سچ سمجھتا تھا وہی لکھتا تھا ان کی ایک سوچی سمجھی پالیسی تھی جس پر وہ مستقل مزاجی سے کاربند رہا۔ اس پالیسی کے نمایاں نکات میں سے ایک جدید مغربی تعلیم اور سرسید کی مخالفت تھی۔

اودھ پـــــــنچ کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا اور دوسرا برصغیر کی غلامی کا دور تھا۔ لہٰذا اودھ پـــــــنچ کا روئے سخن انگریزوں اور ان کی سیاسی چالوں کی طرف رہا۔ اس طرح اودھ پـــــــنچ کے موضوعات کا غالب حصہ سیاست قرار پایا ۔ اگر پہلے ادوار کے موضوعات میں سے سیاست نکال دی جائے تو باقی کوئی خاص قابل ذکر موضوع نہیں رہتا ۔ جبکہ تیسرے دور دور میں سیاست کو اتنی اہمیت حاصل نہیں ہے کیوں کہ تب تک سیاسی حالات قطعاً بدل چکے تھے اور برصغیر آزادی کی نعمت سے فیض یاب ہو چکا تھا لہٰذا تیسرے دور میں اودھ پـــــــنچ کے مزاحمتی رویے کی جگہ مزاحیہ اور ادبی رنگ غالب آچکا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر نے ہندوستانیوں خاص کر مسلمانوں کو اور بھی زیادہ پست کر دیا تھا۔ انھیں تباہی کے اس اندھیرے غار میں دھکیل دیا جہاں مایوسی اور اندھیرے کے سوا کچھ نہ تھا۔ مسلمانوں کی سیاسی ، سماجی زندگی بالکل تباہ و برباد ہو چکی تھی اور انگریزوں کا ہندوستانیوں پر مستقل قبضہ ہو چکا تھا۔ انگریزوں نے غدر کے بعد مسلمانوں کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ اس لئے بنایا تھا کیوں کہ انھوں نے ہندوستان کو مسلمانوں کے ہاتھوں سے ہی چھینا تھا۔

سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کی قومی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ان کی سماجی ، مذہبی ، اخلاقی اور تعلیمی

اصلاح کا جو بیڑہ اٹھایا علی گڑھ تحریک اس کی عملی صورت ہے۔ سرسید نے اعلیٰ اور جدید تعلیم ہی کو قوم کے مرض کا اصلی علاج قرار دیا۔ کیوں کہ سرسید غدر سے پہلے کے ہندوستانی سماج سے بھی واقف تھے اور مغربی اثرات کے ساتھ جدید دور کے گہرے نقوش بھی دیکھ رہے تھے۔ ان کی نظر غدر کے بعد کی تباہیوں پر بھی تھی اور وہ مغرب کی ترقیوں اور اس کی لائی ہوئی برکتوں سے بھی آگاہ تھے۔ وہ انگریزی سامراج کی مصلحت اندیشیوں سے بھی واقف تھے۔ان حالات کے نتیجہ میں انھوں نے ایک ایسی تحریک کی بنیاد ڈالی جس نے انیسویں صدی میں ہندوستانی مسلمانوں کو مستقبل کی طرف نئی روشنی دکھائی۔ ان کی سماجی اور تاریخی حیثیت متعین کی۔ یہ ایک ایسی ہمہ گیر تحریک تھی کہ جس نے دورِ بیداری میں آگے بڑھنا اور وقت کے تقاضوں کو پورا کرنا سکھایا۔ اس تحریک نے مسلمانوں کے واسطے آئینِ نو کی روشنی کے لیے ان کی ذہنی اور سماجی زندگی کے تمام دریچے کھول دیے۔ اس نے تہذیب و تعلیم کے ہر گوشے میں مغرب اور جدید تعلیم سے مستفید ہونا، جدید کی خوبیوں کو قدیم کے حس میں سمونا سکھایا۔ کیوں کہ انگریزوں کے اقتدار کے بعد مسلمانوں میں آگے بڑھنے کی ہمت اور صلاحیت باقی نہیں رہی تھی بلکہ یہ لوگ آگے بڑھنے سے بدکتے تھے اور پیچھے پلٹنا ان کے لئے ممکن نہ تھا۔ لیکن پھر بھی ان کے دلوں میں ماضی کی قدیم عظمت ان کی زندگی کا ایک قدیم سرمایہ بنی ہوئی تھی۔ اس کے لیے یہ لوگ اپنے ماضی پر ہی ناز کرتے رہتے تھے لیکن اس تحریک نے قدیم بندھنوں کو توڑ کر مغربی اثرات کو قبول کرنے کی دعوت دی۔ نئی تعلیم اور اس کے فوائد کو حاصل کرنے کی ترغیب دی، مادی ترقی سے بہرہ اندوز ہونے ، نیز عقلیت کی بنا پر مذہب کو سمجھنے کی کوشش کرنے کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ یہ وہ تحریک تھی جس نے پہلی بار شمال مغربی ہندوستان میں نئے مغربی علوم وسائنس کا چرچا عام کیا۔ انگریزی تعلیم کی ضرورت واہمیت سے لوگوں کو خاص کر مسلمانوں کو آگاہ کیا، اس تحریک نے مسلمانوں پر خصوصی توجہ اس لیے دی تھی کہ مسلمان اس وقت سب سے زیادہ پس ماندگی کی حالت میں مبتلا تھے۔

۱۸۵۷ء کی ناکامی نے سرسید کو اس نتیجہ پر پہنچایا کہ ہندوستانیوں کے لیے ایک ایسی درسگاہ قائم کرنی چاہیے جہاں تمام مغربی علوم اور انگریزی کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم بھی دی جائے اور مفید مشرقی علوم بھی سکھائے جاسکیں۔ جہاں تعلیم ہی نہیں ذہنی واخلاقی تربیت اور محبت واخوت کا سبق بھی دیا جاسکے۔ سرسید نے تمام قدیم رسم ورواج اور ان علوم پر بھی کھل کر تنقید کی جنھوں نے مسلمانوں کو بے حس، بے عمل بنا دیا تھا۔ انھوں نے طرح طرح سے لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اپنے اندر نئے زمانے

کے تقاضوں کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کرو، لکیر کے فقیر بن کر مت بیٹھو۔ اس طرح سرسید نے علم کے پرانے تصور کو رد کیا، ان کے ذہن میں علم قومی ترقی کا راستہ اور معاشی بہبود کا ایک ذریعہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ علم ایک ذہنی عیاشی نہ ہو، بلکہ سماج کی بہتری اس کا نصب العین اور مطمح نظر ہو۔ قدیم طریقہ تعلیم کے متعلق سرسید نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ: "مسلمانوں میں کچھ تعلیمی تحریک ہوتی ہے تو ان کی سعی ہمیشہ اسی بات پر مرکوز ہوتی ہے کہ وہی پرانا موروثی طریقہ تعلیم کا اور وہی ناقص سلسلہ نظامیہ درس کتب کا اختیار کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں اسی پرانے طریقہ پر مسلمانوں کے کئی مدرسے تعلیم کے لیے جون پور، علی گڑھ، سہارن پور، کان پور، دیوبند، دہلی ولاہور میں جاری کیے ہیں۔ میں نہایت سچے دل سے کہتا ہوں کہ وہ محض بے فائدہ اور محض لغو ہیں ان سے کچھ بھی قومی فائدہ ہونے کی توقع نہیں۔"

سرسید نے قوم کی بھلائی جدید تعلیم کو حاصل کرنے میں ہی دیکھی تھی لیکن قوم اس وقت اپنے فرسودہ رسم ورواج اور فرسودہ تعلیم کو کسی بھی طرح چھوڑنے پر راضی نہ تھی۔ سرسید نے قوم کی اس حالت پر افسوس کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا تھا کہ:"ایسے مدرسوں سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی ان کو نکالنے والا نہیں۔ ہائے افسوس! امرت تھوکتے ہیں اور زہر نگلتے ہیں۔ افسوس! ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں اور مگرمچھ کے منہ میں ہاتھ دیتے ہیں۔ مرجھائے ہوئے درخت کی جڑ میں پانی دینے کی بجائے اس کے پتوں پر پانی چھڑکتے ہیں اور سوکھے ہوئے چشموں سے نہریں کھود کر پانی لاتے کی توقع کرتے ہیں۔ پچھلا طریقہ تعلیم واقعی بہت اچھا تھا لیکن وہ تتلیاں جس ڈور سے بندھی تھیں ٹوٹ گیا اور اب دوسرا ڈور ان کے باندھنے کو ہونا چاہئے۔"

غرض یہ کہ سرسید قدیم تعلیم کے بجائے جدید تعلیم کی حمایت میں جی جان سے لگ گئے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جدید تعلیم ہی قوم کو اس تاریک گڑھے سے نکال سکتی ہے۔ علی گڑھ تحریک کے وجود میں آنے کا سب سے اہم سبب قوم کی پست حالت تھی۔ اُنیسویں صدی کی اس تحریک نے مری ہوئی قوم میں جان ڈالی۔ اس سے پہلے تمام تحریکیں خالص مذہبی تھیں لیکن علی گڑھ تحریک نے مذہب کے ساتھ ساتھ جدید تقاضوں کو بھی اپنایا۔ اس سے پہلے قوم مغربی علوم سے کوسوں دور بھاگتی تھی، کیوں کہ اس کے ذہن ودل پر قدیم تعلیم چھائی ہوئی تھی۔ لیکن سرسید نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ اس کو اس روایتی بندھن سے آزادی دلائی۔ ایک جگہ کہتے ہیں کہ:"کیا تم خیال کرتے ہو کہ ایسی کتابوں سے جن میں صرف یہ بات لکھی ہو کہ فلاں سنہ میں فلاں بادشاہ ہوا اور فلاں سنہ میں مر گیا۔ انسان کے اخلاق کی درستی اور قومی تربیت ہو سکتی ہے؟ نہیں، صاحبو! ہرگز نہیں ہو سکتی جب تک

کہ ایک قوم کے اخلاق اور اس کی بھلائیاں اور برائیاں تفصیل سے نہ بتائی جاویں اور طرح طرح کی تقریروں اور مباحثوں سے ان کی بھلائی برائی ظاہر نہ کی جاوے دل میں اثر نہیں ہوتا۔"

اودھ پنچ منظر عام پر آیا تو پورا ہندوستان اس وقت تک غلامی کی زنجیروں میں جکڑ چکا تھا۔ یہ غلامی سیاست و اقتدار کے دائرے سے نکل کر تعلیم، تہذیب اور زندگی کے چال چلن میں مغرب کی اندھی تقلید کی صورت میں ظاہر ہو رہی تھی یہ احساس عام ہو رہا تھا کہ تہذیب جس چیز کا نام ہے اس کے وارث انگریز ہیں اور ان کے مقابلے ہر ہندوستانی اجڈ اور وحشی ہے لہٰذا انھیں متمدن اور مہذب ہونے کے لیے مغربی تہذیب کو آنکھ بند کر کے اختیار کر لینا چاہیے۔

اودھ پنچ اس غلامانہ ذہنیت کا دشمن تھا۔ چوں کہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم و تہذیب کے سب سے بڑے وکیل سر سید احمد خا ں تھے۔ اس لیے اودھ پنچ سر سید اور ان کی تعلیمی تحریک کا بھی بدترین مخالف تھا اور یقیناً اس کی مخالفت میں وہ اکثر حد اعتدال سے بھی تجاوز کر جاتا تھا۔ مغربی تعلیم و تہذیب اور اس کے چرچے سے اودھ پنچ کو کتنی الجھن ہوتی تھی اس کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے کیا جاسکتا ہے۔ "تہذیب! تہذیب! تہذیب!!! سنتے سنتے کان بہرے ہو گئے ہیں۔ جدھر دیکھو تہذیب ہی تہذیب۔ اٹھنے بیٹھنے میں تہذیب، چلنے پھرنے میں تہذیب، ہگنے موتنے میں تہذیب، یاالٰہی! تہذیب کم بخت تو جان کی عذاب ہو گئی۔۔۔۔۔۔ ادھر انگریزی ہوئی اُدھر دنیا میں تہذیب پھیلی۔ شرابی مہذب، بھنگی مہذب۔ اس سرے سے اُس سرے تک سب مہذب۔ دنیا بھر میں برے فعل چاہے کیوں نہ کرے۔ تہذیب میں وہ ہی آئیں گے۔ یہ سب تو درکنار بعضے خدائی فوج دار ملکی ڈھنڈورچیوں کی تہذیب نے ناک میں دم کر دیا۔ روز نصیحت کے بہانے خدائی بھر کی آئیں بائیں شائیں بکا کرتے ہیں۔"

اودھ پنچ نے جدید تعلیم کے جن تاریک پہلوؤں کی نشاندہی کی، حیرت انگیز طور پر سر سید کی نگاہ ان کی طرف نہیں گئی۔ حالاں کہ سیّد محمد آزاد نے یہ خطوط ہندوستان میں بیٹھ کر لکھے تھے جب کہ سر سید نے تو مغربی تہذیب کا بہ چشم خود مشاہدہ کیا تھا۔ اودھ پنچ کو سر سید سے یہی شکوہ تھا کہ وہ مشرقی ہو کر مغربی تعلیم کے پرچارک بنے ہوئے تھے۔ اور اسی لیے اس کے صفحات سر سید کی اصلاحی و مقصدی تحریک کے بخیے ادھیڑنے کے لیے وقف رہے۔ ۱۸۷۷ء سے ۱۸۹۳ء تک سر سید کے خلاف نظم و نثر میں اتنا کچھ لکھا گیا کہ انھیں یکجا کیا جائے تو کئی ضخیم جلدیں مرتب کی جاسکتی ہیں۔ ان مضامین میں سر سید کو کافر، کرستان، نیچری، فریبی دھوکا باز اور گداگر تک کہا گیا سر سید نے علی گڑھ کالج کے لیے چندہ جمع کرنے کی مہم شروع کی تو اودھ پنچ نے اس کا بھی مذاق اڑایا:

"بھیک مانگنے کا نیچرل اور مہذب طریقہ

ارے کم بختو! مجھ کو روپیہ دو! ارے نالائقو! مجھ کو دو

ارے بیو قوفو! مجھ کو دو۔ ارے بے ایمانو! مجھ کو دو۔

ارے جاہلو! مجھ کو دو۔ اے کاہلو! مجھ کو دو۔ خدا کے واسطے چاہے نہ دو مگر نیچر کی خاطر تو دو" اودھ پنچ کا حلقہ احباب انگریز کو اپنا مکمل دشمن سمجھتے تھے۔ اور انگریزی تعلیم سیکھنا اپنے مذہب کے خلاف تصور کرتے تھے۔ غرض اس جدید تعلیم پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اس نے لوگوں کے اذہان تبدیل کر دیے ہیں۔ لوگ سپنسر ،مل ،ڈارون ،ہکسلے وغیرہ کے مطالعے سے جدید فلسفیانہ نظریات سے کچھ نہ کچھ واقف ہو گئے تھے۔ انگریزوں نے چونکہ انہی جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو تقرب سے نوازا تھا اور ان کے لیے نوکریوں کا بندوبست کیا تھا اس لیے ایک غریب اور مفلوک الحال معاشرے میں ان کے رعب داب کا قائم ہو جانا ضروری تھا۔ ان لوگوں نے ایسے فلسفے پڑھے جو نفع پرستی کی طرف لے جاتے تھے۔ قوم یا جماعت کی بجائے انفرادیت پر زور دیتے تھے۔ اس لیے ان کو پڑھ کر لوگ اپنے مقام اور ذات کو بلندی پر جانے کی کوششوں میں مشغول ہو گئے اور مفاد قومی کو پس پشت ڈال دیا۔ چونکہ ان تازہ واردان کو معاشرے میں انگریزوں نے مرتبہ دلوایا تھا اس لیے وہ انگریزی تعلیم و تہذیب اور معاشرے کے زبردست حامی بن گئے انگریزوں کی طرح رہتے تھے اور انگریزی بولنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ ورڈزورتھ ،شیکسپئر اور پوپ کے شعر پڑھتے تھے اور یورپی فلسفیوں کے اقوال کے حوالے دیتے تھے۔ وہ قدیم تعلیم یافتہ لوگوں کو ان پڑھ سمجھتے تھے۔ اپنے آباواجداد سے باغی تھے۔

محولہ بالا تمام نثر نگاروں نے اپنے جذبہ و احساس سودوزیاں سے بے پرواہو کر عوام کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ ان مضامین میں بے چینی اور معاشرتی بے اطمینانی کے خلاف احتجاج طنز و مزاح سے ظاہر ہوتا ہے۔ اپنی تمام تر شعوری صلاحیتں معاشرے کے سدھار اور ناروا رویوں کے خلاف شدید رد عمل میں صرف کیں۔ انھوں معاشرے کی بے راہ روی دیکھ کر دوسرے مصلحت پسند لوگوں کی طرح خاموشی اختیار نہیں کی۔ بلکہ اودھ پنچ نے اپنی دور کی منظوم تاریخ اس انداز میں رقم کی جو آج بھی اہمیت رکھتی ہے اور تاحیات مزاحمتی ادب تخلیق کر کے انصاف کی مشعل جلا کر سامراجی و آمرانہ قوتوں کا جواب دیا۔۔ فورٹ ولیم کالج سے جو تحریک اُٹھی تھی اُس کے ضمن میں بطور خاص اس بات کی کوشش کی گئی کہ علمی کھڑی بولی سے فارسی کے جزو کو کم کر کے اُسے بول چال کی زبان سے قریب تر کر دیا جائے اور نستعلیق اود دیوناگری دونوں رسم الخط استعمال کئے جائیں۔ زبان کی اس نئی نہج اور ساخت

کو اہمیت دینے کی خاطر اس کو ایک نیا نام دیا گیا یعنی "ہندوستانی"۔ زبان کے تعلق سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی پالیسی بہت جلد دی اور ہندوستانی کی بجائے انگریزی کو سرکاری زبان قرار دیدیا۔ لیکن چونکہ ہندوستانی زبان ضروریات کو پورا کرتی تھی اس لئے وہ ترقی کرتی گئی اور نستعلیق و دیوناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جاتی رہی۔ روز افزوں برطانوی تسلط نے ہندوستانی ثقافت میں ایک بحرانی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ شمالی ہند کے ہندوستانی مشترکہ کلچر کو جس کی پرورش و پرداخت مغلوں نے کی تھی۔ یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ وہ ختم ہو جائے گا اور انگریزوں کی لائی ہوئی مغربی تہذیب اس کی جگہ لے لی۔ اس احساس کا ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں پر گہرا رد عمل ہوا۔ "ان میں سے بعض لوگ اور خاص طور پر مسلمان بزرگوں نے یہ بالکل صحیح سوچا کہ انگریزی تہذیب کے تسلط کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنی روحانی اور اخلاقی مدافعانہ قوت کو قوی سے قوی تر کرنا ضروری ہے اور اس غرض کے لئے انہیں چاہیے کہ اپنے مذہبی اور ثقافتی احساس کے ماخذوں کی طرف رجع ہو کر ان سے تازہ قوت اور فیض حاصل کریں۔ اس میں انہیں کامیابی ہوئی۔ لیکن اپنے دماغ کو ماضی بعید کی طرف رجوع کرنے کا ایک ناخوشگوار نتیجہ یہ بر آمد ہوا کہ ماضی قریب اور اس کے قابل ورثہ، یعنی ہندوستانی تہذیب اُن کی نظروں سے اوجھل ہو گئی اور تھوڑے عرصہ اُس مشترکہ کلچر کو جو سلطنت مغلیہ کے عروج کے زمانہ میں ہندو مسلم تہذیب کے ملاپ سے بنا تھا بجز چند مسلمانوں اور ہندوؤں کے سب نے ترک کر دیا اور وہ اس حالت کو پہنچ گیا کہ اپنے اجزائے ترکیبی میں تحلیل ہو کر رہ جائے۔

ثقافتی افتراق کا یہ رجحان سب چیزوں سے زیادہ زبان میں ظاہر ہوا۔ بول چال کی زبان آسانی سے نہیں بدلتی لیکن علمی زبان ثقافتی گروہ بندیوں اور تبدیلیوں کے رجحانات کا اثر قبول کرنے میں بڑی حساس واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ ہندوستانی تحریری زبان نے دو متخالف رجحانات ظاہر کرنا شروع کر دیا۔ بہت سے ہندو کھاری بولی ہندوستانی کو بجائے نستعلیق کے دیوناگری رسم الخط میں لکھنے لگے اور جہاں تک ممکن ہو سکا اس میں سے عربی اور فارسی کے الفاظ حذف کر کے ان کی جگہ سنسکرت الفاظ ٹھوس دیئے۔ البتہ بعض ہندو اور بہت سے مسلمان نہ صرف نستعلیق رسم الخط پر جمے رہے بلکہ عربی اور فارسی الفاظ کثرت سے استعمال کرنے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی زبان پھر سے اُردوئے معلیٰ اور بلند پایہ اُردو ہو گئی۔ اس طرح زبان کے تقابلی مطالعہ کی تاریخ میں ایک عجیب صورت حال یہ پیدا ہو گئی کہ رسم الخط کے اختلاف اور مغلق الفاظ نے ایک ہی زبان کو عملاً دو زبانوں یعنی ہندی اور اردو میں تقسیم کر دیا۔

اودھ پنچ غالباً اردو کا پہلا مجلہ ہے جس میں مزاحیہ کالم کو شامل کیا گیا تھا۔ اس مجلہ نے اس کالم کے ذریعہ انگریزی تہذیب و تمدن اور غیر ملکی حکومت کے ظلم وزیادتی کی طرف تلخ وشیریں انداز میں انگشت نمائی کی اور عوام کو اجنبی حکومت اور اجنبی تہذیب سے ہوشیار کرنے کی کوشش کی۔ اودھ پنچ نے انگریزی زبان کے اخبارات کے تتبع میں یہ کالم شروع کیا اور کمال یہ کیا کہ صحافتی طنز کے لئے مغربی طنز و مزاح کے حربوں جیسے مبالغہ، موازنہ، لفظی بازیگری وغیرہ کو استعمال کیا۔ اودھ پنچ کے روح رواں سجاد حسین نے اردو صحافت میں پہلی بار فکاہیہ کالم شروع کیا۔ اور اپنے بیباک قلم کی شوخ تحریروں کے ذریعہ اس وقت کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی اقدار کی خرابیوں پر طنز کیا۔ اس وقت طنز و مزاح کا معیار بہت بلند نہیں تھا نیز ادبی چاشنی کی بھی ایک حد تک کمی تھی لیکن اودھ پنچ کی اہمیت کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔

اودھ پنچ کا دور تہذیبی تصادم کا دور تھا۔ مغربی اور مشرقی تہذیبیں باہم ٹکرا رہی تھیں۔ انگریز ملکی سیاست پر چھا رہے تھے اور انگریزی تہذیب رفتہ رفتہ ہر چیز پر چھاتی جا رہی تھی۔ مشرق کے زوال کی وجہ سے ہر مشرقی چیز مفتوح اور زوال پذیر نظر آتی تھی۔ ہر مغربی چیز کے لیے رغبت اور مشرقی چیز کے لئے بیگانگی پائی جاتی تھی۔ اودھ پنچ اس صورت حال میں سامنے آیا۔ اس نے ایک طرف تو مشرق کی برائیوں اور ان کے اسباب کے خلاف بات کی اور دوسری جانب مغرب کی سطحی تقلید اور پرستش کے خلاف آواز بلند کی۔ اودھ پنچ نے یہ کام طنز اور ظرافت کے پیرائے میں کیا۔ البتہ یہ کہا گیا کہ اودھ پنچ کے حربے اوچھے تھے۔ اس کا مزاح پھبتی اور ہجو پر مبنی اور اخلاقیات کی حدود سے باہر تھا۔ یہ بھی کہا گیا کہ اودھ پنچ کے مزاح کا معیار اعلیٰ نہ تھا۔

نواب سید محمد آزاد اودھ پنچ کے مستقل مضمون نگار تھے ان کے اسلوب میں تازگی اور شگفتگی تھی۔ طنز بھی دوسرے ہمعصروں کے مقابلے میں زیادہ گہرا تھا۔ مغربی تہذیب اور اقدار کے خلاف آپ نے قلمی جہاد کیا۔ ان کی تحریر میں پختگی اور شگفتگی ہے۔ ان کی تحریر دیکھیے: لندن کی عورتیں اپنے شوہروں کو وطن میں چھوڑ کر عجائبات روزگار دیکھنے دور دراز ملکوں میں چلی جاتی ہیں اور اپنے تجربے کو پختہ کرتی ہیں۔ بُرے بُرے لال کلے اور سفید کلے والے سفیروں سے ڈٹ کر ہاتھ ملاتی ہیں۔ کسی کے مر جانے سے برسوں لباس سیاہ پہن کر پیتی، کھاتے، ناچتی، گاتی اور اس کی روح کی دعوت میں مصروف رہتی ہیں۔ عمر بھر پار سا بن کر گرجوں میں پادری صاحبوں کے ہاتھ پر صبح وشام توبہ کرتی ہیں۔ اگر میں تم کو ساتھ لاتا تو سارا لندن تمہارا تماشہ دیکھتا۔"

تعلیمی اثر کسی قوم کے تہذیب و تمدن کے اظہار اور اشاعت کے لئے اس کا ادب ہی ایک موثر ذریعہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں مغربی خیالات کو عام کرنے میں مغربی طریقہ تعلیم کا رواج بہت معاون و مفید ثابت ہوا۔ جب کہ بنگال میں انگریزوں

کا اقتدار قائم ہوا تو ہندوستان کی قدیم تہذیب تقریباً معطل ہو کر رہ گئی تھی۔ اعلیٰ تعلیم سنسکرت، عربی اور فارسی زبانوں میں دی جاتی تھی چونکہ ان زبانوں کا عام زندگی سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اس لئے ادب میں ترقی کی بجائے باریک بینی اور نازک خیالی کو زیادہ فروغ ہوا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا طریقہ تعلیم بالکلیہ غیر استدلالی اور روایتی علم دینیات پر صلاحیتیں پر مبنی تھا اور اسے مسلمہ حیثیت حاصل تھی۔ اس کی وجہ سے ہندوستانی طلباء کی تخلیقی صلاحیتیں مفلوج ہو کے رہ گئی تھیں اور آزادانہ تخلیق و تحقیق اور ترقی پذیر تبدیلیوں کی روح مفقود ہو گئی تھی۔ مختصر یہ کہ اس وقت کا نظام تعلیم یورپ کے دور وسطیٰ کے نظام تعلیم کے بالکل مشابہ تھا۔ اکثر انگریزوں کا خیال تھا کہ ہندوستانی سماج میں جو برائیاں پھیلی ہوئی ہیں وہ محض جہالت کی وجہ سے ہیں اور یہ صورت انگریزی تعلیم سے دور ہو سکتی ہیں۔ اسی بناء پر انگریزوں نے انگریزی نظام تعلیم رائج کرنے کا فیصلہ کیا تا کہ عوام کو نئے تصورات سے روشناس کیا جا سکے۔ ان پر جوش یوروپینوں کو بنگال کے مصلح اعظم راجہ رام موہن رائے اور ان کے بعض ساتھیوں کی تائید حاصل تھی۔ ان کے بر خلاف مستشرقین کی اکثریت ہندوستان کی قدیم (کلاسیکل) زبانوں ہی کو نظام تعلیم کے لئے ضروری خیال کرتی تھی۔ بالآخر اس تمام تنازعہ کو لارڈ میکالے نے اپنی مبصرانہ مگر یکطرفہ رپورٹ کے ذریعہ حل کر دیا۔ اس رپورٹ میں اعلیٰ تعلیم کے لئے انگریزی کو ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا۔ چنانچہ ۱۸۳۵ء میں یہ طے پایا کہ ہندوستانی عوام میں یورپی علم و ادب اور سائنس کی اشاعت و ترویج کے لئے وہ ساری رقم صرف انگریزی نظام تعلیم پر صرف کرنے کا فیصلہ کیا جائے جو ہندوستان میں تعلیم کے لئے مختص کی گئی تھی اس کے ساتھ ہی ۱۸۴۴ء میں سرکاری ملازمتوں کے لئے صرف ایسے ہی اشخاص کو منتخب کرنے کا فیصلہ کیا گیا جو مغربی تعلیم سے پوری طرح آشنا اور انگریزی زبان سے کماحقہ واقف ہوں۔

سید اکبر حسین کو اکبر تخلص کیا کرتے تھے۔ مغربی تہذیب کے دوسرے بڑے نقاد تھے مغربی تہذیب کی مذمت کرتے ہوئے اسے بالکلیہ "مادی" قرار دیتے ہیں۔ بقول ان کے وہ زمانہ گزر گیا جب کہ لوگ اپنے دلوں ہی میں خدا کے نور کو ڈھونڈا کرتے تھے۔ اب تو وہ یہ دیکھتے ہیں کہ اُن کی ہڈیوں میں کتنا فار سفورس ہے۔ مغرب کے ترقی یافتہ تصورات کی مذمت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں "شیطان نے انسان کو شکست دینے کے لئے ایک نیا طریقہ ایجاد کیا ہے۔ وہ کہتا ہے انسان کو "ترقی" کی چاٹ لگا دینی چاہیے۔

اودھ پنچ منظر عام پر آیا تو پورا ہندوستان اس وقت تک غلامی کی زنجیروں میں جکڑ چکا تھا۔ یہ غلامی سیاست و اقتدار کے دائرے سے نکل کر تعلیم، تہذیب، اور زندگی کے عام طور طریقوں میں مغرب کی اندھی تقلید کی صورت میں ظاہر ہو رہی تھی۔ یہ احساس عام ہو رہا تھا کہ تہذیب جس چیز کا نام ہے اس کے وارث انگریز ہیں اور ان کے مقابلے پر ہندوستانی اجڈ اور وحشی ہیں۔ لہٰذا انھیں متمدن

اور مہذب ہونے کے لئے مغربی تہذیب کو آنکھ بند کر کے اختیار کر لینا چاہئے۔ اودھ پنچ اس غلامانہ ذہنیت کا دشمن تھا۔ چوں کہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم و تہذیب کے سب سے بڑے وکیل سر سید احمد خان تھے۔ اس لئے اودھ پنچ سر سید اور ان کی تعلیمی تحریک کا بھی بدترین مخالف تھا۔ اور یقیناً اس مخالفت میں وہ اکثر حد اعتدال سے بھی تجاوز کر جاتا تھا۔ مغربی تہذیب اور اس کے چرچے سے اودھ پنچ کو کتنی الجھن ہوتی تھی اس کا اندازہ ذیل کت اقتباس سے کیا جاسکتا ہے: تہذیب! تہذیب!! تہذیب!!! سنتے سنتے کان بہرے ہوگئے ہیں۔ جدھر دیکھو تہذیب ہی تہذیب۔ اٹھنے بیٹھنے میں تہذیب، چلنے پھرنے میں تہذیب، ہگنے موتنے میں تہذیب، یا الٰہی! تہذیب کم بخت تو جان کی عذاب ہو گئی۔۔۔ ادھر انگریزی ہوئی ادھر دنیا میں تہذیب پھیلی۔ شرابی مہذب، بھنگیری مہذب۔ اس سرے سے اس سرے تک سب مہذب۔ دنیا بھر میں بڑے فعل چاہے کیوں نہ کرے۔ تہذیب میں وہ ہی نہیں آئیں گے۔ یہ سب تو درکنار بعضے خدائی فوج دار ملکی ڈھنڈورچیوں کی تہذیب نے ناک میں دم کر دیا۔ روز نصیحت کے بہانے خدائی بھر کی آئیں بائیں شائیں بکا کرتے ہیں۔ " اودھ پنچ اور اس کے طنز نگاروں نے مغربی تہذیب اور اس کی چمک دمک کے کھوکھلے پن کو عیاں کرنے کے لیے طنز کے تمام ہتھکنڈے آزمائے۔ نواب سید محمد آزاد جو اودھ پنچ کے مستقل لکھنے والے تھے اور " مغربیت " سے سخت متنفر اودھ پنچ کو سر سید کی مغربیت پر ایک زبردست اعتراض یہ بھی تھا کہ وہ مغربیت کے زیر اثر دینی عقائد میں تحریف کے مرتکب ہوئے تھے اور دین کی ایسی تفسیر و تعبیر پیش کر رہے تھے جو مسلمانوں کے لیے کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتے تھے

دوسرا اہم مسئلہ جس کی طرف فوری توجہ کی ضرورت تھی۔ وہ تعلیم نسواں کا تھا۔ جس کی حالت بہت قابل افسوس تھی۔ ۱۸۳۵ء تک بھی خواتین کی تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گی۔ اس میں ولیم آدم اپنی ایک رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ درحقیقت ہندو خاندان کی اکثریت میں یہ احساس عام تھا کہ کسی لڑکی کو لکھانے اور پڑھانے سے وہ بہت جلد بیوہ بن جاتی ہے۔ اس وہم کو دراصل ہندو خواتین نے ہی پروان چڑھایا تھا جس کی تائید ہندو مردوں نے بھی کی۔ یہ بھی خیال عام تھا کہ لڑکیوں کو خط و کتابت کرنا آجائے تو وہ اپنے آشناؤں سے خط و کتابت کا مذموم عمل اختیار کر سکتی ہیں۔ مسلمانوں نے تعلیم نسواں کی مخالفت میں ہندوؤں کے ان خیالات سے پورا پورا اتفاق کر لیا تھا۔ تعلیم نسواں کے پرجوش حامیوں نے ان مخالف حالات میں بڑی ہمت اور حوصلے سے کام لے کر ہر قسم کی مخالفت، نفرت، مضحکہ انگیزی اور تنقید و تعریض کی پرواہ کئے بغیر تعلیم نسواں کو پھیلایا۔ اس دور میں عیسائی مبلغین نے بھی اور لوگوں کے مقابلے حتیٰ کہ حکومت کے مقابلے میں بھی اس معاملے میں نمایاں خدمت انجام دی ہے۔ گزشتہ تیس چالیس برس میں

تعلیم نسواں میں غیر معمولی ترقی ہوئی اور تعلیم کے مختلف میدانوں میں عورتوں کو ممتاز مقام حاصل ہوا۔ اس طرح خواتین کے راہ ترقی پر گامزن ہو جانے کے بعد دیگر معاملات اور مسائل میں ترقیوں کے لئے صرف وقت ہی کا سوال باقی رہ گیا۔ تعلیم نسواں کے عام ہونے کے ساتھ ہی کم عمری کی شادیوں اور طفل کشی پر پابندی عائد کر دی گئی۔ پردہ بھی آہستہ آہستہ ترک ہو گیا۔ کثرت ازدواج کو غیر قانونی قرار دیدیا گیا۔ خاندانی جائداد میں عورتوں کو حقدار تسلیم کر لیا گیا اور انھیں قانوناً طلاق کا حق بھی حاصل ہو گیا۔ آج کل ہندوستانی خواتین کو وہ تمام حقوق حاصل ہو گئے ہیں جو صرف مردوں کو حاصل تھے۔ اور اس طرح قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں بھی وہ مردوں کے دوش بدوش اپنے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ سید ستار حسین عثمانی کی تحریروں میں بھی طنز و مزاح کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ ''منطق آرا بیگم بنام مسٹر چرچل'' میں مغربی تہذیب پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''مردوں کے واسطے نیم برہنہ یعنی آدھے ڈیل سے ننگا ہونا کوئی عیب نہیں۔ یورپ میں تو آج کل تہذیب نے اتنی ترقی کی ہے کی عورتیں بھی جامے سے باہر پڑی پھرتی ہیں چتھڑا تک ڈیل پر نظر نہیں آتا، جتنی چھپانے کی چیزیں ہیں سب اللہ رکھے ہوا اور دھوپ کھاتی پھرتی ہیں۔''

اودھ پنچ کی مخالفت کے نتیجے میں جو ادب وجود میں آیا، اس نے ادب میں انفرادیت، انانیت، مزاج کی رنگینی اور نفاست و لطافت کا آغاز کیا۔ اس ادب میں مغرب پرستی کی پرُزور طریقے سے تبلیغ کی گئی۔ اس میں عشق و محبت کی آزادی، ازدواجی شادی کے لیے خاندان کے بزرگوں کی متابعت سے انکار اور عورتوں کی تعلیم پر سماجی پابندیوں کے خلاف سخت احتجاج کیا گیا۔ اودھ پنچ نے ایسی ہی مغربی تہذیب کے خلاف آواز اٹھائی۔ مصنف لکھتا ہے:''عورتیں جب تک پردے سے نہ نکلیں گی ہم مہذب نہیں ہو سکتے گویا انکے پاس مہذب بن جانے کا ڈپلومہ آگیا ہے۔ صرف فیس بے پردگی کی باقی ہے وہ داخل ہوئی اور تہذیب کا سرٹیفکیٹ بغل میں۔'' اودھ پنچ انگریزیت کے سخت خلاف تھے اس لیے مغربی معاشرے کی کمزوریوں اور خامیوں کو بے نقاب کرنے کے لیے ان تحریروں کا سہارا لیا۔ اس مضمون ''قحط ردوں کو خوشخبری'' میں عورتوں کی مغربی آزادی کے بارے میں یوں ارقام کیا گیا ہے۔ ''آج کل جب ہندوستان میں اس سرے سے اُس سرے تک گرانی قحط اور فاقہ کشی سے چل پُون مچی ہوئی ہے۔ ہزار جندگان خدا فاقوں مرے جاتے ہیں اور قریب ہے کہ آدمی آدمی کو کھانے لگے یہ مردہ امریکہ اور بصرے کے گیہوں کی آمد سے کم نہیں کہ فرانس کی ایک کمیٹی کی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ مرد کی نسبت عورت کا گوشت مزیدار ہوتا ہے۔''

غرض کی نئی تعلیم کے اثر و نفوذ، مواصلاتی وسائل کے پھیلاؤ معاشی ڈھانچہ کی تنظیم جدید اور مغربی تصورات کی روز افزاں اشاعت نے ہر شعبہ حیات میں ایک انقلابِ عظیم برپا کر دیا۔ ان تمام تبدیلیوں کے علاوہ عوام کے ذہنی شعور نے بھی سائینٹیفک اور ترقی

پذیر اندازِ فکر اختیار کیا۔ انھوں نے قدامت پسندی کا لبادہ اتار پھینکا اور وہ ترقی و کامیابی کی نئی راہوں پر گامزن ہو گئے۔اودھ پنچ نے نئے نقطہ نظر کے مغربی تصورات اور ہندستان کی روحانی اقدار کے تصادم کی بھرپور مزاحمت کی۔ جس نے ایک اہم ورثہ کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔

سر سید نے مسلمانوں کو جو اپنے ہم وطن بھائیوں سے تعداد میں، تعلیم و تربیت میں اور دولت و عزت میں ہر لحاظ سے کم تھے، انھیں زیادہ سے زیادہ سیاست سے دور رہنے کی نصیحت و تلقین کی اور مفاہمتی راستہ اپنایا۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۸۶۶ء میں سر سید نے اسی ایسوسی ایشن سے نکالا، یہ ان کے آخر دم تک جاری رہا۔ شروع میں اس میں زیادہ تر سیاسیات سے متعلق ہی مضامین لکھے جاتے تھے۔ اس اخبار کا مقصد ہندوستانیوں کو انگریزوں کی پالیسیوں وغیرہ سے اور انگریزوں کو ہندوستانی عوام کے حالات وغیرہ سے آگاہ کرنا تھا۔ اس اخبار کی خوبی یہ تھی کہ اس کا ایک کالم انگریزی میں اور ایک اردو میں ہوتا تھا۔ سر سید نے ہر طرح سے مسلمانوں اور انگریزوں کو قریب لانے اور مفاہمتی رویہ اختیار کروانے کی کوشش کی۔ اس میں سوشل، اخلاقی اور پولیٹیکل مضامین برابر چھپتے تھے۔ اس کی آواز اور اخباروں کی طرح معمولی نہ تھی، بلکہ اس کی آواز حکمران اور عوام دونوں کے لیے ہی قابل توجہ تھی۔ کتاب 'پلرز آف دی انڈین امپائر' کا مصنف اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ: علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ سے جو مسلمانوں کا خاص آلہ ہے اگر پچھلے سال کے مضامین جمع کیے جائیں تو ہندوستان کے قابل اور معزز مسلمانوں کی رائے کا اگرچہ وہ تعداد میں کم ہیں، ایک عجیب اور مفید مجموعہ جنگ روم و روس اور روس و افغانستان اور روس و ہندوستان کے بن جائے گا۔

اتنے لمبے عرصے تک جاری رہنے کی وجہ اس کی کچھ خصوصیات تھیں مثلاً اس نے کبھی کسی کی دل آزاری نہیں کی، سنجیدگی اور متانت سے کام لیا۔ قوم کی نسبت دوستی یا خیر خواہی کے خلاف کبھی ایک حرف نہیں لکھا۔ غیر قوم کے عہدہ داروں کی ترقی سے ناراضگی ظاہر نہیں کی، کبھی ہندو یا مسلم ریاست کے خلاف نہیں لکھا، کبھی ہندو مسلم تعصبات کو بڑھاوا نہیں دیا، ہمیشہ غیر جانب داری سے ہی کام لیا۔ حالاں کہ یہ گورنمنٹ اور اس کے مدبروں پر نکتہ چینی کرتا تھا لیکن تہذیب و تمیز کو ہمیشہ ملحوظ رکھتا تھا۔ اس کی خبروں کا ماخذ ہمیشہ معتبر اور مستند اخبار رہے۔ ہر ایک واقعہ کو پوری دیانت کے ساتھ شروع سے آخر تک مسلسل بیان کرتا تھا۔ اس کی باقاعدگی کا یہ عالم تھا کہ وہ بتیس سال تک برابر جاری رہا۔

علی گڑھ تحریک کے محدود مقاصد کے پیش نظر سر سید احمد خان ملک کے سیاسی مسائل کی جانب بھی اپنے رویے کو محدود کرنا پڑا۔ ان کے سیاسی نظریے میں تنگ نظری کا عنصر شامل ہو گیا۔ ۱۸۸۵ء میں کانگرس کے قیام کے بعد کئی سال سر سید خاموش رہے۔

۱۸۸۷ء میں لکھنو میں محمڈن نیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسے میں انھوں نے اپنی پہلی مخالف تقریر کی۔ انھوں نے اس تقریر میں کہا۔ ''آپ خیال کریں کہ وائس رائے کے ساتھ کونسل میں بیٹھنے کے لئے واجبات سے ہے کہ ایک معزز شخص ملک کی معزز شخصیتوں میں سے ہو۔ کیا ہمارے ملک کے رئیس اس کو پسند کریں گے کہ ادنیٰ قوم یا ادنیٰ درجہ کا آدمی خواہ اس نے بی۔ اے کی ڈگری لی ہو یا ایم اے کیا اور گو وہ لائق بھی ہو ان پر بیٹھ کر حکومت کرے۔ ان کے مال و جائیداد اور عزت پر حاکم ہو۔ کبھی نہیں کوئی ایک بھی پسند نہیں کرے گا۔ گورنمنٹ کی کونسل کی کرسی نہایت معزز ہے۔ گورنمنٹ مجبور ہے کہ سوائے معزز کسی کسی کو بھی نہیں بٹھا سکتی اور نہ وائسرائے ان کو مائی کولیگ یا مائی آنرایبل کلیگ کہہ سکتا ہے۔ نہ شاہانہ ڈنروں میں اور اور شہنشاہی جلسوں میں جہاں ڈیوک اور ارل بڑے بڑے معززین شامل ہوتے ہیں بلایا جاسکتا ہے۔ سرسید کے ان خیالات کے پیش نظر پروفیسر شان محمد کہتے ہیں کہ سرسید کا نظریہ رجعت پسندانہ تھا''

سرسید احمد خاں سوچتے تھے کہ سیاسی اختیارات صرف امرا اور رؤسا کے ہاتھ میں رہنا چاہیے۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ سرسید کو یہ معلوم نہ تھا کہ برطانوی حکمران سب کے سب اس طبقے سے تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ متوسط طبقے کے لوگ تھے۔ وہ صرف اس بات سے مطمئن تھے کہ انھیں اس بات کا علم نہیں کہ انگریز حکمران لارڈ یا ڈیوک خاندان یا پھر درزی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ انھوں نے صرف کونسل کے منتخب شدہ ممبروں کی توسیع کی مخالفت کی بلکہ کانگریس کی دوسری مانگ کہ سول سروس کا امتحان انگلستان کی طرح ہندوستان میں بھی ہوا کرے، مخالفت کی۔ ظاہر ہے ہند تعلقدار رئیس اور راجا سرسید کے ہم خیال تھے کیونکہ انھیں جمہوری نظام سے خطرہ لاحق تھا۔ برطانوی اقتدار پسند طبقہ کانگریس کو ایک بہت بڑا خطرہ سمجھتا تھا۔

سرسید احمد کی پالیسی کانگرس کے قیام ۱۸۸۵ء تک صحیح تھی۔ مگر ایک ترقی پسند قوم کے لیے یہ پالیسی نہ تو آخری مقصد ہوسکتی ہے اور نہ ہی اس کو ہمیشہ اپنایا جاسکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں کی اکثریت نے اُن کی پالیسی پر عمل نہیں کیا۔ بدرالدین طیب جی نے جو خود امیر طبقے سے تعلق رکھتے تھے شروع ہی سے سرسید کو خطوط لکھے کہ وہ اپنی اس پالیسی کو چھوڑ کر کانگرس میں شامل ہو جائیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد عموماً تمام ہندوستانی سیاسی اعتبار سے انگریزوں کے غلام ہو گئے تھے۔ سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کو انگریزوں کا ذہنی طور پر غلام ہونے کی مہم چلائی۔ انھوں نے علی گڑھ تحریک چلانے میں ایک متوازن راستہ نہیں اپنایا وہ انگریزی اور مغربی تعلیم کا فروغ ضرور کرتے مگر ادارے کو حد سے زیادہ انگریزوں اور برطانوی سرکار کے اثر میں نہ رکھتے۔ یہی وجہ تھی کہ سرسید احمد خان کی

انتھک محنت کے باوجود اُن کی زندگی ہی میں علی گڑھ تحریک کے حامی دو گروپوں میں منقسم ہوگئے۔ ایک گروپ سرسید کی سیاسی علیحدگی کی پالیسی اور رجعت پسندی کو خیر باد کہہ کے قومی سیاست میں بھی شامل ہوگئے۔

منشی سجاد حسین سرسید احمد خان اور ان کی تحریک علی گڑھ کے روزِ اول ہی سے سخت مخالف تھے۔ کانگرس کے قیام کے دو برس بعد ۱۸۸۷ء میں کانگرس کے رکن بنے اور آخر عمر تک اسی کے حامی رہے۔ منشی سجاد حسین مغربی تہذیب اور معاشرے میں اس کے بڑھتے ہوئے اثرات کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ گویا معاشرتی اعتبار سے وہ قدامت پرستی کے زیادہ قریب تھے۔ منشی سجاد حسین فطرتاً نڈر اور بیباک تھے۔ ان کی اس بیباکی کی جھلک اودھ پنچ کی پالیسی میں بھی نظر آتی ہے۔ طنز و ظرافت ان کا اسلوب نگارش ٹھہرا تھا۔ "موافقت زمانہ" اپنے عہد کا بہترین سیاسی طنزیہ تھا۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام منشی سجاد حسین کی طنز نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں: "منشی حسین کا سیاسی طنز دلچسپ ہے مگر سطحی ہے۔ وہ محاورات سے ظرافت پیدا کرتے ہیں۔ واقعہ اور خیال ہے کم مگر کہیں کہیں ان کی طبعی خوش دلی طنز میں وہ شادابی اور جدت پیدا کر دیتی ہے کہ دھوپ میں بوندیں پڑنے کا سماں دکھائی دیتا ہے"۔

منشی سجاد حسین کے نزدیک ہندوستان اور ہندوستانیوں کی غلامی ایک ذلیل ترین حقیقت تھی جسے وہ کسی صورت میں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اور چوں کہ کانگریس قومی اتحاد کے نعرے کے ساتھ میدان سیاست میں اتری تھی اور بتدریج حکومت خود اختیاری کے مطالبے کی جانب بڑھ رہی تھی لہٰذا کانگریس کے قیام کے دو سال بعد انھوں نے باقاعدہ کانگریس میں شمولیت اختیار کرلی۔ اودھ پنچ کا جھکاؤ بھی واضح طور پر کانگریس کے حق میں ہوگیا۔ حالاں کہ اس زمانے میں مسلمان سرسید کی قیادت میں کانگریس سے بالکل الگ تھلگ تھے۔ لیکن منشی سجاد حسین کو بھلا یہ کیسے گوارا ہو سکتا تھا کہ وہ سرسید کی کانگریس سے علیحدہ رہنے کی ہدایت کو قبول کرلیتے۔ انھوں نے نہ صرف کانگریس کی کھل کر حمایت کی بلکہ لکھنؤ میں کانگریس مخالف جلسوں کو ناکام بنانے کے لیے اودھ پنچ کو پوری قوت سے استعمال کیا۔ اس طرح مسلمانوں کے اخبارات میں اودھ پنچ واحد اخبار تھا جس نے کانگریس کی پشت پناہی کی۔ ۳۰ دسمبر ۱۸۹۹ء کو لکھنؤ میں کانگریس نے جلسے کے انعقاد کا اعلان کیا۔ کانگریس کے مخالف مسلمانوں نے اسے ناکام بنانے کے لیے اپنے ایک الگ جلسے کا منصوبہ بنایا۔ اس کے اشتہار چھاپے گئے۔ اشتہار میں ایک جملہ یہ تھا کہ "اس جلسے میں مع اعزا واحباب کے شرکت فرمائیں اور گورنمنٹ کے خیر خواہ بنیں"۔ منشی سجاد حسین کو موقع مل گیا۔ انھوں نے "انڈے بچے والی چیل چلہار" کے عنوان سے ایک کالم لکھ کر جلسے کے منتظمین کا خوب مذاق اڑایا۔ کالم میں کہا گیا: بھلا یہ کیوں کر ممکن ہے کہ بی

کانگریس صاحبہ لکھنؤ مرحوم میں جان تازہ پھونکیں، چہرے کی رونق بڑھانے خراماں خراماں تشریف لائیں اور بی انتی صاحبہ چپ شاہ کی بالکی نمو ہی بنی، منھ میں گھنگھنیاں بھرے بیٹھی رہیں۔ اجی تو یہ کیجئے بولیں اور بیچ کھیت بولیں جیسے ارہر کے کھیت میں پنہدیت بٹیر، بلکہ گلا پھاڑ کے غل مچا کے، سارا شہر سر پر اٹھا کے جس میں یہاں سے لندن تک خبر ہو جائے کہ لکھنؤ میں بھی کچھ انتی بھائی ہیں۔

سر سید کی شخصیت پر کئی اعتراضات کیے جاتے ہیں کبھی انھیں نیچری کہا گیا، کبھی انگریزوں کا پٹھو اور کئی لوگوں نے ان پر کفر کے فتوے تک لگا دیئے۔ علی گڑھ کے لئے چندہ جمع کرنے پر بھی بہت طنز کا نشانہ بنایا گیا۔ ''بنا کر فقیروں کا اب بھیس سید تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں'' مضمون میں اسی بارے میں ہی بیان کیا گیا ہے۔ ''ہمارے سر سید گلے میں جھولی ڈال جیلوں کو ساتھ لے دکن دکن کیطرف گداگری کے واسطے نکلنے والے ہیں خدا اس فقیر کی جھولی کو طرح طرح کے ٹکڑوں سے بھرا پڑا واپس لائے۔''

اودھ پنچ کی سیاسی خدمات قابل ذکر ہیں اودھ پنچ شروع سے رعایا کا خادم اور سرکار کا آزاد مشیر تھا۔ کانگریس کے پہلے جو پولیٹیکل معرکہ آرئیاں پیش آئیں۔ ان میں اس نے ہمیشہ رعایا کا ساتھ دیا۔ ''تو اسکے معنے یہ ہونگے کہ گورنمنٹ کی حکومت جابرانہ ہے ناگوار ہے اور ملک اس حکومت کا متحمل نہیں ہو سکتا انجام یہ ہو گا کہ ملک تباہ ہو جائیگا۔'' اودھ پنچ نے بہترین اپوزیشن کا کردار ادا کیا اور ہمیشہ سر سید کے مفاہمت پسند رویہ پر مزاحمت کی۔

اودھ پنچ کا رویہ ہمیشہ مزاحمتی رہا ہے جس کی موافقت اور مخالفت دونوں نے ہی اردو ادب کو آسمان تک پہنچا دیا، کیوں کہ مخالفت نے اس کی ہیئت کو یکسر تبدیل کر دیا تھا۔ مخالفت نے ادب کے اصولوں کے بجائے نئے نئے معیار متن کیے۔ ترنم کے نئے اسالیب تراشے، ناول، کہانی، ڈرامے، افسانے اور طنزیہ و مزاحیہ مضامین وغیرہ میں نئے نئے طریقے ایجاد کر کے موضوع اور مواد کے ڈھانچے کو بھی تبدیل کر دیا۔ لہٰذا اودھ پنچ کی مخالفت نے اردو ادب میں ایسے ایسے ادیب و انشا پرداز اور شاعر پیدا کیے جنھوں نے اردو ادب میں کچھ اور نئے نئے شگوفے کھلائے۔

نثر نگاروں نے اودھ پنچ میں مزاحمتی رویہ اپنا کر اپنی تصانیف سے اردو ادب کو وسیع سے وسیع تر کر دیا۔ چنانچہ مخالفت کے نتیجے میں جو ادب وجود میں آیا اس میں افادیت اور مقصدیت سے زیادہ ادب کے جمالیاتی پہلوؤں پر توجہ دی گئی۔ اسلوب کی رنگینی، نفاست و لطافت، بیان کی شگفتگی اور تفریحی موضوعات کی شمولیت پر زور دیا گیا لیکن یہ بھی ایک لحاظ سے ادب کی وسیع تھی جو اودھ پنچ کی

مزاحمت کے نتیجے میں سامنے آئی۔ اردو کی دیگر ادبی تحریکات پر بھی اودھ پنچ کا اثر کسی نہ کسی لحاظ سے ضرور پڑا ہے۔ لہذا کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد اردو نثری ادب کا سرمایہ کسی نہ کسی طور سے اودھ پنچ کے مزاحمتی رویہ کا ہی مرہون منت ہے۔

کتابیات وماخذات

کتابیات وماخذات

اودھ پنچ، لکھنو۔

آرارا، روشن۔ مجلاتی صحافت کے ادارتی مسائل۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۹ء

آصف، ڈاکٹر محمد۔ اسلامی اور مغربی تہذیب کی کشمکش۔ ملتان: بہاالدین زکریایونی ورسٹی، ۲۰۰۹ء

آغا، وزیر۔ اردو ادب میں طنز و مزاح۔ علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاوس، ۱۹۹۰ء

آفتاب، مسز۔ اردو نثری ادب میں طنز و مزاح کی روایت اور فن۔ اسلام آباد: ایچ ای سی، ۲۰۰۶ء

آگرو، غلام ربانی۔ مرتب۔ بھارت میں اردو۔ ایک جائزہ۔ اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۷۸ء

ارشد نعیم، خالد ندیم۔ اردو ادب بیسویں صدی میں۔ لاہور: عبداللہ برادرز

اردو دائرہ معارف اسلامیہ (جلد سوم)۔ لاہور: دانش گاہ پنجاب، ۱۹۶۸ء

احمد، رشید۔ مرتب۔ پاکستان ادب تنقید۔ پانچویں جلد۔ راولپنڈی: فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج، ۱۹۸۲ء

احمد خان، سرسید۔ مسافر اِن لندن۔ لاہور: ن ت، ۱۹۶۰ء

احمد خان، سرسید۔ اسباب بغاوتِ ہند۔ علی گڑھ: یونی ورسٹی پبلیشرز، ۱۹۵۸ء

احمد خان، سرسید۔ مقالاتِ سرسید۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۳ء

احمد نظامی، پروفیسر خلیق۔ سرسید کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے۔ نئی دلی: انجمن ترقی اردو (ھند)، ۱۹۹۳ء

احمد گوریجہ، ڈاکٹر رشید۔ اردو صحافت کے ۱۵۰ سال ۱۸۵۷ء تا حال۔ ملتان: بیکن بکس، ۲۰۰۳ء

اختر، سلیم۔ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء

اختر جوناگڑھی، قاضی احمد میاں۔ مضامین اختر جونا گڑھی۔ کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان،۱۹۸۹ء

اشرفی، وہاب۔مابعد جدیدیت مضمرات و ممکنات۔ اسلام آباد: پورب اکادمی،۲۰۰۷ء

اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر۔اردو نثر میں طنزو مزاح۔لاہور: بیت الحکمت، ۲۰۰۲ء

اصول صحافت۔بی اے۔ اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، ۲۰۱۰ء

اکرام، شیخ محمد۔ آب کوثر۔لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ،۱۹۸٦ء

اکرام، شیخ محمد۔رودِ کوثر۔لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ،۱۹۸٦ء

اکرام، شیخ محمد۔موج کوثر۔لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ،۱۹۸٦ء

الرحمٰن، وحید۔ مرتب۔اردو طنز و ظرافت۔ لاہور: کتاب سرائے،۲۰۰۸ء

الحق کوثر، پروفیسر ڈاکٹر انعام۔تحریک پاکستان اور صحافت۔ کوئٹہ: بولان بک کارپوریشن،۱۹۹۷ء

انصاری، نامی۔آزادی کے بعد اردو نثر میں طنز و مزاح۔ دہلی: معیار پبلی کیشنز،۱۹۷ء

انصاری، ظ۔اردو طنز و ظرافت کے پندرہ بیس سال۔لاہور: کتاب سرائے،۲۰۰۸ء

انور علی، دہلوی۔ مرتب۔اردو صحافت۔ دہلی: اردو اکادمی،۲۰۰۰ء

بابو سکسینہ، رام۔تاریخ ادب اردو۔لاہور: گلوب پبلیشرز،۱۹۸٦ء

بی خان، ایچ۔برصغیر پاک و ہند کی سیاست میں علماء کا کردار۔ اسلام آباد: قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت، ۱۹۸۵ء

پاریکھ، ڈاکٹر رؤف۔اردو نثر میں مزاح نگاری۔ کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان،۱۹۹٦ء

پاشا، احمد جمال۔شوکت تھانوی کی مزاحیہ صحافت۔ لکھنو: پنچ پبلشرز،۱۹٦۷ء

تبسم کاشمیری، ڈاکٹر۔فسانہ آزاد ایک تنقیدی جائزہ۔ آلہ آباد: اردو رائیٹرس گلڈ، ۱۹۴۰ء

تونسوی، ڈاکٹر طاہر۔طنز و مزاح (تاریخ و تنقید، انتخاب)۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء

تونسوی، فکر۔حیات اور کارنامے۔مرتب۔ڈاکٹر شمع افروز زیدی۔ نئی دہلی: بیسویں صدی پبلی کیشنز، ۱۹۸۸ء

جاوید، قاضی۔سرسید سے اقبال تک۔لاہور: نگارشات، ۱۹۸۶ء

چشتی، حسن۔مرتب۔مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں۔ جلد اول۔لاہور: دارالنوادر، ۲۰۰۵ء

چغتائی، اکرام۔مرتب۔۱۸۵۷ء، (تاریخی، علمی اور ادبی)۔لاہور: پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء

چغتائی، محمد اکرم۔مرتبہ۔ ۱۹۵۷ء مجموعہ خواجہ حسن نظامی۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء

چکبست لکھنوئی۔مضامین چکبست۔ لکھنو: امین آباد

چندن، گربچن۔اردو صحافت کا سفر۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ۲۰۰۷ء

چوودھری، ڈاکٹر فوزیہ۔اردو کی مزاحیہ صحافت۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء

حالی۔حیات ِجاوید۔لاہور: سرائے، ۱۹۹۷ء

حسن، مہدی۔تصویری صحافت۔اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۰ء

حسن عسکری، محمد۔ہمارا ادبی شعور اور مسلمان۔مشمولہ: انسان اور آدمی، لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۵۳ء

حق نواز، پروفیسر۔اردو ادب بیسویں صدی میں۔لاہور: خورشید مقبول پریس، ۲۰۰۶ء

حمیرا اشفاق، ڈاکٹر۔ادب کا تاریخی اور تہذیبی تناظر۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء

حنفی، شمیم۔تاریخ، تہذیب اور تخلیقی تجربہ۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلی کیشنز ہاوس، ۲۰۰۳ء

خان، لال۔پاکستان کی اصل کہانی۔لاہور: طبقاتی جدوجہد پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء

خان، نادر علی۔ اردو صحافت کی مختصر تاریخ۔ لاہور: بک چینل، ۱۹۹۳ء

خورشید، ڈاکٹر عبدالسلام۔ فنِ صحافت۔ لاہور: مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۶۶ء

خورشید، ڈاکٹر عبدالسلام۔ تنقیدیں (طنز و ظرافت)

راہی، اعجاز۔ مرتب۔ املا و رموز و اوقاف کے مسائل۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء

رضوی ادیب، سید مسعود حسن رضوی۔ لکھنویات ادیب۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی۔ مرتبہ۔ لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۸ء

رئیس، ڈاکٹر قمر، اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت اور ہم عصر، رجحانات، دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۸۶ء

زکریا، ڈاکٹر خواجہ محمد۔ اکبر الہ آبادی (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۶ء

سبزواری، ڈاکٹر شوکت۔ اردو قواعد۔ اسلام آباد: مکتبہ اسلوب، ۱۹۸۲ء

ایضاً۔ اردو ادب کی تاریخ۔ لاہور: عزیز بک ڈپو، ۲۰۱۳ء

سدید، انور۔ اردو ادب کی تحریکیں۔ کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۶ء

سدید، انور۔ پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ۔ اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۲ء

سعید، ایڈورڈ۔ اورینٹل ازم۔ پنتھن بکس، ۱۹۸۷ء

سعید ایڈورڈ ڈبلیو۔ شرق شناسی۔ مترجم محمد عباس۔ پاکستان: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۳ء

سعید، طارق۔ اردو طنزیات و مضحکات کے نمائندہ اسالیب۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ۱۹۹۴ء

سلطانہ بخش، ڈاکٹر ایم۔ داستانیں اور مزاح۔ لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۳ء

شان محمد۔ سرسید احمد خان (تاریخی وسیاسی آئینے میں)۔ کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۶ء

شارب، ڈاکٹر۔تنقیدی مطالعے۔ لکھنو: امین آباد، ۱۹۸۴ء

شگفتہ یاسمین، ڈاکٹر ایم۔داستانیں اور مزاح۔لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۳ء

شگفتہ یاسمین، ڈاکٹر۔اردو کی مجلاتی صحافت اور غیر ملکی ادارے۔دہلی: عرشیہ پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء

شفیع، میاں محمد۔۱۸۵۷ء پہلی جنگ آزادی (واقعات و حقائق)۔ لاہور: مکتبہ جمال، ۲۰۰۸ء

شمع افروز زیدی، ڈاکٹر۔ اردو ناول میں طنزو مزاح۔لاہور: پروگریسو بک ڈپو، ۱۹۸۸ء

شیخ، اسد سلیم۔انسائیکلوپیڈیا تحریک پاکستان۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء

شیخ، اقرار حسین۔مزہ نگاریاں۔لاہور: پاکستان دارالکتاب، ۲۰۰۰ء

صالح حیات، ڈاکٹر۔اردو صحافت کا اظہار و ابلاغ کے مختلف پیرائے کا تنقیدی جائزہ۔دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۹ء

صابری، امداد۔تاریخ صحافت اردو۔ جلد اول۔ دہلی: ۱۹۵۳ء

صابری، امداد۔روحِ صحافت (مجموعہ مضامین)۔دہلی: مکتبہ شاہراہ، ۱۹۲۸ء

صدف، مشتاق۔اردو صحافت (زبان، تکنیک، تناظر)۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء

صدیقہ، طاہرہ۔دوسری جنگِ عظیم کے اردو ادب پر اثرات۔لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء

صدیقی، ڈاکٹر ابواللیث۔ لکھنو کا دبستان شاعری۔ کراچی: غضنفر اکیڈمی پاکستان، ۱۹۸۷ء

صدیقی، رشید احمد۔طنزیات و مضحکات۔ نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو، ۲۰۱۱ء

صدیقی، ظہیر الدین۔اردو ادب میں طنز و ظرافت کا ارتقا۔ مرتب۔ وحید الرحمٰن۔لاہور: کتاب سرائے، ۲۰۰۸ء

صدیقی، محمد عتیق۔ مرتب۔ اٹھارہ سو ستاون (۱۸۵۷ء): اخبار اور دستاویزیں۔لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۹ء

صدیقی، محمد عتیق۔صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات۔ علی گڑھ:انجمن ترقی اردو،ہند،۱۹۲۶ء

صدیقی، محمد عتیق۔ہندوستانی اخبار نویسی، کمپنی کے عہد میں۔ علی گڑھ:انجمن تقی اردو،ہند،۱۹۵۷ء

صغیر عالم خان،ڈاکٹر محمد۔جگر بسوانی حیات اور کارنامے۔

ضیاالرحمن صدیقی،ڈاکٹر۔ تحریک آزادی اور اردو نثر۔جودھپور:مولانا آزاد پبلک نیشنلز،۲۰۱۴ء

طاہر مسعود،ڈاکٹر۔اردو صحافت انیسویں صدی میں:۔دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس،۲۰۰۰ء

عادل، محمد الیاس۔جدوجہدِ پاکستان۔لاہور:مشتاق بک کارنر،۲۰۱۴ء

عارف، پروفیسر ڈاکٹر سید محمد۔رموز اوقاف۔اسلام آباد:ایچ ای سی،۲۰۰۷ء

عالم، محبوب۔اردو صحافت کی ایک نادر تاریخ۔ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،۱۹۹۲ء

عبداللہ،ڈاکٹر سید۔سرسید احمد خان اور ان کے نامور رفقاء کی اردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ۔اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان،۱۹۸۶ء

عبدالباری،ڈاکٹر سید۔ لکھنو کا شعر و ادب (عہد نوابین اودھ کے معاشرتی و ثقافتی تناظر میں)۔ نئی دہلی:الفلاح پبلی کیشنز،۱۹۹۶ء

عبدالودود، قاضی۔چند اہم اخبارات و رسائل۔پٹنہ:ادارہ تحقیقات اردو،۱۹۹۳ء

عقیل،ڈاکٹر معین الدین۔منتخبات اخبار اردو۔ اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،۱۹۸۸ء

علی حجازی،ڈاکٹر مسکین۔پنجاب میں اردو صحافت کی تاریخ۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۱ء

فاروقی، شمس الرحمٰن۔تنقیدی افکار۔ نئی دہلی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،۲۰۰۴ء

فتح پوری،ڈاکٹر فرمان۔اردو املا و قواعد (مسائل و مباحث)۔اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،۱۹۹۰ء

فتح پوری،ڈاکٹر فرمان۔اردو نثر کا فنی ارتقاء۔لاہور:الوقار پبلی کیشنز،۱۹۹۷ء

فتح محمد ملک۔خیال کا خوف۔مشمولہ:تعصبات۔لاہور:مکتبہ فنون،۱۹۷۳ء

فرحت کاکوروی۔اردو ادب میں طنز و مزاح۔لکھنو:ادارہ فروغ اردو،۱۹۵۷ء

قریشی، سلیم الدین۔مرتبہ۔دہلی کے اخبارات و رسائل۔اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،۲۰۰۹ء

کاشمیری،ڈاکٹر تبسم۔ادبی تحقیق کے اصول۔اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،۱۹۹۲ء

کاظمی،رضی۔انتخاب اودھ پنچ۔لکھنو:کتابی دنیا،۱۹۹۴ء

کاظمی،ڈاکٹر افسر۔مجتبیٰ حسین بحیثیت طنز نگار۔نئی دہلی:ماڈرن پبلشنگ ہاس،۲۰۰۹ء

کاظمی،صائمہ۔اردو افسانہ میں طنز و مزاح۔لاہور:اظہار سنٹر پرنٹرز،۲۰۱۲ء

کاکوروی،غلام احمد فرقت۔اردو ادب میں طنز و مزاح۔لکھنو:اردو فروغ اردو،۱۹۶۴ء

کشن پرشاد کول۔ اودھ پنچ کے نورتن۔۱۹۵۵ء

کمال،اشرف۔تنقیدی تھیوری اور اصطلاحات۔فیصل آباد:مثال پبلشرز،۲۰۱۶ء

گجراتی،امام الدین۔ مکمل مجموعہ لکچرز۔لاہور:نول کشور پریس۔۱۹۹۵ء

مرسڈن،ای۔تاریخ ہند۔لالہ جیارام۔مترجم۔لاہور:حاجی حنیف پرنٹرز،۲۰۱۵ء

مارکس،کارل۔ہندوستان تاریخی خاکہ۔احمد سلیم۔مرتب۔لاہور:علی پلازہ،۲۰۰۲ء

مارکس،کارل۔فریڈرک اینگلیس۔نوآبادیاتی نظام (مضامین اور خطوط کا مجموعہ)۔ماسکو:دارالاشاعت ترقی،۱۹۳۲ء

مجید،شیما۔مرتب۔اردو رسم الخط۔اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،۱۹۸۹ء

محمد زکریا،ڈاکٹر خواجہ۔اکبرالہ آبادی تحقیقی وتنقیدی مطالعہ۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۶ء

محمد عمر، ڈاکٹر۔ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر۔لاہور:پاک اکیڈمی، ۱۹۹۲ء

محمود، راجہ طارق۔سرسید احمد خان۔ جہلم:بک کارنر،۱۹۸۸ء

محمود، ڈاکٹر خالد۔اردو ادب میں طنزومزاح کی روایت۔ دہلی:اردو اکادمی، ۲۰۰۵ء

محمود، خالد۔ مرتب۔اردو صحافت: ماضی اور حال۔ نئی دہلی:مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۲۰۱۲ء

مراد آبادی، معصوم۔ اردو صحافت اور جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء۔ دہلی:مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامع مسجد، ۲۰۰۸ء

ایضاً۔ اردو صحافت کا ارتقا۔ دہلی:اردو اکادمی، ۲۰۱۳ء

مرزا، اشفاق سلیم۔فلسفہ تاریخ نو آبادیات اور جمہوریت۔لاہور:سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء

مسعود، ڈاکٹر طاہر۔اردو صحافت انیسویں صدی میں۔ دہلی:ایجوکیشنل پبلشنگ، ۲۰۰۹ء

ممتاز حسین جونپوری۔منشی سجاد حسین۔ مشمولہ: نقوش شمارہ نمبر ۵۹، لاہور: ادارہ فروغ اردو ایبک روڈ، ۱۹۰۶ء

مصباح الحسن قیصر۔اردو طنز و ظرافت اور منشی سجاد حسین۔ لکھنو:امین آباد پارک، ۱۹۷۸ء

میمی، البرٹ۔*The Colonizer and the Colonized*۔یوکے: کریٹو پرنٹ اینڈ ڈیزائن، ۱۹۷۴ء

نور الحسن نقوی۔سرسید اور ہندوستانی مسلمان۔ جلد دوم، ب ت

نثر، عبدالحلیم۔قدیم لکھنو مشرقی تمدن کا آخری نمونہ۔لاہور:بک ٹاک، ۲۰۰۵ء

نیازی، رؤف۔مابعد جدیدیت (تاریخ و تنقید)۔ کراچی:حلقہ آہنگ نو، ۲۰۰۳ء

نیر، ناصر عباس۔ثقافتی شناخت اور استعماری اجارہ داری۔لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء

نیر، ناصر عباس۔اردو ادب کی تشکیل جدید:نوآبادیاتی اور پس نو آبادیاتی عہد کے اردو ادب کے مطالعات۔ کراچی:اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۱۶ء

نیر،ناصر عباس۔لسانیات اور تنقید۔اسلام آباد:پورب اکادمی،۲۰۰۹ء

نیر،ناصر عباس۔مابعد نوآبادیات: اردو کے تناظر میں۔کراچی:دی ٹائمز پریس،۲۰۱۳ء

نیر،ناصر عباس۔مابعد جدیدیت، اطلاقی جہت۔لاہور:مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،۲۰۰۸ء

نیر،ناصر عباس۔مابعد جدیدیت نظری مباحث۔لاہور:مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،۲۰۰۷ء

نیر،ناصر عباس۔مابعد نوآبادیاتی مطالعہ۔لاہور:مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،۲۰۰۸ء

وزیر آغا،ڈاکٹر۔اردو ادب میں مزاح۔لاہور:ایجوکیشنل بک ہاوس،۱۹۹۰ء

ہاشم قدوائی،ڈاکٹر محمد۔ جدید ہندوستان کے سیاسی اور سماجی افکار۔نئی دہلی:ترقی اردو بیورو،۱۹۸۵ء

یوسفی،عبداللہ۔ انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ۔دہلی:معیار پبلی کیشنز،۱۹۶۵ء

رسائل و جرائد:

اودھ پنچ، لکھنو

اوراق، مدیر،وزیر آغا،لاہور

بادبان، کراچی

بازیافت، اورینٹل کالج،لاہور

بنیاد، اسلام آباد

تسطیر، مدیر نصیر احمد ناصر،راولپنڈی

دریافت، نمل

روشنائی، مدیر احمد زین الدین، کراچی

شب خون، مدیر شمس الرحمن فاروقی، الہ آباد

صریر، کراچی

علی گڑھ میگزین طنز و ظرافت نمبر

قومی زبان، کراچی

معیار، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

نقوش، لاہور

لغات و انسائیکلوپیڈیا

اردو جامع انسائیلوپیڈیا، جلد دوم، شیخ غلام علی اور سنز، لاہور، ۱۹۸۸ء

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا

آکسفرڈ ڈکشنری آف لٹریری ٹرم

بجی سن انسائیکلوپیڈیا آف لٹریچر

دی انسائیکلوپیڈیا آف لٹریچر اینڈ کلچرل تھوری

ڈکشنری آف لٹریری ٹرم

فیروز الدین، مولوی، فیروز اللغات، اردو جامع، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۷۵ء

گیل انسائیکلوپیڈیاآف لٹریچر

وارث سرہندی، علمی اردو لغت (جامع)، علمی کتاب خانہ، لاہور، ۲۰۰۳ء

انگریزی کتابیات

A Transcultural Affair by Hans Harder. Barbara Miltar Editors New York Dordrecht London, 2013

From Pluralism to Separatism Qasbas in Colonial Awadh by Mushiral Hasan: New Dehli, Niyogi Books, 2007

The AVADH PUNCH wit and Humour in Colonial North India by Mushiral Hsasn, New Dehli Niyogi Book, 2007.

Trevelyas on the education of people of India .

انٹرنیٹ / ویب سائٹس

www.laltain.com

www.dw.com

www.urdu.com

ضمیمہ جات

OUDH PUNCH
LUCKNOW
WEEKLY

تحفہ شمال

[illegible] ہے کیسا ساقی
[illegible] دیکھ [illegible] ساقی
بادل آئے [illegible] کا سے
جھومتے پا پیکر [illegible]
ہوا کیا ہے تو یہ [illegible]
تو یہ ڈرتے ہے کیوں چھپے
پانی برسا بادل گرجے
مجو ادھی کہ سب ہوں چپ چپ
گرسون تک ہے پانی ہی پانی
اب کے بارش ہے سن ساقی
کشتی جو اب سے کی جاری
بیٹھے سب ہم اور ساری
کیوں سستی من سے خواہم
اک نمبروں سے خواہم
... صاحب پیکر ہے
اب تک تجھے دا اچھے خواب
کیچ پٹر میں اب میں غلطیدہ
ان پر ہے اک سنگ شانیہ
پل ہے یاں تک تندی سو تیل
نیشی کی ہمیں شد حالی
سب کر تو ساتا ہے ساقی
ہم کو تم کھاتا ہے ساقی
وارد قسم کی ہے بیدار و

جس میں ہیں جسے کی پھولا جو
اونٹ ابھر بست دیکھو
سبزہ اور اس کی رنگت دیکھو
سجرہ لائے گل اور سے
آہ آید پر کٹ جائے
بیڑے ہنڈ دے دو جائے
رنگ وجائے رہ اور کئے
[illegible] بھی ہے کے جنگل
[illegible] اس [illegible]
[illegible] پائیں بیٹھے والے
بیٹھے پائیں بیٹھے والے
[illegible] رنگت
[illegible]
پیاری پیاری [illegible]
جھولے [illegible]
لمبے لمبے پینگ لگاتے
دھانی اور ہی ساری دیکھو
رنگت کیا ہے پیاری دیکھو
اعجاز اگر بھرا جوبن دیکھو
دیکھو دوسے دلہن دیکھو
آنکھوں میں کیسی متوالی
زلفوں میں کیا کالی کالی
جب کشتی اندر قریب
اودھا اور ٹھا سا کم سینہ
گاتے ہیں یہ گروہ ساون
بجتا ہے انگریزی ارگن
سب کچھ ہیں ساماں کیا

سینہ میں سے کا چوپ چاپ
وقت بند آگوش میں آئے
فرق پاسے جول میں گو
اچھیں کرد میں تاچیں گائیں
میں نہ میں دم مچائیں
ہو حق سنگر زاہد با کیں
واعظ سب گیں جا بہا گیں
بیکش بہک رہے ہیں آئیں
ماسجہ بیلیں شور مچائیں
قرآن ہے باقی لاچو
اچھا ہنگامہ ہے پا ہو
للعتیے غواری پائیں
مکی میں لائیں گیا ہیں
سے غواری کی ایسی تیسی
بیٹھیں... صاحب چسکی
[illegible] شاہ آباد بہرودئی

عید [illegible] ان ممالک غیر شمالی

ابھی جناب ہادر و محج صاحب آج
کمشنر آف دراس بل کی ناصدتانی ہے
[illegible] پر [illegible] ممالک [illegible]
شمالی کی طرف بھی تندی سی تو بہ [illegible]
[illegible] رونق [illegible] ابھی [illegible]
[illegible] سے [illegible]
[illegible]

کشمیری بنک لمیٹڈ

[illegible]

مشتہر [illegible] ۔ ۔

تماشے دکھا [illegible] ہوں کا۔

راقم ۔ ساقی الملک ۔

[illegible]

دُنیا [illegible] کی [illegible]
[illegible]
[illegible] کیں [illegible]
تماشے ۔ [illegible] کیا کہتے عجیب [illegible]
دیکھو اور دیکھتے ہیں ۔ رنگ [illegible] ہیں
دُنیا کی [illegible]
[illegible]

دیکھو ہاں دیکھے ۔ تو دیکھے [illegible]
[illegible] کیا ساگر و دیکھیں مکتب کیا
بسم اللہ کہیں ۔ ابو اس کی طرح
[illegible] کا ذکر کیجیے ۔ جناب
[illegible] ہیں ۔ اس میں [illegible]
سپس جانے ہیں اُن کو [illegible] کا
طوفان ۔ جوانی کا جوش [illegible]
[illegible]

کرتے ہیں ۔ آپ کو سامنے [illegible]
کے [illegible] کیجیے گا
کیا [illegible] ہے ۔

پہلا منظر

[illegible]

دوسرا منظر

[illegible]

CHAMBERLAIN'S
COUGH REMEDY

چیمبرلینس کف ریمیڈی

[illegible]

(۱) [illegible]

[illegible]

سرالفی ٹنڈال کا زمانہ
اور رشوت خواری کی گت

International Islamic University CENTRAL LIBRARY ISLAMABAD